سچّے موتی جیسے لوگ
رفعت سراج

ترتیب

☆☆☆

پیش لفظ

تیری رفاقت میں جو گزر گئے حسین لمحات
ان کی لذتِ بیکراں کو ہم بھولے ہی کب تھے

شمعِ زیست اب بجھ بھی جائے تو کیا ملال
تجھ سے بچھڑ کے ہم جیئے ہی کب تھے

☆☆☆

محبت

جدائی کے

لمحوں میں

پھلتی پھولتی ہے

ان لمحوں میں

گزرے دنوں کی بازگشت

ہزاروں کہانیاں بنتی ہے

ان کہانیوں کے بے حساب کرداروں میں

کوئی آپ ہے

کوئی میں ہوں

آپ کی دُعاؤں کی طالب

رفعت سراج

☆☆☆

سچے موتی جیسے لوگ

''موسم بہار آنے پر خوشیاں منانے والے لوگو......!

تم نے کبھی سوچا ہے......اس دُنیا میں اَن گنت بے شمار لوگ ایسے ہیں جو موسم بہار پر جی بھر کر سوگوار ہوتے ہیں۔

خوشی کے زمانے آنے پر رِستے زخموں پر مرہم رکھنے کیلئے بھاگ دوڑ کرنے لگتے ہیں۔

کبھی ان لوگوں کی طرف دیکھا ہے جو ایک زمانے میں سچے موتی جیسا رشتہ اپنی روح کی مٹھی میں دبا کر رکھتے تھے...... جو حادثاتی طور پر ان کی مٹھی سے پھسل جاتا ہے۔

کبھی ان آنکھوں کو دیکھا ہے جو ہونٹوں کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے پاتیں۔

خوشی کی ڈھولکی پر پہلی تھاپ......اندر کہیں دل پر پڑتی ہے۔

اصل میں زندگی کو حقیقی رنگوں کے ساتھ پہچاننے والے لوگ یہی ہیں۔ زندگی ان کی روح میں پیوست ایک ایسا کانٹا ہوتی ہے جس کو وہ ہر آن محسوس کرتے ہیں......

ادراک وشعور کے اوزان ان کی ذات میں بنتے ہیں۔

قدم جما کر چلنا ان کو آتا ہے...... دُکھ کی انتہا پر خوشی کا اصل شعور ان کو ملتا ہے......ان کی دُعا میں اثر اور بد دعا میں زہر ہوتا ہے...... سوچ سمجھ کر بات یہ کرتے ہیں...... ذمہ داری سے قدم یہ اٹھاتے ہیں...... ان کے دل سے کھیلنے والے لوگ خاموش بددعا کی تاریکی میں بھٹک جاتے ہیں۔

بچنا لوگو......! احتیاط کرنا...... ان لوگوں سے جن کی مٹھی سے کبھی کوئی سچا موتی پھسل گیا ہو۔''

اس نے اگربتی کی خوشبو سے مہکتے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور سامنے دیوار پر نسپل اسکیم سے بنی ایک تصویر کی طرف دیکھا۔

''کیا سوچ کر اماں نے تمہارا نام شہر نواز رکھا تھا...... تم تو شہر ہی سونا کر کے چلے گئے۔'' تابناک نے رُخساروں پر پھسلتے ہوئے اشک اُنگلیوں کی پوروں سے صاف کیے اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

''پورے سترہ برس ہو گئے شہر نواز تمہیں اس دُنیا سے رُخصت ہوئے...... اور مجھے لگتا ہے سترہ پل بھی نہیں ہوئے۔''

''اوہ......! بھئی کیا کریں ...... پرانی گاڑی کا یہی رونا ہے...... گھر سے تو ٹھیک وقت پر نکلے تھے راستے میں گاڑی بند ہوگئی پتہ چلا کلچ کی پلیٹیں ختم ہوگئیں۔ جلدی جلدی کرتے بھی دو گھنٹے لگ گئے...... اس پر سے تمہاری بھابی کی صلواتیں...... جیسے میں نے جان بوجھ کر پلیٹیں خراب کی تھیں...... قرآن خوانی تو ختم ہوگئی ہوگی......؟''

دل نواز بھائی بکتے جھکتے اندر داخل ہوئے بیگم آف موڈ میں پیچھے پیچھے۔

''اسلام علیکم بھائی......!'' تابناک نے مؤدبانہ سلام عرض کیا۔

''اسلام علیکم بھابھی......!'' اچانک خیال آیا کہ سلام کے ساتھ بھائی لفظ استعمال کر کے اس نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ ابھی کھڑے کھڑے مقدمہ بن جائے گا۔

پھر گویا ہوئی یعنی دل نواز بھائی کی بات کا جواب دیا۔

''جی قرآن خوانی تو مغرب سے پہلے ختم ہوگئی...... آپ بھابی کو رکشہ کر کے بٹھا دیتے بے چاری ورکشاپ میں بیٹھے بیٹھے تن پڑ گئی ہوں گی۔''

ارے بھئی میں نے تو انس سے کہا تھا......

''توبہ...... رکشہ......!'' بھابی تنک کر خاصی برہم ہو کر بولیں۔

''رکشہ میں بیٹھنے سے تو بہتر ہے بندہ پیدل ہی چل پڑے...... ایک تو بے ایمان ٹھیکیداروں کے کارنامے...... قدم قدم پر سڑکوں پر گڑھے...... ایک ایک ہاتھ رکشہ اُچھلتا ہے۔ مجھے تو فکر پڑ جاتی ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ نہ کھسک جائے...... بیٹھے بیٹھے بندہ معذور ہو سکتا ہے۔ سنا ہے یہ تو تکلیف بھی ایسی ہوتی ہے جیسے جانکنی کی تکلیف...... اللہ معافی......!'' بھابی ساڑھی کے آنچل سے چہرہ پونچھتے ہوئے توبہ کرنے لگیں۔

''اچھا بھئی یہ بتاؤ کھانے میں کیا ہے۔ میں نے تمہیں پچھلے سال کہہ دیا تھا۔ آئندہ شہری کی برسی پر نیاز کے لیے مٹن بریانی بنانا...... چکن کھا کھا کر طبیعت اوبھ گئی اپنی تو۔'' دل نواز بھائی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر یوں پوچھا جیسے بھوک برداشت نہ ہو رہی ہو۔ بہت دلچسپی سے بہن کو دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں کیا جواب آتا ہے۔

''وہ...... بھائی...... بات یہ ہے کہ قرآن پڑھنے کے لئے جو لوگ آئے تھے ان کے لئے تو میں نے اسنیکس اور چائے کا انتظام کیا تھا اور ایک بریانی کی بڑی دیگ ایدھی والوں کا جو بچوں کا سینٹر ہے، جہاں لاوارث بچوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے وہاں بھجوا دی تھی...... اس طرح کا کھانا تو مستحق لوگوں کو کھلانا چاہئے ناں...... اس نے ساتھ ساتھ تائید بھی چاہی۔

یعنی تم نے ہمیں یہاں چائے سموسے کھلانے کو بلایا ہے...... دل نواز بھائی

بڑی ناگواری اور اکھڑ پن سے بولے۔

''نہیں بھائی میں نے تو آپ کا فاتحہ میں شرکت کرنے کیلئے بلایا تھا کہ چھوٹے بھائی کے ایصال تو اب میں آپ کا بھی حصہ ہو...... کھانا تو سب لوگ بھوک لگنے پر کھاتے ہی ہیں۔ میں نے بھی گھر کیلئے قیمہ فرائی اور بگھارے چاول اور روٹی بنائی ہے جیسے روز کا کھانا بنتا ہے۔'' اس نے دھیمی آواز اور جھکی نظروں کے ساتھ وضاحت کی۔

''ارے بھئی...... کیا شور مچایا ہوا تھا تم نے کہ شہر نواز کی برسی ہے گیارہ اپریل کو...... فاتحہ ہے یہ ہے وہ ہے...... ابھی پرسوں ہی ہمارے محلے میں قاضی اختر کے والد کی برسی تھی ...... تین تین ڈشیں تھیں کھانے میں تین چار سو بندوں کیلئے تمہارے پاس اللہ کا دیا کم ہے مگر دل نہیں ہے تمہارا...... شوہر تو تمہارا پیسہ یوں لٹاتا ہے جیسے محنت کا نہیں لوٹ کا مالا ہو...... بھائی کی برسی پر کیا خرچہ کرنے سے منع کرنا ہے......؟'' دل نواز بھائی کے دل کا تکدر زبان سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت سخت مایوس ہوئے تھے...... بھابی کی پیشانی پر بھی بل پڑے ہوئے تھے...... شوہر کی رف دیکھ کر بولیں۔

''بیٹھے بٹھائے ڈھائی ہزار کا خرچہ نکل آیا گاڑی میں...... دو گھنٹے کی خواری الگ......'' تابناک نے وال کلاک کی طرف دیکھا...... پھر بھابی بھائی سے بولی......

''کھانا لگاؤں بھائی......؟''

''ہاں بھی لگا لو...... کھانے کا وقت تو ہو رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو پیٹ میں ڈالنا ہی ہے۔ تمہارا میاں کہاں ہے...... اگر کہیں باہر نکلا ہوا ہے تو انتظار کر لیتے ہیں۔ ساتھ ہی کھا لیں گے۔'' آخر تھوڑی وضع داری تو بنا بنا تھی کہ صاحب خانہ کی اہمیت اپنی جگہ ہوتی ہے۔

''ان کا تو کچھ پتہ نہیں...... زیادہ تر تو لیٹ ہی ہوتے ہیں...... کام ہی اتنا ہے کہ......''

''ارے...... چھوڑو...... اُسے سناؤ یہ کہانی جیسے پتہ نہ ہو...... کالا دھن بہت ہے لٹا رہا ہو گا کہیں بیٹھا ہوا'' دل نواز بھائی بات کاٹ کر بولے...... بھابی نے معنی خیز انداز میں ذرا گہری سانس کھینچی۔

''لگا لو پھر کھانا وانا......'' دل نواز بھائی نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے یوں کہا جیسے کھانا کھا کر بہن پر کوئی احسان کر رہے ہوں۔

''یہ باہر پورچ میں جو گاڑی کھڑی ہے وہ کس کی ہے؟'' بھابی کو اچانک خیال آیا۔

''ہماری ہی ہے...... کل ہی ڈیلوری ہوئی ہے۔'' اس نے یوں جواب دیا جیسے کسی گناہ کا اعتراف کر رہی ہو۔

''اوہ بھئی مبارک ہو...... ہاں بھئی ہمیں تو یاد ہی نہیں رہا کہ تمہارے ہاں تو نئے سال کا ماڈل سب سے پہلے نظر آتا ہے...... یعنی کہ 2005ء کا ماڈل آ چکا بہت بہت مبارک ہو...... کالے دھن کی پہنچان ہی یہی ہے کہ نئے ماڈل کی کار نیا سال شروع ہوتے ہی پورچ میں کھڑی نظر آتی ہے......'' دل نواز بھائی نے خیالات کا اظہار فرمایا۔

''لے کر نہیں گئے تمہارے میاں...... کیا فیتہ کٹے گا؟'' بھابی سے رشک وحسد ضبط نہیں ہو رہا تھا۔

''نہیں، اصل میں جب وہ شوگر مل کی طرف جاتے ہیں تو کچے کی وجہ سے جیپ استعمال کرتے ہیں۔'' تابناک نے رسانیت سے جواب دیا کہ بھائی بھاوج تو ہمیشہ کی طرح باتیں کر رہے تھے کوئی نیا انداز تو تھا نہیں۔

تابناک نے آگے بڑھ کر ملازم کو آواز دی۔

''شہاب الدین ٹیبل لگاؤ۔''

☆☆☆

دل نواز اور شہر نواز (مرحوم) تابناک کے سوتیلے بھائی تھے۔ اس رشتے کی وجہ تسمیہ کچھ یوں بنتی تھی کہ تابناک کی والدہ مریم دل نواز شہر نواز (مرحوم) کی سگی خالہ تھیں۔ شہر نواز صرف ڈیڑھ سال کا تھا جب وہ شفقت مادری سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ سگی خالہ ہی اس معصوم بچے کی خلوص سے دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ مریم کے لیے رشتہ دیا گیا جو تھوڑی ردوکد کے بعد منظور ہو گیا۔ ردوکد کی وجہ دل نواز کے والد اور مریم کی عمروں میں تغاوت تھا۔ مگر معصوم شہر نواز کی خاطر یہ فرق نظر انداز کر کے اچھے نیک جذبے کے ساتھ یہ رشتہ قبول کر لیا...... اور یوں مریم دو بچوں کی ذمہ دار بن کر رب نواز کے گھر سادگی سے رخصت ہو کر آ گئیں۔ ان کی کوکھ سے تین بچے پیدا ہوئے سب سے پہلے تابناک اس کے بعد دو نرینہ اولادیں۔ شاہ زمان اور نور الزماں۔

مریم نے بچوں کی دیکھ بھال بہت احتیاط سے کی۔ شعور کی منزل پر پہنچ کر کہیں بچوں کو پتہ چلا خاص طور پر دل نواز سے چھوٹے چار بہن بھائیوں کو کہ وہ دو ماؤں کی اولادیں ہیں رب نواز کا اپنا چمڑہ رنگنے کا کارخانہ تھا...... دو تین دوکانیں تھیں جن کا کرایہ آتا تھا۔ گھر میں رب کا فضل تھا۔ اچھا کھانا پہننا، اچھے اسکولوں کالجوں میں تعلیم۔

سب کچھ میسر تھا مگر یہ نصیب کی بات تھی کہ رب نواز کے چاروں بیٹوں میں ڈھنگ کا صرف ایک ہی نکلا یعنی شہر نواز...... باقی تینوں کے مزاج میں سنجیدگی کے بجائے صرف لائف انجوائے کرنے کا تصور تھا...... تن آسانی اور آرام پسندی۔

شہر نواز بالکل مختلف تھا...... شروع ہی سے پڑھائی میں بہترین، بلا کا محنتی، مؤدب خاکسارانہ مزاج اور مؤدب طبع...... اس کا رجحان فورسز کی طرف تھا اور اس نے آرمی میں کمیشن بھی حاصل کر لیا...... اس کو کمیشن ملنے کے فوراً بعد ہی رب نواز وفات پا گئے۔ شہر نواز نے تو اپنا کیریئر منتخب کر لیا تھا اب اکر خانہ سنبھالنے کی ذمہ داری باقی تینوں پر تھی دلنواز سب سے بڑے تھے اس لئے وہ خزانے پر ناگ بن کر بیٹھے...... اس موقع پر ان کا سوتیلا پن کھل کر سامنے آیا۔

لیکن شہر نواز نے کمال ذہانت سے اس شورش پر قابو پایا۔ دو سوتیلے تھے وہ تو دل نواز کا سگا بھائی تھا اس کو تو آسانی سے بڑا پن دکھا کر ایک طرف نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مقام ایسا آیا کہ دولت کی فتنہ پردازی اپنے کمال پر پہنچی اور مریم نے لمبے لمبے وظیفے شروع کر دیئے اور اللہ سے رو رو کر دعائیں مانگیں کہ بھائی دولت کے پیچھے جان کے دشمن نہ بنیں...... وہ بہت سادہ مزاج عورت تھیں۔ جنگ و انتشار سے گھبراتی تھیں۔ ایسے میں شہر نواز نے ان کو جس طرح سے سنبھالا ان کو تاسف ہوا کہ وہ بیٹے جو ان کی کوکھ سے پیدا ہوئے ان کو ماں کے جذبات و احساسات کا پاس نہ رہا...... اور شہر نواز جس کو صرف انہوں نے اپنی گود کی گرمی دی سب سے بڑا دل جو اور غم گسار نکلا۔

اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ آپ تینوں میں کاروبار سنبھالنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ سب کو ان کا شرعی قانونی حصہ دے دیا جائے اور اپنے اپنے حصے سے جس کا جو دل چاہے کرے۔ اور ماں بہن کی کفالت کی ذمہ داری وہ خود لے گا۔ اب کوئی ان دونوں کو پریشان نہ کرے۔

اس نے بڑی سمجھداری سے یہ شر رفع کیا اور مریم نے سکون کا سانس لیا۔

سب سے چھوٹے نور الزمان کو سب سے پہلے عشق کے بھوت نے ستایا...... نکمے تو پیدائشی تھے اُس لیے نکما کرنے کا الزام عشق کے سر نہیں گیا۔ بہتر اسمجھایا پہلے اپنے قدم تو جما لو...... گرہستی کی بہت ذمہ داریاں ہوتی ہیں ابھی اپنا پیٹ تو پالنا آیا نہیں بیوی بچوں کی ذمہ داری کیسے نبا ہو گے...... مگر وہ اس بچے کی طرح مچلنے لگے جو دل پسند کھلونا حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں پٹخنے لگتا ہے...... عشق بھی راہ چلتے ہوا تھا...... ان لڑکوں کے گروپ میں بیٹھک تھی جو صبح کو بحفاظت لڑکیوں کو اسکول کالج چھوڑنے کا اخلاقی فریضہ سرانجام دیتے ہیں...... شکل صورت اچھی تھی کوئی عقل کی اندھی خود ہی فدا ہو گئے...... لگی عشوے غمزے اداؤں کے کوڑے مارنے...... اندر تو وزن ہی نہیں تھا جلد

ہی ادھ موئے ہو گئے...... بولے جو دُکان حصے میں آئی ہے خالی کرا کر خود بیٹھ جاؤں گا...... پرچون فروشی کر لوں گا مگر میرا رشتہ لے کر جاؤ...... ناچار مریم رشتہ لے گئیں۔ لڑکی والوں نے جائیداد کی بنیاد اور آدمی کا بھائی جان کر خوشی خوشی رشتہ قبول کر لیا۔ جلد ہی شادی ہو گئی۔ ولیمہ کرنے کی ذمہ داری شہر نواز نے اُٹھا لی......اور یوں نورالزماں نے سب سے چھوٹے ہو کر سب سے پہلے گھر بار کی بنیاد رکھ لی۔

دُکان خالی کرا کر شہر نواز کے تعاون سے جنرل اسٹور شروع کیا...... آرام طلبی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جلد ہی تھک گئے ایک نوکر رکھ لیا...... پھر سمجھایا گیا کہ ابھی دُکان کی آمدنی اتنی نہیں کہ نوکر کی تنخواہ آسانی سے نکل سکے۔ مگر بات تو کسی کی سمجھ ہی نہ آئی تھی۔ جلد ہی نوکر نے بھٹہ بٹھا دیا...... دُکان خالی ہوتی گئی۔ نوکر رُخصت ہو گیا۔

بیگم کی فرمائش و تقاضے اسی طرح رہے۔ چپکے سے دُکان ہی فروخت کر ڈالی۔ کیش ہاتھ میں آ گیا لگے بیٹھ کر کھانے...... خوب اللے تللے شروع ہوئے۔ بیگم کو کار کا بہت شوق تھا جلد ہی کار خرید لی...... اب پٹرول کا خرچہ بھی شروع ساتھ ہی بچہ ہو گیا، بڑے مہنگے ہاسپٹل میں ڈلیوری ہوئی سوا مہینہ اماں کے ہاں کٹا......خرچہ میاں دیتے رہے۔ بیٹھے بیٹھے تو خزانے ختم ہو جاتے ہیں۔ آخر جمع پونجی تمام ہوئی۔ لگے بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلانے۔ ایک رات تو اس قدر ہنگامہ ہوا کہ دل نواز نے دھکے مار کر باہر نکال دیا......شہر نواز نے پھر فطرت سے مجبور ہو کر دادرسی کی......معافی تلافی کرائی اور بھاوج اور بچے کا خرچ اپنے ذمہ لے لیا۔

اب بہن کی تعلیم، شاہ زمان مکینکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کر رہے تھے ان کا تمام تعلیمی خرچ بھائی بھاوج اور بچے کا خرچ سب ان کے ذمہ تھا۔ دل نواز نے تو معذرت کر لی تھی کہ ابھی ان کا نیا نیا کاروبار ہے وہ اخراجات افورڈ نہیں کر سکتے...... صرف اپنے کھانے پینے کا خرچ یا کبھی کبھار تابناک کیلئے کوئی تحفہ یہ ان کے ذمے

داریوں میں تھا۔

جلد ہی ان کی بھی شادی ہو گئی۔ کمال ہوشیاری سے شروع ہی میں الگ گھر کر لیا کہ ساتھ اپنے کی صورت میں گھر کے دوسرے افراد پر بھی ''خرچہ'' ہو جاتا ہے۔

نورالزماں اور ان کی بیوی نے تو جیسے کلمہ شکر ادا کیا۔ بڑے ہونے کے ناطے ایک تو دل نواز کی حاکمانہ طبع اس پر گھر میں ضروری اخراجات پر تنقید خاص طور پر بلوں کی ادائیگی کے زمانے میں اُن کا شور شرابہ اور ہنگامہ۔

''بجلی کا بل اتنا زیادہ کیسے آ گیا۔ چوبیس گھنٹے چھ چھ پنکھے چلتے رہتے ہیں۔ میں نے حرام خوروں کا ٹھیکہ لیا ہے...... خود تو مفت کی روٹیاں توڑ ہی رہے تھے...... باہر سے بھی اُٹھا لائے......'' وغیرہ وغیرہ تابناک اور مریم مجرموں کی طرح کونوں میں چھپتی پھرتیں مگر نورالزماں کی ڈھٹائی میں کوئی فرق نظر نہ آتا...... زیادہ ہی شور ہوتا تو اطمینان سے یہ کہہ کر گھر سے باہر چلے جاتے۔

''باہر جانے کی کوششوں میں تو لگا ہوا ہوں...... یہاں ملتا ہی کیا ہے نوکری کر کے خوامخواہ گھر کا ماحول خراب کرتے ہیں...... یہ کون سا ہمیں کھلا رہے ہیں......شہر نواز بھائی تو ہمارا اتنا کرتے ہیں مگر کچھ منہ سے بولتے نہیں ہیں۔''

وہ تو باہر چلے جاتے اور دل نواز کف اڑانے لگتے۔

''باہر جا کر کیا کر لے گا جو اپنے ملک میں کچھ نہ کر سکا...... نکال دوں گا سالے کو ایک دن ہمیشہ کیلئے باہر...... باہر کی ہوا کھانے کا شوق ہے......ہونہہ......!''

مریم یہ ہنگامے دیکھ کر یوں نڈھال ہو جاتیں جیسے دل نواز خاص طور پر انہی کو سنا رہے تھے ان کے گھر سے جانے کے بعد اخراجات پر فرق تو پڑا کہ بہر حال کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی تھے...... گھر سے جانے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ لوگ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں میں صرف تابناک اور شاہ زمان کے تعلیمی اخراجات ہی اٹھاؤں گا...... مگر

آہستہ آہستہ اس سے بھی ہاتھ اٹھاتے گئے...... یہ خالی جگہ بھی شہرنواز کو پر کرنا پڑی۔

مریم شہرنواز کی شادی کرنا چاہتی تھیں مگر انہوں نے انکار کر دیا کہ جب تک تابناک اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی وہ شادی نہیں کریں گے...... آرمی افسر کی کوئی اتنی بڑی تنخواہ نہیں ہوتی کہ وہ فیملی کی ضروری ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کوئی بڑا کام کر سکے۔

شہرنواز کے ایک افسران کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی تھی جس کیلئے وہ شہرنواز میں دلچسپی لے رہے تھے...... زمینوں والے لوگ تھے مگر اکلوتی بیٹی کیلئے مال دار نہیں بہترین کردار کا لڑکا چاہتے تھے...... مریم تک بھی یہ بات پہنچ گئی...... انہوں نے بہت دباؤ ڈالا مگر ان کو راضی نہ کر سکیں۔

سسرال والوں اور بیوی کی ہر وقت کی چیخ چیخ عاجز آ کر نورالزمان نے ٹیکسی چلانا شروع کر دی...... پندرہ دن ہی ہوئے تھے کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا ایک ٹانگ سے محروم ہو گئے اب معذوری تو ان کا سب سے بڑا بہانہ بن گئی...... کئی آپریشن ہوئے سارا خرچ شہرنواز نے اُٹھایا...... بیوی بچہ اُٹھا کر میکے چلی گئی...... کام چور تو تھی ڈر گئی کہ اب شوہر بستر پر پڑ گیا ہے خدمات کرنا پڑے گی۔

اب تابناک اور مریم کے ذمے ایک اور کام شروع ہو گیا...... مگر مسئلہ یہ تھا کہ شہرنواز ہر وقت گھر پر نہیں ہوتے تھے اور لمبے چوڑے نورالزماں کو اٹھانا بٹھانا واش روم لے جانا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا تھا۔

شہرنواز چھٹیوں پر آئے تو ماں بہن کی بے بسی دیکھی...... اور جاتے ہوئے نور الزماں کو اپنے ساتھ لے گئے کہ وہاں بیٹ مین بھی ہوتا ہے اور شام کو تو میں فارغ ہی ہو جاتا ہوں ایک دم سے گھر بھر کو ہلکا پھلکا کر گئے...... مریم جائے نماز پر بیٹھتیں تو آنچل پھیلا کر رو رو کر شہرنواز کیلئے دُعائیں کرتیں...... انہیں یاد تھا کہ نورالزماں نے بہت مرتبہ شہرنواز سے بدتمیزی کی...... کبھی ان کی بات نہیں مانی...... تھے کچھ نہیں مگر انداز متکبرانہ

تھے۔ مریم شہرنواز کے سامنے نورالزماں کی بدتمیزیوں پر اظہارِ شرمندگی کرتیں تو وہ بڑے وقار سے جواب دیتے۔

''اماں...... غصہ تو مجھے بہت آتا ہے مگر شاید مجھ میں ضبط کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ بھی اللہ کا انعام ہے۔''

اماں تابناک سے کہتیں میرا بیٹا تو مومن ہے...... اتنا صبر و ضبط تو مضبوط ایمان والے ہی میں ہوتا ہے...... جب میری شادی ہو رہی تھی تو بہت سے لوگ مجھ پر ترس کھا رہے تھے کہ اتنی جوان خوبصورت لڑکی بچوں والے کو دے رہے ہیں...... بے چاری قربانی کی بکری بن رہی ہے مگر میں سوچتی ہوں...... آپا نے تو مجھے اتنا پیارا تحفہ دیا کہ میں ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی کیسے پھولوں کی طرح ہمارے بوجھ سمیٹتا ہے...... ابھی تک اپنی کوکھ سے پیدا کیے بیٹوں سے تو کوئی سکھ آرام نہیں پایا...... پھر بڑی دلسوزی سے شہرنواز کے لیے دُعائیں کرنے لگتیں۔

دل نواز بھائی آئے دن تابناک کیلئے کوئی نہ کوئی رشتہ لے آتے تھے یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ ان کو اپنی ذمہ داریوں کا بہت احساس ہے...... کوشش یہ تھی کہ ایسا رشتہ ملے جہاں جہیز نہ دینا پڑے...... ایک شادی شدہ ٹھیکیدار کا رشتہ لے کر آئے تو مصر ہو گئے کہ یہ رشتہ بہت اچھا ہے...... شادی شدہ ہے تو کیا ہوا بے چارے کی بیوی مر چکی ہے کنوارا ہی سمجھیں آپ بھی تو بال بچے والے کے گھر میں آئی تھیں...... پچاس تولہ سونا بری میں چڑھانے کو کہہ رہا ہے...... جہیز بالکل نہیں لے گا۔ اس کے گھر میں سب کچھ ہے۔

''بچے بھی تو ہوں گے۔'' مریم نے دبی زبان میں نکتہ اعتراض پیش کیا۔

تو کیا ہوا...... چار بیٹے ہیں...... ذمہ داریاں تو بیٹیوں کی ہوتی ہیں۔ بیٹے تو کچھ دن بعد اپنی اپنی دُنیا میں مگن ہو جائیں گے...... جائیداد والا بندہ ہے...... جہیز کے نام پر تو اسے ایک گلاس منظور نہیں۔''

اماں نے دہل کر اپنی اُنیس سال کی ہری بھری بیٹی کی طرف دیکھا...... پھر دل نواز کی غضب ناکی سے بچنے کیلئے اتنا بولیں۔

''شہر نواز سے مشورہ کر کے ہی کوئی جواب دیا جا سکتا ہے...... وہ بھی آخر بڑا بھائی ہے پھر مدت سے اس گھر کی ذمہ داریاں اُٹھا رہا ہے۔''

''لیکن بڑا تو میں ہوں اماں...... بڑا بھائی باپ کے برابر ہوتا ہے...... ٹھیک ہے آپ اسے مطلع کر دیں کہ تابناک کیلئے ایک موزوں رشتہ دیکھ لیا ہے...... آ کر ملاقات کر لو پھر بعد میں کوئی نزدیک کی تاریخ دے دیں گے۔''

شہر نواز تک بات پہنچی تو وہ ہفتے کی رات کا سفر کر کے اتوار کی صبح کو پہنچ گئے اور دل نواز کو گھر بلا کر صاف انکار کر دیا۔

دل نواز نے انکار سن کر زمین آسمان ایک کرنا شروع کر دیئے۔

شہر نواز سنتے رہے ان کے خاموش ہونے کا انتظار کرتے رہے اور جیسے ہی وہ خاموش ہوئے بہت پرسکون انداز میں بولے۔

''بھائی...... اختیار و قوت کے استعمال کا مواخذہ بہت سخت ہو گا...... احتیاط کرنا چاہیے۔ تابناک تو ابھی چھوٹی ہے وہ عمر کی اس منزل پر تو نہیں ہے کہ اس کے لیے بال بچوں والے بھی پیام لے کر آنے لگیں...... آپ بالکل ایزی فیل کریں آپ تابناک کی شادی کے موقع پر اپنی خوشی سے کوئی تحفہ دینا چاہیں تو اچھی بات نہ دیں تب بھی کوئی بات نہیں...... تابناک کی شادی جب بھی ہو گی...... ہم میں سے کوئی بھی آپ سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کرے گا...... ایک ہی تو بہن ہے میری اسے بھی بوجھ سمجھ لوں...... یہ تو ہمارے گھر کا خوش نما پھول ہے۔'' متوقع خرچ سے گلوخلاصی پاتے ہی دل نواز کی ٹیون بدل گئی فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔

''ہاں بھئی...... اب دیکھ لینا...... اتنے پیسے والے مڈل کلاس میں رشتے کے لئے اتفاق ہی سے آتے ہیں...... تم لوگ پتہ نہیں کس ہوا میں ہو۔''

آخر یہ معاملہ بھی نمٹا مریم اور تابناک نے سکون کا سانس لیا۔

شاہ زمان کو ڈپلومہ مکمل کرتے ہی مڈل اسیٹ میں مناسب جاب کی آفر آ گئی اور وہ جیسے رسیاں تڑا کر بھاگے...... یہ غنیمت ہوا کہ دل نواز و نور الزماں کی طرح کی بے حسی نہیں دکھائی۔ اور کچھ نہ کچھ ماں کو ماہانہ بھیجنے لگے۔

☆☆☆

''تابناک......!'' پشت سے طاہر حسین کی آواز آئی۔

وہ ایک دم جیسے گہری نیند سے جاگی اور ہڑ بڑا کر کھڑی ہو گئی۔

''اوہ...... آپ...... آ گئے......!''

''تم کونسی دنیا میں پہنچی ہوئی تھیں بھئی......؟'' طاہر حسین کے لہجے میں محسوس کئے جانے والا طنز تھا...... جس کی وہ عادی ہو چلی تھی۔

''نہیں...... وہ بس آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔''

طاہر حسین کے ہونٹوں پر تلخ و معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور فوراً غائب ہو گئی۔

''کون آیا تھا......؟ باہر پورچ میں گاڑی کے وہیل کے نشان نظر آ رہے ہیں...... لگتا ہے کوئی کیچڑ میں دھنستا تا ہوا گاڑی یہاں تک لایا تھا۔''

طاہر حسین کی نگاہ میں گہرے شک کا عکس تھا بظاہر لہجہ نارمل تھا۔

''وہ دل نواز بھائی اور بھابی آئے تھے...... شہر نواز بھائی کی برسی تھی ناں، میں نے فاتحہ دلائی تھی۔'' تابناک نے اپنی عادت کے مطابق دھیمی آواز میں وضاحتی جواب دیا۔

''ہاں بھئی...... لوگ اپنی جان سے چلے جاتے ہیں...... دنیا والے زردے پلاؤ کھا کھا کر ان کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں۔'' طاہر حسین تلخی سے کہتے ہوئے کوٹ اُتارنے لگے۔

"میں نے اس قسم کا کوئی اہتمام نہیں کیا تھا۔صرف بھائی بھابی نے کھانا کھایا تھا وہ بھی جو گھر میں بنا تھا۔" وہ اٹھ کر ان کا کوٹ تھامتے ہوئے بولی۔

طاہر حسین خاموشی سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگے۔

"کھانا لگاؤں......؟" اس نے لاؤنج سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھائے۔

"نہیں......کھا چکا ہوں......آٹھ بجے بہت بھوک لگ رہی تھی......مکڈونلڈ چلا گیا تھا......تم کھا چکی ہو......؟" وہ ہنکارا بھر کر باہر نکلی اس کا رخ بیڈ روم کی جانب تھا۔وہ کوٹ ہینگر کرنے جا رہی تھی طاہر حسین بھی اس سمت آرہے تھے۔

دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

تابناک نے ریسیور اُٹھایا اور بولی۔

"ہیلو۔"

جواب میں شاید کچھ موصول نہیں ہوا تو دوبارہ بولی۔

"ہیلو......ہیلو......ہیلو۔" پھر آہستگی سے ریسیور رکھ کر پلٹی تو ایک دم گڑبڑا گئی طاہر حسین بالکل اس کے سر پر کھڑے تھے جیسے اس کے ہٹتے ہی فون سیٹ پر جھکے اور ایک بٹن پش کر کے C-L-I پر آنے والی کال کا نمبر چیک کرنے لگے......پھر کوفت سے منہ بنا کر ایک طرف ہٹ گئے۔

"شاید کسی P.C.O کا نمبر ہے رات بھی دو تین مرتبہ رانگ کالز آئی تھیں۔"

جتانے والے انداز میں کہتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئے۔

"بہت رانگ کالز آتی ہیں اس گھر میں......لگتا ہے فون پر آبزرویشن لگانا پڑے گی......ایک ذرا سی رات تو ملتی ہے سونے کیلئے۔"

تابناک خاموشی سے سونے کی تیاری کرنے لگی۔اسے شاید زندگی گزرنے کے لئے نہیں سہنے کے لئے ملی تھی۔

☆☆☆

"ارے حسینہ یہ تم لنگڑا کر کیوں چل رہی ہو؟ خیریت تو ہے۔" تابناک نے پرانی ملازمہ کو مخاطب کیا جو ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔

وہ تو جیسے اس بات ہی کی منتظر تھی کہ بیگم اس کی خیر خیریت پوچھے......دھپ سے فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"کیا بتاؤں بی بی......رات ظالم نے بہت مارا......جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا ان کے ساتھ دنیا یہی سلوک کرتی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

"تمہارے شوہر نے......؟ مگر کیوں۔؟" تابناک کو بہت افسوس ہوا۔

"وہ جی میرا سسر ہے ناں......پورے نبے (نوئے) برس کا بڈھا ہو گیا ہے۔ بیمار ہے ناں......ہر بات اسے بری لگتی ہے......بات بات پر میری شکیت (شکایت) بولتا ہے اپنے بیٹے کو......اس نے مجھے چائے نہیں دی۔ دلیے میں نمک تیز تھا۔ ہفتہ ہو گیا اس نے مرغی کا شوربہ نہیں دیا......اور دس طرح کی باتیں......بی بی میں بھی مزدور عورت ہوں کام بھی کرتی ہوں اور گھر بھی دیکھتی ہوں......کام نہ کروں تو گھر کیسے چلے دو ہزار دیتا ہے مجھے پانچ بچے......بھلے سرکاری اسکول میں پڑھتے ہیں خرچہ تو ہوتا ہے ناں......یہ تو آپ جیسے لوگوں کی مہربانی کہ کھانے پینے کو باندھ کر بھی دے دیتے ہیں اور کچھ نہ کچھ ہاتھ پہ بھی رکھتے رہتے ہیں ورنہ مہینے کے آخری دنوں میں تو ہم جیسوں کے گھروں میں فاقے ہوں......بچے کا بلا بڑا تھا......اس نے کھینچ کر مارا تو ٹخنے پر لگا......اتنی عمر ہو گئی ہے میرے سسر کی بیس سال سے خدمت کر رہی ہوں مگر شکر نہیں بولتا۔"

"اوہ......!" تابناک بہت ہمدردی سے اس کی باتیں سن رہی تھی......دکھ سے اوہ کر کے رہ گئی۔

"واقعی حسینہ......تمہارے سسر کی عمر نوے (۹۰) سال ہے؟" تابناک نے

بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں جی...... جھوٹ تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ خود بتاتا ہے کہ جب پاکستان بنا تو میں تیس (۳۰) سے اُوپر کا تھا...... جناح کا جلسہ ہوتا تھا تو سویرے سے جا کر بیٹھ جاتا تھا کہ میرے کو جناح بولتا ہوا بہت اچھا لگتا تھا...... اس کی آواز سن کر خون گرم ہو جاتا تھا...... اس کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوتی تھی۔'' حسینہ نے بھرپوری وضاحت صراحت کے ساتھ جواب دیا۔

''سویرے سے جا کر کیوں بیٹھ جاتا تھا......؟'' تابناک کچھ سمجھی نہیں۔

''سب سے آگے بیٹھنے کیلئے......!'' جواب ملا۔

''اوہ...... اصل میں بے چارہ بوڑھا بھی بہت ہوگیا ہے اور پھر بیمار بھی ہے۔ اِس لئے چڑچڑا ہوگیا ہے۔'' تابناک نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بی بی...... یہ تو سب سمجھتے ہیں...... پر بی بی ہم بھی آخر انسان ہیں ناں...... اندھیرے کے اُٹھے ہوتے ہیں...... رات کو جوڑ جوڑ دُکھتا ہے...... اللہ کے بھید اللہ ہی جانے...... ایسے پھول جیسے جوان ایک پل میں آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ جاتے ہیں اور اس جیسے بڈھے ہم جیسوں کو آزمانے کے لیے سر پر بیٹھے ہیں...... کوئی سوچے بھلا اب ان کا دُنیا میں کیا کام باقی رہ گیا ہے...... بس بی بی اللہ کی مرضی......!'' وہ تکلیف برداشت کرتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

(آہ...... پھول جیسے جوان...... کیا بات کی ہے تو نے حسینہ) تابناک کو ایک اُٹھتی ہوئی ٹیس نے زندگی کا پوری قوت سے احساس دلایا...... اس نے صوفے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندلیں۔

☆☆☆

طاہر حسین تابناک کے دوسرے شوہر تھے...... پہلی شادی دل نواز کے اصرار و دباؤ کا نتیجہ تھی...... بظاہر اس وقت اس رشتے میں کسی کو کوئی خامی یا عیب

دکھائی نہیں دیا ایگری کلچر میں آفیسر تھا...... ذاتی رہائش تھی دو بہنیں تھیں ایک شادی شدہ تھی تین بھائی تھے تابناک کے سابق شوہر کا تیسرا نمبر تھا...... ساس سسر بھی موجود تھے۔ ساس کی ہی خواہش پر یہ رشتہ ہوا تھا...... چاند جیسی بہو کی تمنا سے بے حال کر ان کی دہلیز کی مٹی لے لی تھی۔ دل نواز بڑے فخر سے یہ رشتہ لائے تھے...... اس جملے کے ساتھ کہ شریف لوگ ہیں جہیز کے لالچی نہیں ہیں...... انہیں لڑکی اور ہمارا گھرانہ بہت پسند آ گیا ہے۔

شہرنواز کی صلاح مشورے کیلئے بلوایا گیا۔ انکار کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی سب کچھ بحسن وخوبی طے پا گیا اور دو ماہ کے اندر اندر شادی بھی ہوگئی۔ باپ کے ترکے میں جو کچھ اس کا حصہ تھا اسے جہیز میں دے دیا۔ اس کے علاوہ شہرنواز نے اس کے لئے دو (۲) کنگن اور چار چوڑیاں بنوائی تھیں یہ اس کی طرف سے بہن کے لیے خصوصی گفٹ تھا۔ دل نواز نے ڈنر کی مد میں پانچ ہزار روپے جبکہ کھانے پر خرچہ پچیس ہزار ہوا تھا...... بولے نیا نیا کام ہے اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے یہ بھی کسی سے قرض لیے ہیں۔

خیر شادی ہوگئی تابناک کی سسرال میں خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ساس نندوں نے ہر طرح سے خیال رکھا...... شوہر نے بھی یہی ظاہر کیا کہ وہ اس سے شادی کر کے بہت خوش ہے...... روٹین لائف گزرتے ہوئے ایک بہت پریشان کن انکشاف ہوا کہ اس کی چھوٹی نند بہت کند ذہن اور پھوہڑ ہے۔ جبکہ بڑی والی نند اعلیٰ تعلیم یافتہ وخوش شکل تھی اس کی شادی بھی اعلیٰ آفیسر سے ہوئی تھی...... یہ لوگ چاہتے تھے کہ چھوٹی کا بھی رشتہ اچھی جگہ ہو مگر ایک سے ایک قابلیت رکھنے والی لڑکیوں کے رش میں ساتویں پاس بے ڈھنگی کے لیے اچھا رشتہ کیونکر آتا؟ جبکہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے محترمہ کی اخلاقیات بھی خاصی کمزور تھیں...... پہلے پہلے تو ساس صاحبہ نے اشارے کنائے میں بات کی کہ اپنے بھائی شہرنواز سے عابدہ کی شادی کی بات کروا اپنی ماں سے...... اس طرح سے ہمارا تمہارا

رشتہ اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا...... باہر اکیلا ہے...... تم لوگوں کو اس کی جلدی شادی کر دینا چاہیئے تا کہ اُسے عورت سے گھر کا آرام تو ملے...... باہر محنت کر کے آتا ہو گا تو آ کر گھر کے کام بھی کرنا پڑتے ہوں گے...... عابدہ کو باہر ملک جانے کا بہت ہی شوق ہے......تمہارے بھائی سے شادی ہو گئی تو بہت خوش رہے گی...... تمہارے بھائی کو بھی خوش رکھے گی۔

تابناک تو سناٹے میں رہ گئی۔

"شہر نواز...... سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس رشتے پر راضی ہو جائے۔" اس نے اپنے طور پر ہی کہہ دیا کہ ہمارے ہاں ادلے بدلے کی شادیوں کا رواج نہیں ہے۔ اس کا جواب سنتے ہی گھر بھر کا رویہ تبدیل ہو گیا......مگر ان لوگوں نے ہمت نہیں ہاری۔ تابناک سے رشتہ کرنے کا مقصد ہی یہ تھا تو ہار کیسے مان لیتے......شہر نواز کا تو رشتہ ہو چکا تھا جو اس کے سسرال والوں کو پتہ تھا اُس کی طرف تو وہ یوں بھی راغب نہیں تھے کہ بقول ان کے لڑکی بہت "کم عمر" ہے اس کا جوڑ شہر نواز کے ساتھ ہی مناسب ہے۔ اس کے شوہر کو اس کے پیچھے لگا دیا...... آخر ہار مان کر تابناک کو ماں سے بات کرنا پڑی۔ انہوں نے سنتے ہی انکار کر دیا۔

"تمہیں تو اپنے بھائی کے مزاج کا پتہ ہی ہے وہ سب سے زیادہ آزاد خیال ہے...... وہ اس ناخواندہ اور بے تکا بولنے والی کے ساتھ تو کبھی بھی نباہ نہیں کر سکتا۔"

تابناک کا شوہر...... ایک نمبر کا راشی...... بے ضمیر شخص ثابت ہوا تھا...... محکمہ آبپاشی سے تعلق تھا۔ جہاں رشوت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا ہے......حرام کا مال کھا کر غرور تکبر بھی مزاج کا حصہ بن چکا تھا...... تابناک کے منہ سے مسلسل انکار سننے کے بعد اس نے آخری حربہ کے طور پر اسے جتایا کہ وہ عابدہ کو جہیز میں فرنشڈ بنگلہ دیں گے...... ہو سکتا ہے سلامی میں کار بھی دے دیں......مگر شہر نواز کسی طور راضی نہ ہوا اس نے صاف

جواب دے دیا۔ وہ ایسی لڑکی سے شادی کا خواہش مند ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی اچھا کیریئر بھی رکھتی ہو۔ آپ لوگ اس طرح کی کوئی لڑکی تلاش کریں۔

تابناک نے اپنے میکے کی طرف سے صاف جواب پہنچا دیا اور اس کے بعد روحانی اذیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ دو سال ہونے کو آئے بچہ نہیں ہوا اس لیے وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کریں گے...... سمجھانے والوں نے بہت سمجھایا کہ دو (۲) سال تو کوئی عرصہ ہی نہیں ہوتا لوگوں کے ہاں دس دس سال بعد بچہ ہوتا دیکھا گیا ہے۔ جن کے قصیدے پڑھتے دل نواز نہ تھکتے تھے ان لوگوں کو ان کا بھی لحاظ نہ رہا...... وہ تو تھے ہی ایک نمبر کے اکڑ باز۔ تابناک کا ہاتھ پکڑ کر اس گھر سے نکال لائے اور اعلان کر دیا کہ وہ اسے طلاق دلوا کر اس کی دوسری شادی کریں گے...... مگر اس پر سوت نہیں آنے دیں گے...... بات بگڑی اور بگڑتی چلی گئی۔ واضح ہو گیا کہ شہر نواز کے چکر میں وہ لوگ اس دروازے تک آئے تھے۔ مفاد پرستی پر بنیاد تھی گاڑی کیسے چلتی۔

اماں پرانے زمانے کی عورت طلاق لفظ سن کر ہی سہم گئیں دل نواز کی منت کرنے لگیں۔

"ارے رہنے دو ایسی باتیں...... سمجھو اس کا مقدر ہی خراب ہے۔"

شہر نواز دو دن کی خصوصی چھٹی لے کر اس مسئلے کو سلجھانے آئے...... بہت سمجھایا کہ دیکھیں اپنے بیٹی کا بنا بنایا گھر کیوں خراب کرتے ہیں؟ آپ کی بیٹی کے مقدر میں جو ہو گا وہ اسے مل ہی جائے گا......مگر وہ کیوں مانتے۔

بالآخر انہوں نے دبی زبان میں اماں سے کہا کہ میں اپنی منگنی توڑ کر تابناک کی نند سے شادی کرنے کو تیار ہوں آپ ان سے میرے لیے بات کریں...... میرا خیال ہے وہ راضی ہو جائیں گے تابناک اور اماں غم سے نڈھال ہو گئیں...... ایسا ہیرے موتی

جیسا بھائی اور بیٹا۔ عمر بھر کی نیکیوں کا حاصل یہ ہو کہ اسے ایسی بیوی ملے...... جس میں کوئی گن ہنر نہیں معمولی سی شکل صورت اس پر بھائیوں کی دولت پر انتہائی درجے کا گھمنڈ۔

تابناک نے جیسے تڑپ کر کہا تھا۔

"شہر نواز کے لیے تو میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں اماں میں اپنے بھائی کو قربانی کا بکرا نہیں بناؤں گی اپنے سکون کیلئے اس کے ارمانوں کے خون کی بھینٹ نہیں دوں گی۔" اس نے دوٹوک طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

طلاق ہو گئی بہت آسانی سے...... اس لیے کہ ان عقل کے اندھوں کو خوش فہمی تھی انہیں ایسا رشتہ مل ہی جائے گا جو بدلے میں ان کی بیٹی سے شادی کر لے گا۔ لڑکی میں کوئی خاص بات ہو نہ ہو بھائی تو پیسے والے ہیں اور آج کل تو پیسہ ہی سب کچھ ہے۔

اس اندوہ ناک واقعے کے باوجود اماں تو اس بات پر شکر کرتی تھیں کہ بچہ نہیں ہوا تو اچھا ہوا...... عورت کو خصم بہت بچے کو باپ کہاں ملتا ہے...... شاید ہی کسی مرد میں اتنا ظرف ہو کہ وہ بیوی کی پہلے شوہر سے پیدا ہوئی اولاد کو اپنائے۔

نور الزماں کی بیگم کے بھی میکے میں اچھے خاصے کس بل نکل چکے تھے میکے میں بھاوجوں کا راج تھا...... چار دن لاڈ ہوئے پھر نوکروں کی طرح کام لیکر روٹی کھلانے لگیں تو اپنی مہربان ساس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ ایک دن سر جھکا کر واپس آ گئیں جبکہ نور الزماں ہنوز شہر نواز کے پاس تھے...... اللہ پر بھروسہ رکھنے والی اماں نے بہو اور پوتوں کو گرم جوشی سے گلے لگایا کوئی پچھلی بات نہیں دہرائی...... بلکہ بڑی سادگی سے یہاں تک کہہ بیٹھیں۔

"بیٹی تم ہمارے نکمے کے ساتھ رہنے کو تیار ہو...... ہمارے سر آنکھوں پر بیٹی......"

اب گھر میں شہر نواز کی شادی کی باتیں ہونے لگیں...... ان کی منگیتر اماں اور

تابناک کی پسند تھی اور ان کی فرسٹ کزن تھی جس سے تابناک کی دوستی بھی بہت تھی۔

مگر شہر نواز نے پھر شرط رکھ دی کہ وہ پہلے تابناک کا گھر بسائیں گے...... اماں سر پکڑ کر رہ گئیں کہ مطلقہ کو اتنی آسانی سے اچھا رشتہ کہاں ملتا ہے۔ میرے بچے کی عمر نکلی جا رہی ہے...... دل نواز نے تو اب اس معاملے میں چپ سادھ لی تھی۔

آخر شہر نواز کی سچی نیت کی کرامت ٹھہری کہ تابناک کیلئے رشتہ آ گیا۔ وہ انہی کے حلقے میں سے آیا تھا۔ بریگیڈیر کے سالے تھے۔ بیوی مر چکی تھیں دو بیٹیاں نانی پرورش کر رہی تھیں...... نام تھا طاہر حسین۔

اکیلے جیسا ہی معاملہ تھا شادی شدہ ہونے کے نہ بیوی تھی نہ بچیاں...... اماں نے اس خیال سے اور جلدی کی کہ اس کے چکر میں شہر نواز کی عمر سرکتی جا رہی تھی۔

پھر سے گھر بن گیا...... مگر اس گھر میں پہلی عورت کی بہت یادیں اور باتیں تھیں۔ اس کی طلاق پر کھوج بہت تھی کہ ایک لڑکی جو نہ میڈیکلی ان فٹ ہے نہ بد صورت وان پڑھ پھر اسے طلاق کیوں ہوئی۔

شہر نواز اسے باقاعدگی سے فون کر کے پوچھتا تھا کہ وہ خوش ہے؟ کوئی پرابلم تو نہیں؟ وہ ہمیشہ خود کو خوش باش اور پر سکون ظاہر کرتی۔

بعض لوگ کشش ثقل کی وجہ سے نہیں دُکھ کے وزن سے بھاری ہونے کی وجہ سے زمین پر پاؤں جما کر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

یوٹیلیٹی اسٹور سے نکلتے ہی اسے نور الزمان کا خیال آ گیا اس نے شوفر کو بلوچ کالونی چلنے کیلئے کہا اور آنکھیں موند کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی...... آنے والے لمحات کی فلم نظروں کے سامنے چلنے لگی...... نور الزماں مصنوعی ٹانگ سرہانے رکھے سیدھا سیدھا لیٹا ہو گا۔ بیوی بکتی جھکتی اِدھر اُدھر کام کرتی پھر رہی ہو گی۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ اسکول سے تو آ چکی ہو گی...... شہر نواز کی وفات کے بعد تو اسے نوکری کے ساتھ ساتھ اور

دوسرے کام بھی کرنا پڑ رہے تھے نورالزماں کے حصے کی دُکان سے تین ہزار کرایہ آتا تھا۔ دو ہزار اس کی بیوی کی تنخواہ تھی تین بچے تابناک کی خواہش پر اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے...... ہر ماہ وہ اپنے ذاتی اخراجات میں سے بچت کر کے وہاں پہنچا دیتی تھی...... نورالزماں نے ساری زندگی کچھ نہ کیا تھا اب تو ٹانگ کا بہانہ تھا۔ اماں بہت ضعیف ہو چکی تھیں ان سے زیادہ محنت کا کام بھی نہیں ہوتا تھا...... دل نواز اور شاہ زمان ان کو باقاعدگی سے ماہانہ دیتے تھے جو وہ خود پر کم اور پوتوں اور پوتی پر زیادہ خرچ کر دیتی تھیں۔

عموماً بڑھاپے میں لوگ لالچی سے ہو جاتے ہیں ہر چیز کا ہوکا ہو جاتا ہے پیسہ دبا دبا کر رکھتے ہیں ان میں اس قسم کی کوئی عادت نہیں تھی...... دنیا کی کسی شے میں جان نہیں اٹکی ہوئی تھی...... کبھی کبھی آہ بھر کر کہتیں۔

''جانے کی عمر تو میری تھی...... میرا ہیرے موتی جیسا بچہ چلا گیا...... میری نظر میں تو اب کوئی شے قیمتی نہیں...... جس کی حفاظت یا تمنا میں اپنی جان ہلکان کروں۔''

کار دھچکے سے رُک گئی...... نورالزماں کا گھر آ گیا تھا...... وہ اپنا بیگ اور ایک فروٹ کا تھیلا اُٹھا کر اُتر گئی...... ڈرائیور سے پندرہ منٹ کا کہا اور اندر داخل ہو گئی۔

اس کو دیکھتے ہی بچے خوشی سے شور مچانے لگے...... اماں کھل اُٹھیں...... بھابی کی بد مزاجی ہوا ہو گئی۔ نورالزماں کو ''مزید'' طمانیت نے آ گھیرا۔

اس نے فروٹ کا شاپر بھابی کو تھمایا اور اماں کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہیں اماں آپ؟''

''بس بیٹی اس دن تمہارے ہاں فاتحہ سے واپس آ کر طبیعت بہت خراب ہو گئی...... آج ذرا سنبھلی ہے...... ابھی تک میرے دن ہی نہیں گنے گئے...... بتاؤ جوان بچے کی فاتحہ کراتی ہوں...... بڑی ڈھیٹ جان ہے...... آہ...... ہا...... انہوں نے آہ بھری۔''

''بس ماں یہ سب مقدر کے کھیل ہیں انسان کا کیا زور۔''

''اماں...... آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں...... اب یہ میرا نصیب...... ٹانگ سے معذور ہو گیا ہوں ذرا محنت کا کام کروں یہ مصنوعی ٹانگ لگا کر تو ران کے پٹھوں میں درد ہونے لگتا ہے۔'' نورالزماں نے فوراً موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنی معذوری کی طرف توجہ دلائی۔

''ہاں ایکسیڈنٹ سے پہلے تو تم بہت محنتی تھے۔'' ان کی بیگم دُور ہی سے جل کر بولیں۔

''وہ تو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے شہر نواز بھائی کو، بڑا سہارا دیا انہوں نے ہمیں۔''

''ارے تو ٹیکسی چلاتے ہوئے تو ٹانگ ٹوٹی ہے۔ تم لوگوں کیلئے ہی تو مزدوری کر رہا تھا۔'' وہ دھاڑے۔

''چھوڑو نورالزماں اب یہ باتیں یہ بحثیں لاحاصل ہیں۔'' تابناک جلدی سے جنگ کا امکان رفع دفع کرتے ہوئے کہا اور ہزار کا نوٹ پرس سے نکال کر بھابی کی طرف بڑھی۔

''اچھا...... امبر...... میں چلتی ہوں...... مجھے آج شام چیک اپ کیلئے بھی جانا ہے...... پھر کسی دن فرصت سے آؤں گی۔''

چھٹا مہینہ چل رہا ہے ناں آپا......! امبر نے اس کے سراپے پر ناقدانہ نظر ڈالی۔

''ہوں......! اس نے صرف ہوں پر اکتفا کیا۔''

''اچھا اماں خدا حافظ......!''

"خدا حافظ بیٹا...... اللہ جلد تمہاری طرف سے کوئی خوشی کی خبر سنائے۔
آمین!"

"آمین......!" تابناک نے بھی دل ہی دل میں بے ساختہ آمین کہا......
(اب تو بہلنے کیلئے بہانے کی کھوج رہتی ہے اماں......)

☆☆☆

"کہاں سے آرہی ہو......؟" وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو طاہر حسین کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"کچھ کچن کی ضروری چیزیں کی شاپنگ کرنا تھی اسٹور گئی تھی پھر پندرہ بیس منٹ کے لئے اماں کی طرف۔"

"اوہ......! بھئی کم از کم مجھے تو پتہ ہونا چاہیے کہ کس وقت آپ کہاں ہیں......وہ برہمی سے کہہ رہے تھے۔

"مجھے اندازہ تھا کہ میں آپ کے گھر آنے سے پہلے پہنچ جاؤں گی۔ دیر تک باہر کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ آج اتفاق ہے کہ آپ جلدی آگئے ہیں۔" وہ روانی سے بولتی ہوئی لائی ہوئی اشیاء چیک کرنے لگی۔

"ہاں اتفاقات ہی سے بہت سی باتوں کا سراغ لگ جاتا ہے...... میں تو ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اگر تم گھر سے باہر ہوگی تو مجھے مطلع رکھو گی...... اگر مجھے کوئی اطلاع نہیں ملتی تو اس کا مطلب ہے تم گھر پر ہو...... جبکہ ایسا نہیں ہے۔" طاہر حسین بہت ڈسٹرب نظر آرہے تھے......موڈ بہت آف تھا۔

اس کی سمجھ میں خاک نہیں آرہا تھا کہ گھر کا سودا سلف لانے کی جلدی میں وہ اتنی نزاکت کا خیال رکھنا بھول گئی تو کیا کچھ بہت زیادہ ہوگیا...... ہر وقت شک وشبے کی مار بھی بہت بڑی روحانی اذیت ہوئی ہے...... اس نے تمام چیزیں ایک طرف سرکا دیں۔

"مجھے بار بار یاد دلانے کی ضرورت نہیں طاہر حسین کہ میں طلاق یافتہ ہوں...... پہلی شادی میں مجھے ایک مہرے کی طرح استعمال کیا گیا۔ آپ کو بھی اختیار ہے کہ اس مہرے کو پٹا ہوا مہرہ سمجھ کر ایک طرف ڈال دیں، نہ اُن کا کوئی کچھ بگاڑ سکا نہ آپ کا بگاڑ سکتا ہے۔"

وہ آنسو ضبط کرتی ہوئی اوپر گیسٹ روم کی طرف جانے لگی۔

سہتے سہتے کھلتا ہے کہ خواہ کتنا دانا بینا انسان ہو خواہ کتنا بہادر و باہمت ہو...... اسے غموں کی دھوپ میں چلتے ہوئے......حق کہنے والی زبان اور صبر کی تاکید کرتے الفاظ کی چھاؤں درکار ہوتی ہے......کوئی ایک خلوص کا رشتہ جو یقین و اعتماد کی انتہاء پر خلوص و اپنائیت کا احساس دلاتا ہو۔

تب ہی تو دُکھ کے پہاڑ کاٹ کر راستہ نکلتا ہے۔

تب ہی تو زندگی کا بوجھ ہلکا لگتا ہے۔

"تم ہمیں اسی لیے ملے تھے شہر نواز...... کہ ہم دنیا میں تم جیسا کھوجتے رہیں......کوئی تم جیسا تلاش کرتے رہے...... پورا نہیں تو کوئی تم سے ملتا جلتا۔

کلر کہار میں تمہاری جیپ کا ایکسیڈنٹ ہونے کی اطلاع ملی تو دُعا کا آسرا رہا۔ تمہارے واپس ملنے کی اُمید رہی...... وحشت کا دورانیہ اچھی اُمید سے پورا ہوا...... پھر تم ملے تو اس طرح کہ ہمیشہ کی نیند سو چکے تھے...... بڑا دُکھ ہوا...... بڑا ماتم ہوا۔

لیکن یہ کتنی حیرت ناک بات ہے کہ تمہاری رحلت کے وقت ماتم اتنا شدید تو نہیں تھا جتنا تمہارے جانے کے بعد آئے روز تمہارے نام پر ہوتا ہے۔ رنج وغم تو ہر انسان کے لئے ہے، کہیں کم کہیں زیادہ...... یہی تو خمارِ گندم کا تریاق ہے کاٹ ہے......مگر......حق بدلنے والی زبان، صبر کی تاکید کرتے الفاظ......غم سے نڈھال انسان کی ضرورت ہے...... ورنہ وہ گندم کھانے سے بڑا گناہ کر بیٹھے......یعنی حرام موت مر جائے احساس تنہائی سے پاگل ہو کر۔

مگر شہر نواز...... تم اتنے خوبصورت انسان تھے...... انسان کا تعارف تھے......

میں نے تمہارا اتنا ماتم کیا...... قدم قدم پر تمہیں اتنا سوچا...... کہ اب میں میں نہ رہی تم بن گئی ہوں...... میں بھی تو کچھ لوگوں کے لئے وہ بن سکتی ہوں جو تم ہم سب کیلئے تھے...... شاید یہ سچے موتی جیسی آب و تاب رکھنے والے لوگ اسی لئے آتے ہیں...... کہ دُنیا کو شرف انسانیت کا ٹھیک ٹھیک شعور دیں...... اور......

مکرو فریب وخود غرضی کی دھند سے اٹی دُنیا میں اس لیے زیادہ دن نہیں ٹھہرتے کہ یہ دُھند ان کی چمک دمک معدوم کر سکتی ہے۔"

"شاید......!" تابناک نے پردے سرکا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔

☆☆☆

سوال

پیریڈ شروع ہوئے دو منٹ تو ہو ہی چکے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی کلاس کی طرف بڑھی تھی لیکن یہ دیکھ کر رُک گئی کہ جناب اسمٰعیل سرشار ابھی تک اپنے لیکچر ہی میں مگن تھے اس نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالی اور ایک طویل سانس لے کر کھڑی ہوگئی اور ان کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

حسرت کی شاعری مکمل طور پر روایت شکن نہیں کہی جاسکتی، ہاں انہوں نے محبوب کے تصور کو کسی حد تک بدل دیا...... اسمٰعیل سرشار کہہ رہے تھے۔

"اب محبوب بالا خانے سے گھر کی ڈیوڑھیوں، دالانوں میں اُتر آیا تھا......"

"بالا خانہ سر؟" ایک شوخ آواز ابھری۔

"سر! وہ مولانا تھے......" ایک اور جوشیلے نقاد نے آواز بلند کی۔

"دیکھیئے ادبی تخلیق فطری صلاحیت کا عمل ہے اور اس کی نکاسی نثر کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ اور نظم کے انداز میں بھی صلاحیت خمیر میں گندھ کر آتی ہے میرے بیٹے اور اسے کوئی بھی ذی روح مذہب کے ادراک سے بھی پہلے محسوس کر سکتا ہے۔ اور

مولانا بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ اس کے احساسات انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ مذہب پر عمل پیرا ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمام تر انسانی فطری تقاضوں کو دفن کر دیا جائے بہرحال حسرت نے اپنے خیالات اپنی فکر کے اظہار کے لیے غزل کی راہ اپنائی اور جیسا کہ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ غزل کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا۔''

''سر! جاوید نے رات دل کھول کر عورتوں سے باتیں کیں۔''

''ہا...... ہا...... ہا...... پوری کلاس ہنس پڑی۔''

''کیا بدتمیزی ہے! کیا مطلب ہے آپ کا؟'' انہوں نے متکلم طالب علم کو گھور کر غصے سے کہا۔

''مم...... مم...... میرا مطلب ہے سر! جاوید کہہ رہا تھا رات انہوں نے دو غزلیں لکھیں طالب علم نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔ اس کی بے ادبی باہر کھڑی مس نازنین حیدر کو سخت گراں گزر رہی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹتی دروازے کے عین درمیان آ کھڑی ہوئی۔''

سر شاہ نے اس کی طرف دیکھا اور گھڑی پر نظر ڈال کر باہر نکل آئے بہت معذرت خواہانہ انداز میں سوری کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ مس نازنین نے دوپٹہ درست کیا اور کلاس میں داخل ہوگئی پوری کلاس روایتی انداز میں کھڑی ہوگئی۔

''تشریف رکھیے'' اس نے مخصوص انداز میں کہا مگر آج لہجے میں حد درجہ سنجیدگی تھی اس نے پوری کلاس پر ایک نظر دوڑائی۔

''کیا پڑھ رہے تھے آپ لوگ؟'' حالانکہ یہ اس کا مقام تھا نہ اخلاقی ذمہ داری کہ کسی دوسرے استاد کے پڑھائے گئے سبق یا دیئے گئے لیکچر کے بارے میں پوچھ گچھ کرے لیکن اب سے کچھ دیر قبل ہونے والی گفتگو کی وجہ سے اس کا دل چاہا کہ تھوڑی برین واشنگ کر ہی دے۔

''حسرت'' ایک لڑکی نے آہستگی سے جواب دیا۔

''صرف پڑھا، کسی نتیجے پر بھی پہنچے؟''

''جی میڈم......'' کئی آوازیں ابھریں۔

''بھئی جس شخصیت کے بارے میں پڑھ رہے تھے اس سے متعلق آپ کے ذہن میں کوئی واضح خاکہ بھی بنا؟'' اس نے اپنے مخصوص پر وقار انداز میں سب پر نظریں دوڑائیں۔

''میڈم! پہلے تو شعر ہوئے کچھ چکی کی مشقت کے، کچھ عاشق کی شرافت کے یعنی بس دور دور سے دیکھنے کی ہدایت تھی۔ پھر ان کی پیدائش اور ان کے پیدائشی نام کا ذکر ہوا کہ کس نے رکھا تھا۔ ابھی محبوب کو بالا خانے سے اُتار کر گھر میں پہنچایا ہی تھا کہ گھنٹی بج گئی'' اس پرائیویٹ کالج کے شوق ترین اور امیر ترین طالب علم نے استاد کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔

نازنین نے کڑے تیور سے اس طالب علم کو گھورا جو اب بیٹھ چکا تھا۔ پوری کلاس سر جھکائے مسکرا رہی تھی۔

''حارث احمد!'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''یس میڈم''

''جب آپ کالج میں داخل ہوتے ہیں تو کیا سوچ رہے ہوتے ہیں؟''

''یہی کہ کلاس شروع ہو چکی ہے یا شروع ہونے والی ہے''

''اور جب کلاس میں داخل ہوتے ہیں تو کیا سوچتے ہیں؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''یہی کہ اگر لیکچر شروع ہو چکا ہے تو تھوڑا بہت مس نہ ہو گیا ہو......'' وہ مسکرایا

''اگر پورا بھی مس ہو جائے تو آپ کو کیا فرق پڑے گا؟''

حارث احمد آپ اپنی احمقانہ سی حاضر جوابی پر نازاں، ایک بے ادب انسان

ہیں۔ قطعی احمق اس لیے کہ جو اپنے مخاطب کی صلاحیت و حیثیت سے غافل ہوتا ہے ایک دم بے وقوف ہوتا ہے' اس نے برہمی سے کہا ''آپ اپنی برجستگی و حاضر دماغی سے اپنے اُستاد کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ تو علم کے حوالے سے کیجیے آپ کو شفقت بھری داد ملے گی۔ اگر ایک معلم عرفان ذات کے مراحل طے کرنے کے دوران خاموشی کی زکوٰۃ آپ کی بدتمیزی پر دیتا ہے تو آپ جیسے کم عمر بچے شاید اسے اپنے معلم کی بے بسی سمجھتے ہیں۔ آپ کی گستاخی و بدتمیزی آپ کے لئے باعث آزاد ہوگی۔ صرف اور صرف آپ کے لئے آپ کا مودب ہونا آپ کے لئے فائدہ مند ہوسکتا ہے۔ آپ طلب علم کی ابتداء میں ہیں اور ہم اس سے ذرا آگے تصنع کے تمام تر مظاہرے ایک طرف رکھ کر استاذ نما طلب علم کی سنیارٹی کا احترام اسی طرح کیجیے جس طرح پر پوئیس والے فائینل والوں سے خود کو لاشعوری طور پر پیچھے دیکھتے ہیں۔'' وہ بول رہی تھی اور کلاس دم بخود سن رہی تھی۔

''آپ انکشافات کی عمر میں ہیں۔ لیکن بہت آگے جا کر بھی آپ کو تعجب ہوگا کہ مرحلے ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔..... انکشافات کا بہاؤ رکنے میں نہیں آ رہا۔''

تمام افعال گزشتہ اور اعمال رفتہ آپ کو بتائیں گے کہ پیچھے گزرنے والا ہر لمحہ ایک تجربے کا زینہ اور انجان دور تھا۔ آنے والے، شرمندہ کردینے والے لمحات سے بچنے کے لیے آپ آخر ان لوگوں پر بات کا اعتبار کیوں نہیں کر لیتے جو ان راستوں سے گزر کر آ چکے ہیں۔ اسی مقصد کے لیے یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اور اسی غرض سے آپ کو یہاں بھیجا جاتا ہے۔ زندگی کے تجربات اور لیبارٹری کے تجربات میں بے حد فرق ہے زندگی کے تجربات لاعلمی کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کا نام ہے اور لیبارٹری کے تجربات، تجربات نہیں بلکہ اعادہ ہوتے ہیں تجربہ تو ایک ہی دفعہ ہوتا ہے اور اسے ہوتا ہے جو اس کا نتیجہ پہلی مرتبہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے پھر اس کے بعد اس کے مقلد ہوتے ہیں تجربہ کار نہیں'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی کہ شاید کوئی بولے مگر سبھی چپ

رہے۔

لاعلمی کے اندھیرے میں ٹھوکریں کیوں کھایئے؟ وقت بچایئے۔ بہت کام ہیں پہلے کام تو یہ کیجیے کہ ''احترام آدمیت'' سیکھیے۔ حارث احمد! جو انداز آپ نے سرشار صاحب کی کلاس میں اختیار کیا، اس نے مجھے مجبور کیا کہ اس سلسلے میں میں آپ سے یہ سب کہوں یہ میرا فرض ہے۔ عموماً ہمارا معاشرہ عمر کے اس دور میں نوجوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا پسند کرتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس مقام پر بہت سی بڑی ذمہ داری استاد پر آن پڑتی ہے۔ آئندہ میں یہ بدتمیزی و گستاخی قطعی برداشت نہیں کروں گی۔ سن رہے ہیں آپ؟''

''یس میڈم'' حارث نے کھسیا کر کام کھجایا۔

''تشریف رکھیے'' اس کے لہجے میں نرمی عود آئی۔ اسے حارث کا یہ نادم سا انداز اچھا لگا باہمی دوستی کی یہ فضا بہت خوبصورت ہوتی ہے جب فریقین ایک دوسرے کو اس کے مقام سے پہچانیں، اور محسوس کریں خواہ یہ فریقین استاد و شاگرد کے باوقار رشتے کی دوڑ میں کیوں نہ بندھے ہوں۔

اب وہ اپنے لیکچر کی جانب آئی، وہ انگریزی پڑھاتی تھی۔ لہٰذا اب وہ ''سولیٹیری ریپر'' کی تنہا لڑکی کا دکھ عام کرنے لگی تھی پوری کلاس ہمہ تن گوش تھی۔

اس نے گیٹ دیکھ لیا تھا۔ دونوں شیطان زمین آسمان ایک کردینے کے درپے تھے اسے دیکھتے ہی چیخ پڑے۔ ''نازو خالہ آ گئیں..... نازو خالہ آ گئیں۔

اتنے پیارے پیارے بھانجوں کی شکل دیکھ کر اس کی تو جیسے تھکن ہی اتر گئی۔

''کون کون آیا ہے؟'' وہ پوچھتی ہوئی ان کے ہمراہ گیٹ پار کرگئی۔

''امی میں اور یہ حماد'' چار سالہ عماد نے خود سے سال بھر چھوٹے حماد کی جانب اشارہ کیا.....''

''پپا نہیں آئے؟'' اس نے اشتیاق سے بہنوئی کے بارے میں پوچھا۔

''نہیں'' وہ نازو کے جھولتے ہوئے چرمی بیگ پر حملہ آور ہوا۔

''ارے......رے! یہ کیا ہو رہا ہے عماد!'' ثریا آپا نے بیٹے کو فہمائشی انداز میں گھورا، پھر بہن کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

''السلام علیکم آپا'' وہ مسکرا دی۔

''وعلیکم السلام! کیا حال ہیں ہماری معلمہ کے؟'' انہوں نے پیار سے بہن کو دیکھا۔

''آپ کی معلمہ تو نہیں، ہاں بچوں کی معلمہ البتہ بہت اچھی ہیں۔ اور آپ اتنے دن کہاں رہیں'' اس نے شکوہ کیا۔

''ارے تمہیں کب سے میری فکر کرنے کی فرصت مل گئی!'' انہوں نے بھی جواب شکوہ داغ دیا......

''اچھا طنز مت کریں آپ تو جانتی ہیں کہ کالج کے علاوہ بھی گھر میں کس قدر کام ہوتے ہیں وہ بید کی ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔''

''ارے تمہیں تو شوق ہے بے تکان کام کرنے کا......اتنا پڑھا لکھا بھی پھر نوکری کی تو ہزار روپے کی جس میں کوئی تحفظ بھی نہیں۔ کسی گورنمنٹ کالج میں اپلائی کرتیں تو بات بھی تھی، ارے حماد گر پڑو گے'' بہن کی جھاڑ پونچھ کرتے کرتے انہوں نے کارنس پر چڑھتے صاحبزادے کو بھی روکا۔

''خدایا! یہ بچے ہیں یا مصیبت؟''

ماں کے ٹوکنے پر بھی حماد رکا نہیں تھا بلکہ برابر کارنس پر چڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ انہوں نے جھپٹ کر اسے مقابل کیا اور تھپڑ رسید کر دیا۔

''اوفوہ آپا! جب اس کی کوشش ناکام بنا ہی دی تھی تو تھپڑ مارنے کی کیا تک تھی؟'' اس نے ثریا کو ایک طرف کر دیا مبادا حماد کے ایک اور تھپڑ جڑ دیا جائے۔

''بھلا آپا اتنے سے بچوں کو بھی کوئی اس طرح مارا کرتے ہیں'' اس نے حماد کو

کھینچ کر گود میں بھر لیا'' بس اپنے پاس رکھو اپنی یہ نفسیات ان جیسا ایک بھی پالنا پڑ جائے تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ اتنا پٹ کر بھی قابو میں نہیں آتے۔'' انہوں نے دانت پیس کر حماد کو دیکھا جو اب خالہ کی گود میں دبکا بیٹھا تھا۔

''باپ کی صورت دیکھتے ہی سانس رک جاتا ہے......بھیگی بلی بن جاتے ہیں اور میری ناک میں تنکا چلا کر رکھتے ہیں۔''

انہیں سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔ درحقیقت وہ بہن سے بڑے موڈ میں باتیں کر رہی تھیں، اس دوران انہوں نے اپنی درجن بھر سونے کی نئی چوڑیوں کی تعریف بھی سننا تھی اور بائیس قیراط کے سونے کی خوبی و قدر کے تذکرے کے ساتھ چوڑیوں کے ڈیزائن پر بھی رائے لینا تھی۔ مگر بھلا ہو حماد کا سارا پروگرام گڈ مڈ کر کے رکھ دیا تھا۔

اسی وقت امی آ گئیں جو غالباً کچن سے نکل کر آئی تھیں ''ارے آ گئیں نازو بیٹا، دیر ہو گئی آج تو کچھ۔''

''جی امی کالج ہی سے دیر سے نکلی تھی۔''

''اچھا تو منہ ہاتھ دھو لو، ثریا نے بھی تمہارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تین بج رہے ہیں بھلا بتاؤ'' وہ تین کے ہندسے پر ٹکی سوئی کو تشویش سے دیکھتی ہوئی واپس کچن میں چلی گئیں۔

''دیکھو نازو کل جمعہ اسی لیے آج تمہیں میں لینے آئی ہوں......کل شام کو واپس آ جانا ہر وقت کام......کام، وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاؤ گی۔ آج شام کو پکچر دیکھیں گے اچھی سی وی سی آر تو مجھے بور کرتا ہے۔ پکچر ہاؤس کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ تمہاری بوڑھی سوچیں بھی سر منہ لپیٹ کر ایک طرف ہو رہیں گی۔ کچھ دیر کو تمہیں بھی دنیا اچھی لگنے لگے گی۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ اسی لیے خود آئی ہوں کیوں کہ پیغام کو تو تم گھاس نہیں ڈالتیں۔''

"آپا ایک تو چھٹی ملتی ہے، وہ بھی گھر پر نہ گزاروں؟" وہ ہنس پڑی مگر تھکے تھکے انداز میں......

"میں تمہیں جنگل میں لیے جا رہی ہوں؟ وہ گھر نہیں ہے؟" ثریا خفگی سے بولیں پھر اسے تھوڑی دیر بعد تیار ہو جانے کا حکم دے کر ماں کی مدد کرنے کے خیال سے کچن میں چلی گئیں۔

دونوں بچے برآمدے میں "ریسلنگ میں مصروف ہو چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اس نے چھٹی کے کئی پروگرام بنائے تھے جو آپا کے حکم کے سامنے خود بخود کینسل ہو چکے تھے۔

آپا اسے لے تو آئی تھیں مگر آتے ہی گھر کے بکھیڑوں میں الجھ گئیں۔ وہ بچوں کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر انگریزی فلم دیکھنے لگی۔ دونوں بچے نہایت شرافت سے اس کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔

"پپا کتنے بجے تک آتے ہیں حماد؟" اس نے استفسار کیا۔

"پتا نہیں" حماد نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹائے بغیر بہت بے نیازی سے جواب دیا اسی وقت آپا لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"نازو! بھوک لگ رہی ہوگی؟ کھانا لگواؤں۔"

"ایسی خاص بھوک تو نہیں ویسے بھی آج دیر سے کھانا کھایا تھا بھائی صاحب آجائیں تو ساتھ ہی کھالیں گے۔ بچوں کو البتہ کھلا دیں۔"

"اگر تم" ان کا انتظار کرنا چاہ رہی تو بے کار ہے ان کا کوئی وقت نہیں ہے بہت زیادہ دیر ہو جائے تو باہر ہی سے کھا کر آتے ہیں۔"

کیونکہ وہ کبھی رات کو رکی نہیں تھی ان باتوں سے لاعلم تھی۔ بہن کی بات سن کر اٹھ کھڑی ہوئی "تو پھر ٹھیک ہے کھا لیتے ہیں اور یہ بھائی صاحب اس قدر کام کرتے ہیں؟ آپ انہیں ٹوکتی نہیں؟"

کیا کہوں؟ آخر یہ عیش و آرام سب انہی کی محنت کے دم سے ہے۔" انہوں نے اپنے آراستہ ٹی وی لاؤنج پر نظر ڈال کر کہا اور باہر نکل گئیں، چال میں پہلے سے زیادہ اعتماد تھا جو شاید اس سوچ کا نتیجہ تھا کہ وہ اس خاندان کی سب سے باحیثیت شخصیت ہیں ابھی وہ ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک ہی پہنچی تھی۔ کہ پورچ کی سمت کھلنے والے دریچوں کی شیشے گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے جگمگا اٹھے۔

"غالباً بھائی صاحب آگئے ہیں" اسے بہنوئی سے ملنے کے خیال ہی سے مسرت سی ہوئی اسے اپنے یہ اکلوتے باوقار بہنوئی بہت اچھے لگتے تھے وہ ان کا احترام بھی بے حد کرتی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ آپا کو اتنا اچھا شریک حیات ملا اور اس وقت ملا جب آپا انتظار کے آخر لمحات سے گزر رہی تھیں اور خاندانی انگشت نمائی کی وجہ سے بے حد تلخ ہو چکی تھیں۔ اسے آپا کی دبی دبی سی آواز سنائی دی" امی کے ہاں گئی تھی آج...... نازو کو ساتھ لے کر آئی ہوں کل چھٹی ہے نا اس کی۔"

"اچھا کیا" جواد انٹرپرائزز کے مالک جواد بصیر کی سنجیدہ و خشک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ لباس تبدیل کر کے کھانے کے کمرے میں آجائیں۔" آپا کی تفاخر سے پر آواز اور مضبوط لہجہ اب خوشامد کے انداز میں تبدیل ہو چکا تھا۔

"میں کھانا کھا چکا ہوں۔"

"نازو سے نہیں ملیں گے؟"

"ابھی تو وہ کھانا کھا رہی ہوں گی" لہجے میں ہلکی سی نرمی چھلکی۔

"چند لمحوں بعد آپا مسکراتی ہوئی کھانے کے کمرے میں چلی آئیں اور بے بی سیٹ پر بیٹھے ہوئے عماد کے گھٹنوں پر نیپکن پھیلاتے ہوئے گویا ہوئیں "جواد آگئے ہیں، کھانا کھا کر آئے ہیں لہٰذا تم اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ ابھی تو وہ لباس تبدیل کر رہے ہیں پھر تم سے ملنے یہیں آئیں گے۔"

"آپ نہیں کھائیں گی آپا؟"

"ہاں...... ہاں...... میں بھی کھا رہی ہوں حمی چاند! لو یہ سوپ لو...... یہ میں نے تمہارے لیے بنایا ہے" انہوں نے حماد کو چمکارا جو حال ہی میں ٹائیفائیڈ سے "فارغ" ہوا تھا۔ پھر خود بھی کھانے میں مصروف ہوگئیں۔

"نازو جان! یہ روسٹ بیف لونا، بہت مزیدار بناتا ہے ہمارا بٹلر۔"

"لے رہی ہوں آپا بڑے پروگرام سے مارنے کا ارادہ ہے...... کھلا کھلا کر ماریں گی تو کوئی مارنے کا ذکر تو نہیں کرے گا۔ البتہ کھلانے کا خوب ذکر ہوگا۔" وہ زچ سی ہو کر ہنس پڑی تھی۔

"کوئی نہیں مرتا کھانے سے تبھی تو یہ حال ہے تمہارا، کام مزدوروں کی طرح کرتی ہو اور کھانا صرف سونگھتی ہو۔" انہوں نے ایک اور قاب اس کی سمت کھسکائی......

"کیا سونگھا جا رہا ہے؟" جواد بصیر کھانے کے کمرے میں سالی کو شرف ملاقات بخشنے چلے آئے تھے۔

"السلام علیکم بھائی صاحب۔" اس نے احترام سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام کیا حال ہیں بھئی؟"

"الحمدللہ بہت اچھے۔" وہ مسکرا دی۔

"سنا تھا تم نے کوئی پرائیویٹ کالج جوائن کرلیا ہے۔"

"جی ٹھیک سنا ہے آپ نے، وقت کا اچھا سا مصرف بھی تو ہونا چاہیے۔"

"گڈ کافی دنوں بعد آئیں۔"

"جی، بس وقت ہی نہیں ملتا آپ بھی تو بہت دنوں سے گھر نہیں آئے امی اکثر کہتی رہتی ہیں۔"

"جو مسئلہ تمہارے ساتھ ہے وہی میرے ساتھ بھی ہے۔ یعنی وقت۔" انہوں

نے عماد کے رخسار چھو کر جواب دیا "ویسے خالہ جان اور خالو جان ٹھیک ہیں نا؟" انہوں نے ساس سسر کی خیریت دریافت کی، وہ ابھی تک اسی طرح کھڑے کھڑے پر تکلف انداز میں بات چیت کر رہے تھے۔

"اچھا تم لوگ کھانا کھاؤ مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے، باہر سے کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں ڈیلنگ ہے ان کے ساتھ۔"

ثریا کے لیے یہ بہت عزت افزائی کا مقام تھا وہ ان کی بہن سے اخلاق سے مل رہے بلکہ بہت زیادہ اخلاق سے۔

"او کے۔" انہوں نے باری باری دونوں بیٹوں کے رخسار چھو کر پدری محبت کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

کسی قدر فارمل ہیں یہ بھائی صاحب، اس نے جاتے ہوئے جواد بصیر کی پشت پر نظریں جما کر سوچا۔

رات کو آپا ضروری گھریلو امور سے فارغ ہو کر اس کے پاس چلی آئیں۔

تمہیں اس لیے نہیں لائی تھی کہ تم پڑ کر سو جاؤ" وہ اس کے برابر ڈھے سی گئیں "سوچا تھا ڈھیروں باتیں کریں گے۔"

"اف اللہ! آپا بات یہ ہے کہ میرے تمام حواس خمسہ دن بھر استطاعت سے بڑھ کر کام کرتے ہیں۔ میں انہیں رات کو ممکنہ آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ یہ اگلے دن کے لیے پھر "شارپ" ہو جائیں، وہ جو کروٹ بدل کر سونے کی نیت سے لیٹ چکی تھی ان کی طرف مڑ کر تھکے تھکے انداز میں ہنس کر بولی تھی۔

"ارے چھوڑو یہ عالمانہ انداز، سارے خاندان والے کہتے ہیں کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھی ہو۔ زیادہ ملتی ملاتی نہیں ہو، مت مردہ کروا اپنی روح کو ہنسا کرو" انہوں نے اس کی پیشانی پر جھولنے والی لٹیں محبت سے سمیٹیں۔ "کل پکچر تو دیکھیں گے ہی، لیکن عطیہ کے ہاں بھی چلیں گے، بہت دن ہوگئے میرا اس کے ہاں جانا نہیں

ہوا سنا ہے اس کے میاں کی ترقی ہوگئی ہے۔ مبارک باد ہی دے آئیں گے۔ سرکاری ملازمت میں ترقی کی حد کہاں تک ہوگی یہی ہوگا کہ سترہ گریڈ سے اٹھارہ گریڈ تک جا پہنچے ہوں گے'' ان کے لہجے میں تمسخر تھا وہی تمسخر جو پہلے کبھی تلخی ہوا کرتا تھا اب حالات نے ''تلخی رفتہ'' کو ''تمسخر حاضر'' میں بدل دیا تھا۔ حالات شاہ ہوتے ہیں، جب جو چاہیں کر دیں۔

عطیہ کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس نے اپنے دل کے ارمان جو آپا کا دل جلانے سے متعلق تھے پورے کرنے میں کچھ زیادہ ہی عجلت دکھائی تھی، آپا اور عطیہ ایک دوسرے کی پیدائشی حریف رہی تھی۔ نمکین سے چہرے اور تیکھے نقوش والی آپا کو عطیہ پر ہمیشہ برتری حاصل رہی تھی۔ ان پر کیا تمام ہی رشتے دار ہم عمر بہنوں پر فرق یہ تھا کہ اکثریت کو آپا کے گنوں کی پروا نہیں تھی۔ لیکن عطیہ اس دوڑ میں جیتنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ تعلیمی میدان، گھریلو امور وفنون غرض ہر چیز میں ثریا نے حسین و جمیل عطیہ کو مات دی تھی۔

پھر ایک دن یہ ہوا کہ عطیہ نے آپا کو چت کر دیا۔ وہ خاندانی لوگوں کی اکلوتی بہو بن گئی تھی۔ اس کا شوہر کلاس ون آفیسر تھا، پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی ادائیگی کے عوض ایک پرکشش سی تنخواہ اور زندگی کی دوسری سہولتیں حاصل تھیں۔ دیکھنے میں بھی وہ ایک خوبرو مرد تھا پھر عطیہ نے ثریا سے شعوری والا شعوری طور پر گن گن کر بدلے لیے کبھی اسے تشویش ہوتی کہ آپا کا رنگ پہلے سے زیادہ کالا ہوگیا ہے کبھی اسے ان کی بڑھتی ہوئی عمر فکر میں مبتلا کر دیتی۔ کبھی اسے ہمدردی ہوتی کہ آخر موٹر میکنک کے گھر والے کیا سوچ کر آپا کا رشتہ لے کر آ گئے تھے اتنی سگھڑ اور لائق فائق لڑکی کے لیے توبہ...... توبہ!

قدرت نے آپا کا صبر خوب آزمایا تھا وہ انتیس برس کی ہو چکی تھی آپا کے بچپن کا احساس برتری عطیہ نے خجالت میں بدل دیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے ہاں دیر ہے

اندھیر نہیں لہٰذا ایک دن جب وہ کالج سے پڑھ کر واپس آئی ان دنوں وہ کالج میں پڑھ رہی تھی تو امی نے خوشخبری سنائی کہ آپا کے لیے بہت ہی اچھے گھر سے رشتہ آیا ہے۔ لڑکا بزنس مین ہے تین بہنیں ہیں، جو شادی شدہ ہیں ایک بڑا بھائی ہے جو باہر گیا ہے۔ سیدھے سادھے شریف لوگ ہیں یہ اور بات ہے کہ امی نے انتیس سالہ ثریا کو پچیس سال کا بتایا تھا انہوں نے مان بھی لیا لہٰذا امی کو ان کے سیدھے سادھے ہونے پر اور بھی یقین آ گیا تھا۔

خاندانی لوگ تھے۔ زیادہ چھان پھٹک ضروری نہ سمجھی گئی۔ پندرہ سال کی لڑکی کا رشتہ آئے تو ماں باپ عموماً بے توجہی کا اظہار کرتے ہیں...... گویا رشتہ لے کر آنے والا رشتہ لے کر نہ آیا ہو محض ''کچی بیری'' کا نظارہ کرنے آیا ہو اور انہیں اتنی خاصی پرواہ بھی نہیں ہوتی لیکن یہی بیٹی جب انتیس برس کی ہو جائے تو انہیں پہلے سے موجود بیوی پر بھی کوئی خاص اعتراض نہیں ہوتا مگر یہاں تو شکر تھا کہ لڑکا کنوارا تھا۔

لڑکے کی والدہ نے بتایا کہ ان کی خواہش تھی کہ دوسرا سمدھیانہ بھی پہلے بیٹے کے سسرال کی طرح مختصر ہو۔ لہٰذا انہیں آپ کے کنبے کا ''اختصار'' بہت پسند آیا ہے۔ درحقیقت یہ بہت مختصر کنبہ تھا، ماں باپ اور صرف دو بیٹیاں، آپ کی تو دنیا بدل گئی۔

اسے یاد تھا جب عطیہ، ثریا آپا کی نسبت طے ہونے کا سن کر مبارک باد دینے اپنے چار بچوں کے ہمراہ آئی تھی۔ تب آپا نے اونچے اونچے قہقہے لگا کر اس کا کلیجہ پھونکا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر آپا کی طرف دیکھا...... جو وارڈ ڈروب میں جانے کیا رکھنے لگی تھیں۔

''اف، کل جمعہ ہے...... آپا مجھے لے کر پھر'' بے چاری'' عطیہ کے ہاں جائیں گی۔ میں بدھو بنی، دونوں کی گفتگو سے کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ آپا سنگاپوری کی ساڑیوں کا تذکرہ کریں گی۔ ساتھ میں برطانیہ کی سینڈلوں کا بھی جوان

کے میاں سر پر رکھ یعنی سوٹ کیس میں رکھ لائے تھے۔ جو بعض اوقات سر پر بھی رکھ لیا جاتا ہے۔ پھر وہ بتائیں گی کہ اپنا تیسرا بچہ بھی وہ لندن میں جنہم دیں گے تا کہ وہ بیک وقت اور تاحیات برطانیہ و پاکستان کا شہری کہلائے اور رعائتوں، فائدوں کے سمندر میں غوطے لگائے۔ کتنا سمجھاتی ہوں آپا، چھوڑ دیں بے چاری عطیہ باجی کا پیچھا، معاف کر دیں ان کے کردہ نا کردہ قصور، یہ کینے، یہ جلاپے عطیہ سے زیادہ آپ کو بھڑ بھڑ جلاتے ہیں، اس نے ہمدردانہ انداز میں بہن کی طرف دیکھا جو کھڑکیوں کے پٹ بند کر کے اس کے پاس آرہی تھیں۔"

چھٹی تو اس کی پر لطف گزر گئی تھی۔ کچھ آپا کی وجہ سے، کچھ ان کے شرارتی سپوتوں کے باعث لیکن کالج کی عمارت میں داخل ہوتے ہی وہ پھر اپنے "اصل" کی جانب متوجہ ہوگئی۔

معلوم ہوا بی ایس سی سال اول و دوم کے طلبہ و طالبات آج پکنک پر جارہے تھے اسے یاد آیا کہ اس سے بھی پوچھا گیا تھا کہ آیا وہ پکنک پر جانا پسند کریں گی یا نہیں؟ اس نے ہمیشہ کی طرح انکار کر دیا تھا، کہ دوسری کلاسز کے بھی تو پیریڈ ہوں گے۔ خواہ مخواہ ہرج ہوگا آج اس کے دو پیریڈ فری تھے ایک تو معمول کا دوسرا سال اول (بی ایس سی) کی کلاس کا وہ آفس میں آئی تو اسماعیل سرشار صاحب بیٹھے کاپیاں چیک کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مسکرائے...... السلام علیکم! مس حیدر۔"

"وعلیکم السلام۔" اس نے بھی نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور اپنے ہینڈ بیگ میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

"آج غالباً آپ کا یہ پیریڈ فری ہوگا۔"

"جی ہاں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"یاد آیا مس حیدر، سنا ہے آپ نے سیکنڈ ایئر کے "دادا" حارث احمد کو پرسوں انسان بنانے کی "سعی" کی "اسماعیل سرشار نے اسے بغور دیکھا۔"

"وہ تو سب کو کرنا چاہیے۔" اب وہ بیٹھ چکی تھی "سرشار صاحب! معذرت کے ساتھ عرض کروں گی، ہم اساتذہ کو زیب نہیں دیتا کہ ہم اپنے سٹوڈنٹس کو "دادا" یا آوارہ کے نام سے یاد کریں۔"

"مس حیدر! آپ کو علم نہیں، اس بچے نے بہت عاجز کر رکھا ہے سرشار صاحب نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی پر چمکتے قطرے صاف کیے۔"

"ان نو خیز پودوں کی پرداخت ان کے والدین کے بعد ہماری ذمے داری ہے بلاشبہ وہ لڑکا بہت شوخ ہے ایک طرح سے ہماری صلاحیتوں کی آزمائش ہے حسرت سے متعلق اس کے ریمارکس پر مجھے بھی افسوس ہوا تھا لیکن سرشار صاحب، قصوروار یہ بچے نہیں ہیں۔ ان کی ذہنی نشوونما وہ لٹریچر کر رہا ہے جسے وہ لوگ لکھتے ہیں جو ان بچوں سے دُگنی عمر گزار چکے ہیں۔ پیٹ کا جہنم ٹھنڈا کرنے کے لیے ان لوگوں کو ان بچوں کی رگوں میں دوڑنے والا تازہ خون چاہیے۔ ان کی نشوونما وہ غیر ملکی فلمیں کر رہی ہیں جن کے "میکرز" نے یا تو بہت بھوک دیکھی یا بالکل نہیں دیکھی حتیٰ کہ محسوس نہیں کی۔ ہم ان کے ہاتھ تو نہیں توڑ سکتے۔ مگر ان کی صلاحیتوں کے مقابل اپنی صلاحیتیں تو کھڑی کر سکتے ہیں۔ جنگ صرف کمزور سے نہیں لڑی جاتی۔ بعض اوقات فریقین دونوں طرف سے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ مگر جیت بہرحال ایک ہی کی ہونا ہوتی ہے۔ معرکے سے پہلے ہی احساس شکست کیوں؟"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن......"

اس نے ان کی بات کاٹی "لیکن سرشار صاحب! یہ بھی شکر کا مقام ہے کہ ہمارے بہت سے بچے بہت زیادہ اچھے ہیں اگر ایک سجدے سے انکار کر دیتا ہے تو لاکھوں سر بسجود ہونے والے بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں بہت سے حارث احمد ملیں گے اور ہمیں حارث احمد ایسے بہت سے بچوں کو سنوارنا ہے۔ ایسے نہ کہا کیجیے سرشار صاحب بچوں کو، یہ تو بہت معصوم ہیں۔ اسلاف سے محبت و عقیدت کے ہنر ہم ہی نے انہیں

سکھانے ہیں'' اس کے لہجے میں اتنی حلاوت و شفقت تھی کہ سرشار صاحب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

پورا کالج مس نازنین حیدر کی قابلیت کا معترف تھا اس کے وقار، رکھ رکھاؤ اور قوت استدلال کے سامنے ''اکثر'' بے بس ہو جاتے تھے۔

سرشار صاحب ایک آئیڈیل پرست انسان تھے۔ مگر ان کے حصے میں دنیا سے بیزار کام کو بوجھ سمجھنے ولی چڑچڑی عورت آئی تھی۔ جو سرشار صاحب کی معقول بات کا جواب بھی اس طرح غرا کر دیتی جیسے وہ ساری دنیا کی نہ سہی، کم از کم سرشار صاحب کے خون کی پیاسی ضرور ہو، اتنے نفیس سے انسان کو مس نازنین حیدر جیسی معقول خاتون سے بات کرنے کا موقع ملتا تو ان کا احساس محرومی دو چند ہو جاتا ہے اپنے گھر کی بدنظمی بیوی کے کڑے تیور، نام نہاد بیماریاں شریر اور گستاخ بچوں کی دھما چوکڑیاں، نہ جانے کیا کیا انہیں شدت سے یاد آنے لگتا، ان کا خیال تھا جس گھر میں مس حیدر جیسی شخصیت ہو، وہاں تو انتشار و جہالت اُلٹے پاؤں بھاگیں۔

''سرشار صاحب! آپ نے میری کسی بات کا برا تو نہیں منایا؟'' اس نے گم صم سے اسماعیل سرشار صاحب سے پوچھا۔

''ارے نہیں نہیں مس حیدر! کمال کرتی رہیں آپ۔'' وہ الٹے شرمندہ ہو گئے۔

''پتا نہیں سرشار صاحب میں بچوں کے سلسلے میں اس قدر حساس کیوں ہوں؟ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان بچوں کو ایک مہم کی طرح سر کروں اس لیے کہ یہ ہمارے ہاتھ پاؤں کی توانائی اور آزادی و بقا کے ضامن ہیں۔ جب جب ان کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرے وجود میں روشنیاں سی پھوٹ پڑتی ہیں۔ ان سے زیادہ اہم چیز کوئی نہیں ہے'' اس کے کنوارے سے وجود سے ممتا کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ تخیل کے اس نورانی لمحے کی جھلک اس لمحے کا عادہ تھا۔''

کائنات نے ''ماں'' کے درجے کو انسانی درجات کی معراج بنانے کا سوچا ممتا تو عورت کے خمیر کی سب سے پہلی ''تہہ'' ہوتی ہے۔

زندگی مخصوص ڈھپ سے گزر رہی تھی۔ اس کے والدین کو اب اس کی فکر ہو چلی تھی مناسب رشتے کی تلاش تو خیر بہت عرصے سے جاری تھی مگر اب اس کی تلاش میں تیزی آ گئی تھی۔ وہ ان کی کوششوں سے بے خبر نہیں تھی مگر وہ خاموش تھی اسے اعتماد تھا کہ اس کے والدین اس کے خیالات و کردار سے آگاہ ہیں۔ وہ یہ سب مدنظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔''

''ثریا آپا تیسرے بچے کی ڈلیوری کے سلسلے میں لندن جا چکی تھیں۔ کان منتظر رہتے تھے کہ وہاں سے کوئی اطلاع آئے اور ایک دن اطلاع آ گئی کہ نیا آدم کیونکہ بے روح تھا، اس لیے اپنی ماں کی روح کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔''

ان سب پر تو گویا پہاڑ ٹوٹا تھا رات کو جنازہ آ گیا تھا نازنین کے تو گویا حواس معطل ہو گئے تھے سوئم کے بعد جب وہ لوگ گھر واپس آئے تو حماد اور عماد کو ہمراہ لے آئے کہ بچے سب سے زیادہ اپنی نانی اور خالہ سے مانوس تھے۔ انہیں ساتھ لانے پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھول جیسے بھی اس ناگہانی پر سہم کر رہ گئے تھے۔ گم سم حماد نے کئی بار اس کی تھوڑی چھو کر پوچھا تھا ''امی کہاں ہیں نازو خالہ؟'' کاش مجھے اس ''کہاں'' کا ادراک ہوتا، اس نے حماد کو سینے سے لگا لیا۔

اس نے کالج سے چھٹی لے لی تھی۔ زیادہ تر وقت بچوں کو بہلاتے گزرتا تھا۔

امی کو تو گویا یہ صدمہ لے ہی بیٹھا تھا عجیب گم سم سی ہو گئیں پھر یوں بھی ہونے لگا کہ بچے کبھی نانا نانی کے پاس اور کبھی دادا دادی کے پاس رہنے لگے ''انسانی رہائش'' اب یوں بھی نہیں ہوتی کچھ تو حل چاہیے تھا اس مسئلے کا۔

جب جواد بصیر کی والدہ نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا ''میرے بیٹے کا گھر برباد ہو گیا اسے تو بیوی لا دوں مگر ان شہزادوں کو ماں کہاں سے لا کر دوں؟''

تب نازو کی ماں قطعی کچھ نہ سمجھیں۔ صرف فریاد کی ایک ''لے'' لگا کر ان کا یہ جملہ جب انہوں نے کھل کر اپنا مدعا بیان کیا تب وہ گم صم بیٹھی سوچتی رہ گئیں۔ نواسے انہیں بھی بہت پیارے تھے، داماد ان کا بھی من بھایا تھا جو خوش حال تھا جس نے ان کی بیٹی کے قدموں میں دنیا کی نعمتیں بکھیر دی تھیں۔ انہیں سوال ناگوار نہیں گزرا تھا بلکہ انہیں صرف اپنی بیٹی کا خیال تھا جب انہوں نے نازو کے سامنے جواد بصیر کی والدہ کی بات دہرائی تو وہ بے تحاشہ چونک کر رہ گئی۔

''امی! کیا کہہ رہی ہیں، ابھی تو آپا کو مرے ہوئے پورا سال بھی نہیں ہوا اور آپ کو دوسری بیٹی کی خوشیاں سوجھنے لگیں۔''

''یہ تو اجڑوں کو بسانے کی بات ہے بیٹی! خوشیوں کے سوال نہیں ہیں پھول سے معصوم بچے ہیں، ان کا بھی سوچ نازو ہمارا تو سب کچھ اب وہی ہیں۔''

''امی رشتہ مستقل رہے تو اچھا ہوتا ہے پہلے رشتے کے بعد ایک ہی شخص سے دوسرا رشتہ میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

''یہ تو رشتہ ہوتا ہے بیٹی جو دو بولوں کے بعد آپ ہی اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔''

وہ پڑھی لکھی تھی اس کا علم اکسابی تھا۔

ماں بھی پڑھی لکھی تھی مگر اس کا علم تجرباتی تھا۔

پھر اس ''پیدائشی ماں'' کو بچوں کا مستقبل لمس میسر آ گیا۔ وہ بیگم جواد بصیر کے بچوں کی ماں۔

آپا کے بیڈ روم کا خلا پر کرتے ہوئے اس نے شدت گریہ کے ساتھ سوچا آپا! خدا کی قسم تیرے بچوں کے ٹوٹے پنگھوڑے جوڑنے آئی ہوں یہ اور بات ہے کہ یہ بھیدی بھی آشکارا ہوا کہ جواد بصیر کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ ثریا نازنین تھکے ماندے اعصاب کو تو صرف چراغ خانہ کی روشنی چاہیے تھی چاہے وہ جیسا بھی ہو۔

بظاہر سرد نظر آنے والا آدمی دنیا کے گنے چنے عیش پرستوں میں سے ایک لگا

تھا اسے، وہ مسکراتا بھی تھا لیکن اس کی مسکراہٹ کی بھی قیمت تھی وہ اسے خوشی دے دیتی تو وہ مسکرا دیتا تھا۔

مسکرانا تو اس کی سرشت میں تھا وہ بھی بڑی رعونت کے ساتھ سارا سارا دن اس کا کبھی فون بھی نہیں آتا تھا۔ رات کو آمد اچانک ہوتی تھی وہ اس کا کوٹ اتارنے اس کی پشت پر جا کھڑی ہوتی۔ مشام جاں کو معطر کرنے والی مہک اسے حصار میں لے لیتی اس کے چوڑے شانوں پر وہ نظر جما کر رہ جاتی۔

''یہ شانے خدا جانے مزدوری کر کے اتنے مضبوط ہوئے ہیں یا مزدوری پا کر؟

اس کے شکوؤں کے جواب میں جواد بصیر کا یہی کہنا تھا ''مزدوری کرتا ہوں ناز بیگم، اس قدر فارغ نہیں ہوں کہ گھر میں اپاہجوں کی طرح پڑا رہوں میں نے تم پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ تم کالج بھی جاتی ہو اس کے علاوہ بھی آنے جانے کے سلسلے میں آزاد ہو۔ میں اپنی ذاتیات میں دخل در معقولات پسند نہیں کرتا۔'' اس کے بعد اس نے ازلی دانشمندی سے معاملہ سنبھال لیا کبھی جواد بصیر سے شکوہ نہ کیا دکھ تو نظر انداز کیے جانے کا تھا۔ نو بجے تو جواد بصیر گھر آ جاتے تھے اس کے بعد بھی وہ گھر کے بائیں جانب بنے آفس میں مصروف ہو جاتے۔

اکثر رات کو جب وہ بچوں کو سلا کر اپنے بیڈ روم میں آتی تو گاڑیوں کے مسلسل ہارن سے اس کے اعصاب شل ہو جاتے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کون احمق ہیں جو رات کے وقت بھی اس قدر کام کرتے ہیں۔ یہ مسلسل تیسری رات تھی جب جواد بصیر نے بڑی عجلت میں کمرے میں قدم رکھا وہ کروٹ کے بل لیٹی انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے دراز کھول کر ایک پیکٹ باہر نکالا اور باہر واپس جانے لگے۔

''کیا میں اندر سے دروازہ بند کر سکتی ہوں؟ میں سونا چاہتی ہوں۔''

''بہت شوق سے۔'' سرد سا جواب ملا۔

''وہ اٹھ کر ان کے نزدیک چلی آئی۔'' کیا میں آپ کے بزنس میں آپ کا

ہاتھ بٹا سکتی ہوں؟ کم از کم آپ کا آدھا بوجھ تو کم ہو جائے گا۔"

"تم اس کی اہل نہیں ہو۔"

"رات کے وقت کی اس مصروفیت یا ''اوور ٹائم'' کا کوئی نام تو ہوگا؟"

جواد بصیر نے نازک سی نازنین کو دیکھا ''ناز! ایک بات ہے غور سے سننا اور خوب غور کرنا تمہاری بہن ثریا بہت عقل مند عورت تھی...... میں سمجھا تھا تم بھی اسی جیسی ہوگی۔ مجھے کھوجی لوگوں سے نفرت ہے سمجھیں؟"

جواد بصیر کا یہ نیا روپ تھا جو آپا نے نہیں بتایا تھا۔ وہ اس واقعے کو ازدواجی زندگی کی ایک کڑی تصور کر کے خاموش ہوگئی تھی۔ اس واقعے کو ٹھیک ایک ہفتے جب نیند کی شدت سے جمائیاں لیتی اپنے بیڈ روم کی سمت آرہی تھی تو اس نے کچن میں بٹلر کو ہنوز مصروف پایا۔

"بھئی اب کیا کر رہے ہو؟"

"بلیک کافی تیار کر رہا ہوں میڈم، صاحب کے دوست آئے ہیں۔"

"دوست! ہونہہ دوست کے ساتھ کتنا خوش کن سا تصور ابھرتا ہے بھلا جواد بصیر کا کوئی دوست ہوسکتا ہے۔ جب کہ مسکراہٹ دوستی کی کنجی ہوتی ہے جو جواد بصیر کے پاس ہے بھی تو محض جوابی، سرسری، احساس اتار، ہوگا کوئی پارٹنر کرارے نوٹوں کا آسرا۔" اس نے تلخی سے سوچا تھا۔

"یہ تم ٹرالی ادھر کیوں لے جا رہے ہو؟" وہ حیران ہوئی۔

"رات کو یہ لابی بند ہو جاتی ہے میڈم۔" وہ اسے ایسے بتا رہا تھا گویا وہ کسی ''کمپلیکس'' کا افتتاح کرنے آئی ہو، جیسے یہ اس کا گھر نہ ہو۔ ''بند ہوتی ہے تو کیا کھل نہیں سکتی وہ جھلا ہی تو گئی۔

"حکم نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"عجیب بے رحم آدمی ہے، عام گزرگاہ کو بند کر کے راتوں کو نوکروں سے اپنے

قلعے میں پریڈ کراتا ہے۔" اس کی طبیعت مکدر ہوگئی۔

ویسے تو کوٹھی کی بناوٹ اس طرح کی تھی کہ تین طرف سے راستے ڈرائنگ روم کو جاتے تھے۔ مگر جس راستے سے بٹلر جا رہا تھا، وہ راستہ تو بہت پیچیدہ تھا۔ وہ چپ چاپ اندر آگئی اور کروٹیں بدلتی رہی مگر چین نہ آیا تو اٹھ کر پھر باہر آگئی بٹلر غالباً اپنی رہائش گاہ میں جا چکا تھا وہ اسی راستے سے جس راستے سے بٹلر کو جاتے دیکھا تھا۔ ڈرائنگ روم کی طرف چلی، کھڑکیاں بند تھیں جن پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسے سخت کوفت ہوئی وہ دروازے کی سمت آئی ''کی ہول'' سے آنکھ لگا کر اندر جھانکا ایک نوجوان سا لڑکا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جواد بصیر اسے سمجھا رہے تھے اب اس نے آنکھ کی بجائے کان ''کی ہول'' سے لگا دیا اس نے بہت کچھ دیکھا...... وہ اسے آتشیں اسلحہ مع فہرست کے دے رہے تھے۔ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے کامران! لیکن آرزو اس کی بھی ماں ہے یاد رکھو، وفاداری کسی بلاک سے نہیں پیسے سے ہے جو ہماری آرزوؤں کی تکمیل کرتا ہے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کرنے والوں کو یہ ہمارا جواب ہے آرزو کی تکمیل کوئی گناہ، کوئی جرم نہیں یہ جسم ہمیں ایک مرتبہ استعمال کے لیے ملا ہے۔ ہمیں اس کے تقاضے پورے کرنا چاہیں۔"

"سر! پہلی مرتبہ تو جھجک ہوتی ہے نا۔" جوان جھجکا۔

"ہاں یہ درست ہے، دانے دانے کو ترسنے والے ''بوری'' کیسے برداشت کر لیں مگر بے فکر رہو تم اکیلے نہیں ہو یاد رکھو! کامیابی کی صورت میں تم ہمارا وجود ہی ہو، ناکامی کی صورت میں ہمیں نہیں معلوم تم کون ہو؟" جواد بصیر کا لہجہ ایک بار پھر سرد ہوگیا۔

"کامران! یہ آرٹ ہے، ہمارے مشرقی بلاک کے مرکز میں باقاعدہ یونیورسٹی ہے جو دہشت گردوں کو باقاعدہ ڈگری کے ساتھ فارغ التحصیل کرتی ہے۔"

نازنین کے پاس تلے سے زمین سرک رہی تھی۔ جواد بصیر بولے جا رہا تھا

''ہمیں ترقی پسند بلکہ ترقی پرست تازہ دماغ چاہئیں تم اپنے ساتھیوں کو اٹھتے بیٹھتے ٹٹولا کرو یہ اپنے پاس رکھو۔

''یہ کیا ہے سر؟''

''یہ سرخ انقلاب کا نشان ہے، ہماری رکنیت کی چابی۔''

''تھینک یو سر۔''

''لوگ تو ویسے بھی مرتے رہتے ہیں کامران کسی کے کام ہی آ جائیں تو کون سا گناہ ہے۔''

''سر! یہ ''ریل'' کی آمد سے صرف تین منٹ پہلے رکھنا ہے نا۔''

''ٹرین کی آمد سے صرف تین منٹ پہلے معاوضہ پچاس ڈالر فی کس۔'' جواد بصیر کے لہجے میں بھیڑیا غرا رہا تھا۔

''سر! یہ کیسے پتا چلے گا کہ کتنے آدمی......؟''

کامران نے پچاس ڈالر فی کس کے حساب سے اندازہ لگانا چاہا۔

''اگلی صبح اخبار پڑھ لینا، تعداد لکھی ہوتی ہے خبر میں۔''

''یہ کام کب کرنا ہے سر؟''

''فون پر بتا دوں گا۔''

''ہمارے سامنے شاندار مستقبل ہے اگر ہم اس خطے سے ترقی پسند دماغ اکٹھے کرلیں تو......۔''

نازنین نے کی ہول سے کان ہٹا لیا اور شل اعصاب سے بچوں کے بیڈ روم میں آ گئی۔ اس نے متوحش نظروں سے دونوں بچوں کو دیکھا اور سوچنے لگی ترقی پسند ذہن، شاندار مستقبل، سرخ انقلاب، سنہرے انقلاب تو محض خواب ہوتے ہیں مسٹر جواد بصیر جب تک خون کا رنگ سرخ ہے انقلاب سرخ ہی ہوں گے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کبھی انقلاب سے پہلے سرخ چھینٹے پڑتے ہیں: کبھی انقلاب کے بعد آج تک نیلا پیلا،

ہرا، بھورا، انقلاب نہیں آیا انقلاب تو سرخ ہی ہوتے ہیں اکثر یہ کوئی انوکھی اصطلاح نہیں ہے جواد بصیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟'' اے خدا ٹیں کہاں اتنی اہم آزمائش کے قابل تھی۔ میں جن دماغوں کو دن بھر جنہیں کہتی ہوں بناؤ، تم انہیں رات کو کہتے ہو مٹاؤ، دو ذہن تمہارے گھر میں پرداخت ہو رہے ہیں جواد بصیر! مگر میں انہیں کسی انقلاب کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔

''تمہاری بہن تم سے زیادہ عقلمند تھی......'' جواد بصیر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے، ہاں جواد بصیر! شاید اس لیے کہ میری کوئی حریف ''عطیہ'' نہیں ہے۔

وہ صبح کلاس میں بچوں سے ملک دشمن سرگرمیوں پر ہی تو بات کر رہی تھی۔ کتنی چاہ سے انہیں سمجھا رہی تھی۔ کہ آپ اگر کوئی ننھا سا پودا لگائیں، اسے پانی دیں، پروان چڑھائیں، جب اس پر پھل پھول کا موسم آئے تو کوئی اسے کاٹ ڈالے کیا گزرے گی آپ پر؟ آپ لوگ تو ہمارے ننھے سے پودے ہیں جن پر بہار آ رہی ہے۔

تمام کلاس خاموش ہو گئی تھی گویا سب نے کٹنے والے پودے کے مالی کا دکھ محسوس کر لیا تھا۔

''اسی لیے آپ کو سمجھایا جاتا ہے کہ دور طالب علمی میں تمام تر پرخلوص توجہ اپنی تعلیم پر دیجیے اپنے ہنر کو کمال کیجیے۔ خوشحالی تو آپ ہی آپ پھوٹ پڑے گی۔''

اسے معلوم نہیں تھا کہ گرگوں کا گرگا اس کے وجود کا حصہ ہے......اسے اپنے وجود سے کراہیت آنے لگی۔ تمام رات اس نے کانٹوں پر بسر کی تھی کہ فیصلے سے پہلے کا ذہن دمکتا تنور ہوتا ہے۔

''میں نے تم سے زیادہ احمق عورت آج تک نہیں دیکھی......'' جواد بصیر نے

سلاخوں کے پیچھے سے برقعے میں لپٹی نازنین کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ زخمی ناگ ہو رہے تھے۔'' جواد بصیر! آپ شاید ٹھیک کہتے ہوں مگر مجھے آپ سے اور خود سے بھی زیادہ اس سرزمین کے بچے اہم محسوس ہوتے ہیں، کیا ہماری قبریں فاتحہ اور پھولوں کی آرزو مند نہیں ہوں گی؟ میں پھول چڑھانے والے ہاتھوں کو کیسے کٹتا دیکھوں؟'' میں تمہارا سہاگ ہوں نازنین'' سہاگ تو وہ کمزور رشتہ ہے جس کا چہرہ بدل بھی جاتا ہے لیکن ماں دوبارہ نہیں ملتی جواد بصیر، یہ سرزمین ہماری ماں ہے، میں آپ سے ایک سوال کر رہی ہوں، کوئی اپنی ماں کی چادر بھی اتارتا ہے؟''

☆☆☆

دوسری بہار

''امی یہ روئے جا رہی ہے، لے کے چپ ہی نہیں ہو رہی ہے۔''

اسما نے اسے دوسرے شانے پر ٹکاتے ہوئے ماں سے کہا۔

''ماں کے سامنے لئے کھڑی رہو گی تو روئے گی نہیں...... سونے والی ہو رہی ہے، جاؤ۔ اُوپر جا کر سلا دو......'' انہوں نے نواسی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

تب اس نے آنچل سنوارتے ہاتھوں کو روکا...... ''سنو ذرا اُوپر کے لئے اسے مجھے دے دو...... آواز دینا ذرا اسما کو۔'' اس نے ہما سے نہایت ہی دھمی آواز میں کہا۔

''ارے بچو...... بس آپ ٹھیک سے بیٹھی رہیں...... وہ اسے سلانے جا رہی ہے۔''

اور اس نے...... آنکھوں میں آئے قطروں کو رومال میں جذب کر لیا۔

اسی دم لڑکیوں میں کھسر پھسر ہوئی...... ''اے ہٹ جاؤ۔ قاضی صاحب آ رہے ہیں......'' اور اس کے ساتھ ہی اس کے سامنے سے بھیڑ چھٹ گئی۔!

☆☆☆

جب سے تاریخ ٹھہری تھی، وہ رو رو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔

جس نے کبھی گھر سے باہر، کسی رشتہ دار کے ہاں رات قیام نہ کیا تھا۔ خواہ کسی کی شادی ہوتی بیاہ ہوا۔ اس کے لئے کراچی سے ایک دم پشاور جانا بڑی بات تھی...... گھر والوں سے اتنی دوری کا احساس پاگل کئے دے رہا تھا......

ہما اپنے دلی کرب کو چھپا کر اسے چھیڑتی......

''خدارا بجو...... بس بھی کرو...... اس طرح روتی رہیں ناں تو اور صورت بگڑ جائے گی...... اور پہچانی بھی نہیں جائے گی اور تمہارا وہ پٹھان...... پاپا کو پکڑے گا......''

سب مسکرا پڑتے...... مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا سایہ تک نہ لہراتا۔

دُلہن بنی اور ایک بے خبری کے عالم میں سدھاری اسے نہیں معلوم موٹر میں کون کون بیٹھا تھا...... مگر پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص کو گمبھیر آواز نے جو کئی بار سرگوشیوں میں ابھری تھی۔

''آپ تھک گئی ہوں گی۔ میرے کندھے سے سر ٹکا لیں۔'' اسے احساس دلایا کہ وہ کس کے پہلو میں ہے۔ تب وہ سنبھل کر اور مزید سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

اس شخص کا بولتا سراپا اسے نگاہیں جھکانے پر مجبور رکھتا تھا...... سات دن پرانی ہو کر بھی اسے اس شخص سے ٹوٹ کر حیا آئی تھی...... کافی دنوں تک آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ جب بھی وہ اسے لینے کراچی آتا۔ وہ گھنٹوں باہر نہ آتی...... پتہ نہیں سارے جہاں کی حیا اس میں آ گئی تھی...... بہنوں کی شدید نگاہوں کی تاب لانے کی ہمت اس میں نہ تھی...... اور تب امی آ کر اسے ڈانٹتی تھیں۔

''جاؤ جا کر دیکھو...... اتنی دور کا سفر کر کے آیا ہے کپڑے وغیرہ دیکھو اس کے...... اور وہ ماں کے حکم کی تعمیل کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کمرے کا رخ کرتی جہاں وہ اس کے انتظار میں سوکھ رہا ہوتا۔ اسے دیکھ کر بے ساختہ اٹھتا اور وہ گھبرا کر رہ جاتی۔

''دیکھیں اسماء وغیرہ گھر پر ہیں...... ابھی آپ سے مل کر گئے ہیں سب...... آپ غسل کر لیں...... کون سے کپڑے نکالوں؟''

وہ اس کا سوٹ کیس کھولنے بیٹھ جاتی...... تب وہ چابی اس کی طرف پھینک کر جھنجھلا جاتا۔

''جلدی کرو یار بس سامان سمیٹو......''

''جی......؟'' وہ حیران ہو جاتی۔

''جی......! ہمارا اپنا بھی گھر ہے......'' وہ اسے دیکھ کر مسکراتا...... اس مسکراہٹ میں بہت سی حسین کہانیاں ہوتیں وہ جھینپ جاتی۔

''آپ غسل کر لیں میں کھانے کا انتظام کرتی ہوں......''

''ہما اور اسماء تو ہیں!''

''جی مگر انہیں آپ کی پسند نہیں معلوم......''

''اچھا، استاد سمجھ لیں گے۔'' اور وہ مسکراتی ہوئی باہر آ جاتی۔

☆☆☆

اس کی سسرال بہت اچھی تھی۔ ساس تو تھی ہی نہیں...... بڑی نند تھیں جن کے بچے بھی جوان ہو چلے تھے۔ جیٹھ تھے جٹھانی تھیں جن کے دو بچے تھے جو بچے ہی تھے...... ایک دیور تھا۔ جو انٹر سائنس کا طالب علم تھا...... سسر ریٹائر ہو چکے تھے اس کے شوہر اور جیٹھ معقول کماتے تھے۔ گھر خوبصورت سہی مگر کرائے کا تھا...... جس کا کرایہ اس کے شوہر کے ہی ذمے تھا...... اور مکان تو اسے جہیز میں ملا تھا...... شاید یہی وجہ تھی کہ رشتہ کرتے وقت صرف ان لوگوں کی اچھائی دیکھی گئی تھی۔ پاپا اپنے زمیندار باپ کے اکلوتے بیٹے تھے...... پڑھائی کی غرض سے شہر آئے تو یہیں کے ہو رہے اور دادا جان نے اپنی تمام جائیداد اکلوتے بیٹے کے نام کر دی تھی۔ جن میں تین مکان دادا جان کے گھر کو ملا کر باغات اور زمینیں تھیں۔ سو جب لڑکیوں کی شادی کی تو جائیداد میں سے مکان بیٹوں کو دے

دیئے۔ بیٹیاں چار تھیں۔ ایک کے نام زمین کر دی کیونکہ پاپا کا بھی ایک ہی بیٹا تھا۔ باقی سب کچھ اسی کے نام کر دیا وہ کہتے تھے کہ جو کچھ کرنا ہے...... کر لینا چاہئے زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں...... بیوی بچے خاموش رہے اور جو فیصلہ عرفان احمد نےکیا سب نے سرتسلیم خم کیا...... ایسا کیونکہ سب سے بہت بڑی تھیں ان کی شادی جس وقت، ہوئی وہ سب اسکولوں میں تھے...... اور اب مکان باعث اُلجھن بن گیا تھا۔ جب سے آپی کو معلوم ہوا یعنی اس کی بڑی نند کو کہ وہ ایک چار بڑے بڑے کمروں کے مکان کی ملک ہے تو عمر سے پرزور انداز میں کہنا شروع کیا کہ وہ مفت میں کرایہ ضائع نہ کرے اور دلہن کا مکان جو سندھ میں ہے۔ بیچ کر پشاور میں مکان لے لے۔

تب عمر نے اس سے کہا تو وہ ظاہر ہے کیا کہہ سکتی تھی سو کہہ دیا کہ اسے کیا اعتراض ہوسکتا ہے مگر وہ اپنے والدین کی رائے بھی لینا چاہتی ہے تو عمر خاموش ہو گئے۔

وہ کمرے میں بیٹھی میگزین پڑھ رہی تھی...... عمر کمرے میں نہیں تھے کافی دیر سے گھر میں کوئی آواز بھی نہیں اُبھری تھی۔ شب کے دس بج رہے تھے...... وہ بھابھی کے کمرے کی طرف بڑھی کہ آپا بی آئی ہوئی ہیں دونوں باتیں کر رہی ہوں گی۔ ہلکے ہلکے باتیں کرنے کی آواز رہی تھی......

''یہ ماں باپ کی رائے لینے کی تک اپنی سمجھ میں نہیں آتی...... بھئی چیز دلہن کی ہے، وہ کیا بولیں گے بھلا...... مگر تم مکان اپنے نام سے لینا...... ورنہ ساری عمر سر جھکا کر ہی رہو گے۔ جو بہوئیں جہیز بہت لے کر آتی ہیں۔ ان کے مزاج بھی بہت ہوتے ہیں۔ مانو قدم زمین پر نہیں دھرتیں...... میری بات گرہ میں باندھ لو......''

''ہاں......! اور کیا......!'' بھابھی نے بھی ٹکڑا لگانا ضروری سمجھا۔

''نہیں خیر آپا بی وہ ایسی نہیں ہے......'' عمر صاف گوئی سے باز نہ رہ سکے۔

''اے شروع میں تو سب ہی ایسی ہوتی ہیں...... بعد میں ناک چنے چبوا دیتی ہیں...... میاں لگام کھینچ کر ہی رکھو۔ ارے میں نے اس جگہ رشتے کی خاطر جوتیاں گھس

ڈالیں نہ دن دیکھا نہ رات ریل گاڑیوں میں حشر برا بنوایا...... کس کے لئے......؟ تمہارے لئے ناں...... جب سنا تھا کہ بڑی کو جہیز میں مکاں ملا ہے...... تو سوچا تھا کہ چھوٹی کو بھی بھاری چیز ہی دیں گے۔ بڑی کی ممیاں ساس میری طرف رہتی ہیں انہوں نے بتایا تھا...... مجھے تو...... اور کیا برا کیا ہے...... کیا برائی ہے عمر میں...... ہزاروں میں ایک ہے......''

اس کے دل پر دھکا سا لگا...... ایک کراہیت سی محسوس ہوئی کس طرح اس سے چھپا کر باتیں کر رہے ہیں...... آخر وہ انہی لوگوں کے لئے تو ہے...... اتنی غیرت۔

اتنی اجنبیت......!

کیا وہ مکان دینے پر راضی نہ تھی......؟

کیا اس نے ان لوگوں کو الگ سمجھا تھا......؟

اس کا سب کچھ عمر کا نہیں ہے......؟

اسے شدید رنج اس بات کا ہوا تھا کہ اس کے خلاف عمر کو بھرا جا رہا تھا...... بغیر کسی بات کے...... کسی تصور کے...... کسی قصور کے...... کسی وجہ کے......؟ اس حساس اور خوفزدہ سی لڑکی کے آنسو بہہ نکلے...... یہ پیش بندیاں...... حفاظتی اقدام...... پہلے سے پہلے خطرات سے نبرد آزما ہونے کے منصوبے...... گویا وہ لوگ اس پر اعتماد نہیں کرتے۔

اس کے نزدیک تو اخلاق، اخلاص سے بڑھ کر کوئی چیز نہ تھی اسے تو کوئی فخر و غرور، کوئی گمان نہ تھا کہ وہ صاحب جائداد ہے۔ اور یہ بات تو اس کے لئے تازیانہ تھی کہ اسے مکان کی وجہ سے قبول کیا گیا تھا...... اس کے گھر کی مٹی لینے کی وجہ اس کے گن و ہنر یا صورت نہیں...... مکان تھی۔

وہ دل شکستہ سی واپس کمرے میں لوٹ آئی۔

☆☆☆

اس نے پاپا کو خط لکھا...... تو پاپا کے بجائے امی نے جواب دیا۔

''تمہارے پاپا مکان کا سودا کر کے...... رقم بھجوا دیں گے...... مگر دیکھو تم اپنے نام رکھنا...... کہ وہ تمہارے باپ کی نشانی ہو گی...... اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے سسرال والے بھی کوئی اعتراض نہیں کریں گے...... کیوں کہ ہم جانتے ہیں۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں......''

عمر تو ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئے...... مگر جب آپا بی کو معلوم ہوا تو بھڑک کر بولیں۔

''اے لو یہ شرط خوب رہی...... کہ مکان دلہن کے نام ہو...... یہ دلہن کی مرضی ہے کہ کسی کے بھی نام کریں...... اب اتنی دور بیٹھ کر بھی ماں بیٹی کی چابی اپنے ہاتھ میں رکھیں گی......''

آپا بی کا انداز تخاطب اس کی جان جلا گیا...... مگر وہ چپ رہی۔

''میں کس کی ہوں......؟''

خلوتی لمحات میں کیا گیا سوال عمر کو چونکا گیا...... مگر مسکرا کر بولے۔

''میری ہو۔''

''تو مکان بھی آپ کا ہے...... لوگ کاغذات کی پڑتال کرنے تو نہیں آئیں گے...... جس میں میں اور آپ رہیں گے لوگ اسے آپ کا ہی گھر کہیں گے......''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ امی نے کچھ سوچ کر یہ مشورہ دیا ہے کہ مکان میرے ہی نام رہے......''

''سوچا کیا ہو گا...... یہی کہ مکان ہتھیا کر کہیں تمہیں چھوڑ نہ دوں......!'' عمر تلخی سے کہہ کر کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے......

اور وہ لرز گئی...... اُف! انہوں نے اتنی بڑی بات کیوں سوچی......؟ اُف......

میرے خدا...... وہ الجھ کر رہ گئی۔ اگر یہ شخص کہہ دیتا کہ کوئی بات نہیں...... تمہارے نام سہی۔ تو کتنا بلند نظر آتا...... اب مکان پر جھگڑتے ہوئے کتنا خود غرض لگ رہا ہے...... توبہ...... اتنی محبت کرنے والے کا یہ دوسرا انداز کس قدر جاں سوز ہے...... وہ تو یہی سوچ رہی تھی کہ ماں کو لکھ دے گی جب رہنا یہیں ہے ساری زندگی تو کیوں، نہ مکان عمر کے نام ہی کر دے...... مگر ماں کے متعلق توہین آمیز کلمات اس سے برداشت نہ ہو سکے...... انا ایک دم تن کر کھڑی ہو گئی......

اس سے مزید بات نہ کی گئی۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگی......

شاید آپا بی کو معلوم ہو گیا تھا...... روز وہ صبح ہی صبح وارد ہوتی تھیں...... وہ اور بھابھی گھر کے کام میں مصروف تھیں۔ آپا بی دھوپ سینکنے برآمدے میں بیٹھ گئیں...... وہیں بیٹھے بیٹھے باتوں کے رجسٹر کھولنے لگیں......

''بڑی دلہن...... اپنا گھر جس کا ہو صحیح معنوں میں دولت مند تو وہی ہے...... اب اللہ کرے گا عمر گھر لے لے گا......

......کرایہ بچے گا...... اے ہم نے تو سدا بھائیوں کا بھلا ہی چاہا ماں تو میری گود میں ڈال کر سدھاریں...... پالا پوسا جوان کیا...... اپنی شادی ہوئی مگر آج تک ایک پیر میکے میں ایک سسرال میں رہا...... تم تو سگے چچا کی تھیں اس لئے تمہیں لائی تھی کہ ان سب کو اپنا سمجھو گی دکھ سکھ میں ساجھا کرو گی...... اور بی بی تم نے بھی کر دکھایا...... بھیا اپنا خون اپنا ہے...... آنکھ میں تھوڑا لحاظ تو ہوتا ہے۔''

تب وہ سمجھ گئی کہ چوٹ اس پر کی جا رہی ہے...... ہمیشہ کی طرح آنسو آنکھوں میں بھر آئے......

''اُف میں بھلا کیا کہہ رہی ہوں...... میں نے سمجھا کہ ماں ٹھیک کہہ رہی ہیں...... ان لوگوں نے مخالفت کی تو سوچا ماں کے منع کرنے کے باوجود وہ مکان عمر کے نام کر دے گی...... آخر اس کا سب کچھ عمر ہی تو ہے...... آپا بی! کاش آپ نشتر لگانے سے

پہلے مجھے بھی اپنا سمجھ کر کچھ کہتیں...... میرے دل کی آواز سن لیتیں......

فاصلے تو آپ خود پیدا کر رہی ہیں...... کتنی غیریت ہے مجھ میں اور آپ میں...... میں تو خود عاجز آ گئی ہوں۔ اس مکان سے...... مجھے نہیں چاہیے...... دولت...... ایک بہو کی عزت تو جب ہے جب سسرال کے لوگ اس سے خوش ہوں...... یہ طنز...... یہ استہزا...... کاش آپ لوگ مجھے اپنا سمجھیں۔''

اس نے آنکھوں سے آنسو خشک کیے...... اور آپا بی کی طرف بڑھی...... مگر ان کے سرد اور سپاٹ چہرے نے اس کے بڑھتے قدم روک دیئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی......

''شکلیں تو ایسی معصوم ہوتی ہیں۔ مگر اندر سے گنوں پوری اے ہمیں بھوکا ننگا سمجھا ہے لوگوں نے......''

آپا بی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی......

اسے ایک گھٹن اور الجھن کا احساس رہنے لگا تھا......

آپا بی کی طرف سے قدرتی طور پر میل آ گیا تھا......

پھر بھی وہ اچھی قوتِ برداشت کی مالک تھی......

☆☆☆

عمر ایک روز اسے آپا جی کے ہاں لے گئے...... ان کی بچیاں بہت خوش ہوئیں...... ممانی کو دیکھ کر...... تینوں جوان تھیں۔ خوب ذمہ داری سے گھر سنبھالے ہوئے تھیں...... وہ آپا بی کے ہاں دوسری بار آئی تھی۔

عمر ذرا ادھر ادھر کو ہوئے تو آپا بی نے پان میں الائچی ڈال کر پان اس کی طرف بڑھایا۔

''دلہن......! یہ جو تمہاری ماں کہہ رہی ہیں ناں...... یہ گھر بسانے والی باتیں نہیں ہیں......''

''اوہ!...... میرے خدا...... پھر وہی بات، وہی جھگڑا......'' اس کے ذہن میں کوفت بھر گئی......

''خیر چھوڑ داس جھگڑے کو......'' انہوں نے کھٹ سے پاندان بند کیا...... اور وہ حیران رہ گئی۔

''دلہن! تمہارے ماموں کا لڑکا بھی تو تمہاری ماں نے گود لیا تھا؟''

''جی دراصل ہماری ممانی کا انتقال ہو گیا تھا ماموں جان نے دوسری شادی کر لی تھی...... اس لئے امی انہیں لے آتی تھیں۔

''وہ تو امریکہ میں ڈاکٹر لگا ہوا ہے......؟''

''جی ہاں......!''

''بڑی بھی تمہاری ماں نے غیروں میں دی...... وہ تو تم سب سے بڑا ہے...... کسی کی بھی ہو سکتی تھی اس کے ساتھ شادی گھر کی دولت گھر میں رہتی......'' آپا بی جانے کس شبے کا ازالہ چاہتی تھیں......

ایسی بے موقع و بے سری بات پر اس کا دماغ چٹخنے لگا۔

''جی مجھے تو کچھ علم نہیں...... ہم سب لوگ تو بہن بھائیوں کی طرح سے ہی رہے ہیں......'' وہ بولی جواب تو بہر حال دینا تھا۔

''اے ہاں...... خیر ابھی تو تم سے چھوٹی دو ہیں...... اور کیا معلوم کسی میم سے کر بھی لی ہو......''

''ہو سکتا ہے......!''

رہ جان چھڑانے کے انداز میں بولی اور دل ہی دل میں سخت متعجب تھی...... آخر اس قدر تفصیل کس سلسلے میں......؟ شاید وہ اپنی متجسس طبیعت سے مجبور تھیں......

پھر وہ کھانا کھا کر چلے آئے......

☆☆☆

ابھی مکان کا سلسلہ جاری تھا کہ عمر کے مشرق وسطیٰ جانے کے آرڈر آ گئے......

اور وہ بہت مسرور سے جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے...... وہ ایک پرائیویٹ فرم میں جنرل منیجر کے عہدے پر فائز تھے...... اسی عہدے پر انہیں مشرق وسطیٰ برانچ بھیجا جا رہا تھا......

آپا جی نے فرمائشیں بھی کر ڈالیں کہ کوئی اچھی چیز دیکھو تو ساجدہ کے جہیز کی نیت سے لے لیا کرنا اور کسی آتے جاتے کے ساتھ کر دینا تمہارے دوہا بھائی کو تو کچھ فکر ہی نہیں سارا بار مجھ پر ہے۔

☆☆☆

عمر نے جانے کے فوراً بعد خط لکھا...... کہ وہ جو رقم بھجوائے وہ اس میں سے پس انداز کرنے کی کوشش کرے...... تمہارے مکان کی رقام کے علاوہ میں اپنی رقم ملا کر اپنی پسند کا مکان بنانا چاہتا ہوں...... اس نے ہمیشہ کی طرح سر تسلیم خم کر دیا......

ایک روز آپا جی نے جب رقم کے سلسلے میں کرید تو وہ بولی۔

''آپا بی! میں رقم جمع کر رہی ہوں۔ کیوں کہ اب بنا بنایا گھر نہیں لیں گے بلکہ پسند کے مطابق بنوائیں گے۔''

عمر جو پیسہ بھیجتے وہ کرایہ ادا کرنے کے بعد ہزار روپیہ بھائی صاحب کو دے دیتی اور باقی اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتی اس نے محسوس کیا کہ یہ طرز عمل کسی کو بھی پسند نہیں......

ایک روز آپا بی نے سنانے کو کہا۔

''میری بچیوں کا عمر نے ہی کرنا ہے...... دلہن......! خرچ سنبھال کر کیا کرو......''

وہ خاموش ہو رہی...... کہ وہ تو سب کچھ عمر کے کہنے کے مطابق کر رہی تھی......

اس کے منہ سے نکل گیا۔

''پہلے تو ہم لوگوں نے گھر بنایا ہے...... آخر عمر اتنی محنت اپنے آرام کے لئے ہی کر رہے ہیں۔''

آپا بی بھڑک ہی تو گئیں۔

''ہاں بی بی، وہ محنت کر رہا ہے تم عیش کر رہی ہو...... اب کس بات کا غرور ہے...... اب تو اللہ رکھے اسے تمہارے مکان کی بھی ضرورت نہیں......''

اور مسلسل اعصابی دباؤ سے پریشان ہو کر وہ کراچی چلی آئی......

ڈیڑھ ماہ بعد اس نے واپسی کا ارادہ کیا...... مگر امی نے اس کی حالت کے پیش نظر منع کر دیا کہ وہ فارغ ہو کر ہی جائے اور انہوں نے پشاور خط لکھ دیا۔ جس کے جواب میں آپا بی نے لکھا کہ یہ ان کے ہاں کے دستور کے خلاف ہے ان کے ہاں پہلی ولادت سسرال میں ہوتی ہے۔

تب رعنا آپا جو میکے آئی ہوئی تھیں۔ تنک کر بولیں۔

''خواہ کسی کی جان پر بنی ہو...... مگر رسم ورواج میں فرق نہ آ جائے۔''

آپا نے اس کی گرتی ہوئی حالت اور زرد زرد سی رنگ کو رحم آمیز نظروں سے دیکھا۔

''لکھ دیں امی، ابھی نہیں بھیج رہے ہم...... وہ سفر کے قابل نہیں......''

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا نند گھر والی ہیں......

مگر میکے میں سیاہ وسفید کی مالک بنی بیٹھی ہیں......

''توبہ اساس سے بھی بڑھ کر ہیں...... باپ تو بوڑھے ہیں آ جاتے ہوں کے زور میں یہ بھائی بھاوج کو کیا ہو گیا۔

امی کو آج غصہ آ گیا تھا۔

پھر بھی انہوں نے نہایت رسانیت سے لکھ دیا۔

''وہ خود کراچی آ جائیں...... اسی بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی سب

سے......!"

☆☆☆

اور عمر کے خط آنا اچانک بند ہو گئے وہ بے تحاشہ پریشان رہنے لگی تھی......اور انہیں پریشانیوں میں اس نے بیٹی کو جنم دیا آصف نے ماں کے کہنے پر بہنوئی کو ٹیلی گرام دیا اور پشاور میں اس کے سسر کے نام، گھر میں سب خوش تھے۔ سب ہی بچی کو اٹھائے اٹھائے پھرتے اور اسے تو صرف عمر کے خط کا انتظار تھا...... بہت زیادہ پوری شدتوں کے ساتھ......

بچی سات آٹھ روز کی تھی...... سب لوگ دوپہر کو آرام کی غرض سے کمروں میں تھے......وہ اسماء کو بچی کے پاس چھوڑ کر کچن میں پانی بوائل کرنے جا رہی تھی۔ دودھ کا وقت ہو رہا تھا...... کہ کال بیل بجنے پر کچن کے بجائے گیٹ کی سمت بڑھ گئی۔ سامنے پوسٹ مین تھا۔

رجسٹری وصول کی جو اسی کے نام تھی دمام سے آئی تھی بڑی بے تابی سے لفافہ پھاڑا......اندر سے کافی کاغذات برآمد ہوئے اس نے ایک الگ تہہ کیا ہوا پیپر پہلے کھولا جو خط تھا عمر کا اس کے نام...... اس کے ہاتھ لرزنے لگے مخاطب کرنے کا انداز ہی ایسا تھا......اور پھر وہ وہیں تیورا کر گر پڑی......

☆☆☆

ہوش میں آنے کے بعد وہ بری طرح تڑپ تڑپ کر روتی۔ ارد گرد سب آنکھیں اشک بار تھیں۔ کون اشک شوئی کرتا......!

امی خود کو سنبھال کر بڑھیں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا......!

"کیا بات ہو گئی تھی بیٹا......؟ ماں سے بھی باتیں چھپائی جاتی ہیں......؟"

"کچھ بھی تو نہیں امی...... کوئی بات بھی نہیں تھی......"

"تو بیٹا اتنے بڑے فیصلے اتنی آسانی سے تو نہیں ہوتے......؟"

"مجھے کیا معلوم......امی......!" وہ سسک پڑی "اور کیا لکھا ہے...... ہیما......"

گویا ان میں اتنی تاب نہ تھی کہ وہ خود پڑھتیں۔

"بس یہی لکھا ہے کہ تم نے اور تمہارے گھر والوں نے جو کچھ آپا بی کے نام لکھا وہ درحقیقت نا قابل برداشت ہے......شاید تمہیں اپنی جائیداد پر زیادہ ہی غرور ہے...... مگر یاد رکھو مرد کبھی عورت کی بالادستی کسی بھی طور، برداشت نہیں کرتا وہ بھی بیوی کی۔ دراصل تم میرے ساتھ زندگی گزارنا ہی نہیں چاہتیں۔ ورنہ ایک وفادار عورت کے لئے اس کا شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے......شاید یہ وجہ ہو کہ تم ایک نہایت خوشحال گھر سے اُٹھ کر ایسے گھر میں آ گئی تھیں جہاں ہر چیز میں ناپ تول ہوتا تھا...... مگر شادی سے پہلے بھی ہر بات تم لوگوں پر عیاں تھی۔ تم آپا بی سے ملنا نہیں چاہتیں...... بلکہ کسی بھی طرح ان لوگوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں......ثناء صاحبہ، تمہاری جائیداد تمہارا ڈیڑھ لاکھ کا گھر ہے میری جائیداد میرے بہن بھائی ہیں آپا بی جنہوں نے بہن سے بڑھ کر چاہا ماں سے زیادہ سکھ بانٹے......

میں کسی ایسی لڑکی کو بیوی نہیں بنا سکتا جو میرے گھر والوں سے نفرت کرے۔ تم نے الگ ہونا چاہا ہے۔ تو آج سے میری اور تمہاری راہیں الگ ہیں۔ تم آزاد ہو...... طلاق کے کاغذات مہر کے چیک سمیت اسی لفافے میں ہیں۔ بیٹا ہو تو پشاور سے کوئی آ کر لے جائے گا۔ بیٹی کی کسی کو بھی ضرورت نہیں ہے نہ مجھ میں خواہ مخواہ بوجھ اٹھانے کی ہمت ہے۔

"ہمارکی......اور امی ایک خط یہ ہے......"

ابھی ابھی ٹیلی گرام ملا ہے

تمہیں بیٹی مبارک ہو اچھی سزا ہے۔

تم جیسی مغرور لڑکی کے لئے...... مجھے تم سے شدید نفرت اس لئے ہوتی ہے کہ تم جو نظر آتی تھیں وہ نہ نکلیں اور میں دوہرے لوگوں سے کسی قسم کا ربط رکھنا پسند نہیں کرتا۔

عمر درانی

سب اتنی بڑی بات کی وجوہات تلاش کرتے رہے۔ مگر وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی...... یہ سب کچھ آپا بی کا کیا دھرا ہے۔ کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی انا کے بارے میں شدید حساس واقع ہوتے ہیں ذرا ذرا سی بات کو اپنی تذلیل جان کر بدلہ چکانے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ اور ایسے لوگ شدید احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔

اور ایسا سناٹا رہنے لگا تھا کہ پرندے بھی ہول کھائیں اور اسے تو بچی تک کا ہوش نہ تھا...... ہر وقت سسکتی رہتی لوگ...... دل جوئی کے بہانے زخم ہرے کر جاتے۔ ہر وقت سوچوں میں گم۔

''اُف......! عورت ہی عورت کو ایسے ناقابل برداشت دکھ دیتی ہے...... اور مرد ایسے کانوں کے کچے ہوتے ہیں۔ کاش! عمر تم کچھ پوچھ لیتے...... میں کیا کروں گی......؟ کیا کروں گی۔

آپا بی......! تین جوان بیٹوں کی ماں ہو کر بھی...... کسی کی آہوں...... بددعاؤں کا خیال نہ آیا...... خوف محسوس نہ ہوا......؟''

رعنا آپا...... آئیں تو ڈانٹ ڈپٹ کر کھلانے پلانے لگیں۔ سمجھانے لگیں۔

''ایسوں کے لئے کیا کڑھنا...... چلو اٹھا...... بچی کا خیال کرو...... جاؤ دودھ پلاؤ کب سے رو رہی ہے......؟''

تب وہ پھر سسک پڑی بہن کے شفیق سینے سے لگ کر۔

''آپا لوگ کیا کہیں گے......؟''

''کہنے والے بھی تمہاری آپا بی جیسے ہی ہوں گے...... کوئی ضرورت نہیں لوگوں کا خیال کرنے کی...... چلو اٹھو...... اسماء نے سوپ بنایا ہے...... وہ پیو......'' آپا کی طراری، دلجوئی اسے دوبارہ زندہ کر گئی...... کم سے کم بچی کو دیکھنے لگی......

☆☆☆

سب اس کی خاطر ہنسنے مسکرانے لگے۔

امی خط لکھ رہی تھیں اپنے بھتیجے کو...... وہ ان کے سامنے بیٹھی چوٹی آگے کئے بل ڈال رہی تھی۔ امی نے اس کے کھوئے کھوئے سے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

''حماد نے تمہیں خط لکھا تھا...... جواب لکھ کر میرے لفافے میں ہی ڈال دو...... آخر وہ اسی گھر کا فرد ہے۔''

انہوں نے چشمہ فولڈنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا...... دونوں ماں بیٹی لان میں ہی تھیں......

''انہوں نے تو ہمدردی کا خط لکھا تھا...... وہ ٹھیک ہیں۔ میں کیا لکھوں......؟''

''اللہ اسے ٹھیک ہی رکھے...... خط صرف ہمدردی کے لئے نہیں لکھے جاتے......''

''بس امی! آپ ہی لکھ دیں جو لکھتا ہے...... مجھ سے نہیں لکھے جاتے خط......!''

حماد اس وقت اس گھر میں داخل ہوئے تھے۔ جب صرف رعنا آپا ہی تھیں۔ وہ رعنا آپا سے سات سال اور حماد سے دس سال چھوٹی تھی۔ اس کے بعد سب میں ایک ایک سال کا فرق تھا اس سے چھوٹی ہما تھی ہما سے چھوٹا آصف اور پھر اسماء......

حماد بھائی تو عرصہ آٹھ سال سے نیویارک میں مقیم تھے۔ ڈاکٹریٹ کے فوراً بعد ہی وہ چلے گئے تھے۔ اسی زمانے میں آپا کی شادی ہوئی اور شادی کے ٹھیک دو ہفتوں بعد ماموں جان دوسری بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی رعنا ان کی بہو بنے وہ ویسے بھی اپنے بیٹے کی صحیح تعلیم و تربیت پر بہن کے شکر گزار تھے...... مگر حماد کی پڑھائی ادھوری تھی رعنا کا رشتہ بہت اچھا آ گیا تھا...... سوال کی شادی کر دی گئی۔

وہ اس وقت تیرہ سال کی تھی اور آٹھویں میں پڑھ رہی تھی۔ شروع سے کم گو تھی...... وہ ان بچوں میں سے تھی جو بہت دیر میں کھلتے ملتے ہیں۔ ایک دیوار سی وہ اپنے

اور مخاطب کے درمیان شروع سے حائل رہتی تھی۔ جب حماد اس گھر میں داخل ہوئے، تو چار برس کے تھے۔ اور ثناء کے امی ابو کو پھوپھو جانی اور پھوپھا جان کہا کرتے تھے۔ ثناء نے آنکھ کھولتے ہی گھر میں انہیں پایا مگر اس نے دیکھا کہ وہ اپیا کی طرح امی پاپا نہیں کہتے تھے۔ وہ اس سے بڑے بھی بہت تھے...... پاپا کے بعد ان سے بہت ڈرتی تھی حالانکہ وہ بھی بہت کم گو تھے...... آس پڑوس سے اپیا اور حماد بھائی کے ہم عمر، ان سے چھوٹے بھی گھر میں آجاتے مگر وہ ایک طرف خاموشی سے ہوم ورک کرتی رہتی یا گڑیوں کو سجاتی بناتی رہتی۔

حماد جب سے نیویارک گئے تھے صرف ایک مرتبہ...... پاکستان آئے تھے...... انہیں اس کے متعلق معلوم ہوا تو بہت افسوس ہوا تھا...... اف وہ معصوم سی حساس لڑکی جانے کیا حال ہوگا......؟ اتنی سی عمر میں تجربوں کی بھٹی میں تپ چکی ہے...... وہ حیران سے ہوتے تھے جب اس کی شادی کا سنا تھا آصف نے تصاویر بھیجی تھیں۔ انہیں تو وہ بچی یاد تھی جو انہیں کھانا کھانے کی غرض سے ماں کے کہنے پر بلانے آتی تھی تو...... جب تک وہ کتاب سے سر نہ اٹھاتے دور کھڑی پردہ مروڑتی رہتی مگر اندر نہ آتی اور جیسے ہی وہ اس کی جانب دیکھتے فوراً آنکھیں نیچی کر کے کہتی......

''ہماری امی کہہ رہی ہیں کھانا کھالیں۔''

اور ایک دم بھاگ جاتی...... وہ بے ساختہ مسکرا دیتے

تین سال قبل جب وہ پندرہ روز کے لئے گئے...... اتنے مصروف رہے کہ اسے تو صبح ناشتے کی میز پر سفید یونیفارم میں ملبوس عجلت میں ناشتہ کرتے دیکھتے...... سب ان کے آنے پر کس قدر خوش تھے مگر وہ اس طرح سنجیدہ...... ناشتے کی میز پر نہایت ادب سے سلام کر کے ناشتہ کرنے لگ جاتی اگر خود سے کوئی بات کر لی تو جواب مل گیا ورنہ......!

ہما جلدی سے ناشتے کر کے چیخنے لگ جاتی......

''بجو......! بجو......! جلدی...... ساڑھے آٹھ ہو گئے''

تب وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی اور جھلاتی ہوئی کہتی جاتی......

''آ تو رہی ہوں چیخو تو مت......''

اس گھر کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی...... کافی عرصے سے پاکستان جانے کے پروگرام بن رہے تھے بگڑ رہے تھے...... امی بھی برابر لکھ رہی تھیں کہ وہ اپنی رائے دیں وہ ان کی شادی کرنا چاہتی ہیں اور ساتھ ہی چار پانچ تصویریں بھی بھیج چکی تھیں۔ انہوں نے سوچا وہ پھوپھو کی پسند کی لڑکی سے شادی کر کے وہیں رہیں گے......

آخر گھر بھی تو بنانا ہے......

اور پھر ایک روز وہ اپنوں میں چلے آئے۔

اور سب یہ سن کر شاد ہو گئے کہ وہ اب یہیں رہیں گے انہیں کافی دیر ہو گئی تھی آتے ہوئے، مگر وہ نظر نہ آئی تھی۔

اور وہ واقعی اپنی محرومیوں کی داستان سناتی صورت کے ساتھ ان کی جگمگاتی محفل میں آنا نہیں چاہتی تھی۔

اسی لئے اپنے کمرے میں عرشیہ کو سینے سے لپٹائے لیٹی ہوئی تھی

اسی دم کمرے میں ہنگامہ برپا ہو گیا...... ''دیکھئے یہاں آرام کر رہی ہیں......''

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اور حماد بھائی کو سلام کیا...... سلام کا جواب دے کر بولے......

''کیوں بھئی یہ شام کے وقت کمرے میں کیوں......؟ سب کے ساتھ ہنسا بولا کرو......''

''وہ میں اسے سلا رہی تھی۔'' اس نے سال بھر کی عرشی کی طرف اشارہ کیا......!

''بھئی، بیٹی تو تمہاری بہت پیاری ہے......'' انہوں نے سوئی ہوئی عرشی کے رخسار چھوئے......

سب نے اس کے کمرے میں بیٹھ کر چائے پی...... وہ سوچتی رہی کہ بہن بھائی

کس قدر بے لوث ہوتے ہیں۔ اپنے کام بھلا کر سب اسے خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

"دیکھئے بھائی صاحب یہ ہر وقت کمرے میں رہتی ہیں۔" ہما نے شکایتاً کہا......

حماد نے اس کی جانب دیکھا......

دراز ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں سے ریشمی بال لٹوں کی صورت میں گردن اور پیشانی پر پڑے ہوئے تھے...... قرمزی شلوار سوٹ میں اس کی گندمی رنگت، اداسی کا رنگ لئے ہوئے تھی۔

"اس طرح زندگی نہیں گزرتی۔ چلو اٹھو۔ شاباش ہنسا کھیلا کرو۔ دیکھو تمہاری بیٹی کس قدر چھوٹی ہے۔ تم خوش رہو گی تو اس پر اچھا اثر پڑے گا......" ساری زندگی میں پہلی بار شاید انہوں نے خاص طور پر اس سے باتیں کی تھیں۔ گویا ثناء کی کھڑی کی ہوئی حدیں آج انہوں نے گرا دی تھیں......

"ارے بجو! مان لیجئے ڈاکٹر صاحب کی بات......" اسماء نے کہا تو سب ہنس دیئے اور تب عرشی کو اچھی ڈھانپ کر ان سب کے ساتھ باہر آ گئی......

سب ہنستے رہے تو وہ مسکرا دی......

شدید سردیاں جا چکی تھیں۔ رعنا آپا اپنے بچوں کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں...... اس وقت یعنی چار بجے سہ پہر امی کسی کام سے لان میں آئیں تو باری باری سب ہی وہاں پہنچ گئے...... امی نے چاروں بیٹوں کی طرف دیکھا......

"اسماء! جاؤ آصف کے کپڑے استری کر دو...... وہ کہہ کر گیا تھا...... اس کے سارے کپڑے استری کر کے رکھ دیا کرو"

"اور ہما......! فاطمہ برتن دھو رہی ہے سمٹ کر اس کے آگے ڈال آؤ ورنہ آدھے بغیر دھوئے ہی چھوڑ جائے گی۔"

اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ امی نے ان دونوں کو ٹالا ہے

"رعنا، اب تم ہی سمجھاؤ اسے، میں تو تھک گئی......

......کل پھر تمہاری سلطانہ خالہ آئی تھیں...... کہہ رہی تھیں زور ڈالو ثناء پر...... قسمت سے ایسا اچھا گھر ہے انکار کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔"

"پاگل ہے یہ تو...... جس شخص نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے فیصلے سے کسی بے گناہ لڑکی پر کیا گزرے گی...... جسے اپنی بچی تک کا خیال نہ آیا...... کبھی بیٹی کو دیکھنے کی تڑپ نہ ہوئی...... یہ اس کے پیچھے ہستی مٹائے دے رہی ہے"

"آپا...... میں تنہا نہیں ہوں میری بیٹی بھی ہے...... میں سروس کر لوں گی...... مجھے اب کسی مرد پر اعتبار نہیں ہے...... میں ایسے ہی ٹھیک ہوں...... خوش ہوں"

"وہ تو تمہاری شکل سے ظاہر ہے......" آپا جل کر بولیں

"دیکھ لیا رعنا...... ہر بات الٹی ہی لے جائے گی...... تم بوجھ ہو ہم پر......؟ ماں باپ کس کے سدا ساتھ رہے ہیں خدا کرے گا بہنیں اپنے گھر کی ہو جائیں گی...... کیا معلوم بھاوجیں کس مزاج کی ہوں"

"کل بچی جوان ہو گی...... اس کا ہی خیال کرو......"

"اور کیا......!" آپا نے ٹکڑا لگایا۔

"سارے مردوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہی ہو...... ہمارے پاپا مرد نہیں...... آصف اور حماد ہمارے بھائی نہیں؟ ہم تو ان سے ایسی توقع نہیں رکھتے اور خدا نہ کرے کہ وہ ہماری توقع کے خلاف نکلیں......"

"اور کیا...... عقل کے ناخن لو...... پانچوں انگلیاں بھی برابر ہوتی ہیں......؟" امی نے کہا......!

"اور حمید صاحب کو تمہاری خالہ عرصے سے جانتی ہیں۔ ان کی فطرت کی نیکی کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ چار بہنوں کو باپ بن کر پالا...... چاروں کی شادیاں کیں تب

کہیں جا کر اپنا سوچ رہے ہیں...... اور انہیں تمام حقیقت کا علم ہے......''

''میرا جواب وہی ہے جو پہلے تھا......'' نہ حمید صاحب سے نہ کسی اور سے۔ خدارا مجھے معاف کریں۔'' وہ بری طرح سسک پڑی۔

''اچھا...... اچھا...... رو مت......'' اپیا نے اسے گلے لگا لیا......

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں بیٹی عرشیہ کی فراک سی رہی تھی۔ تین چار فراکیں اس نے کاٹ کر رکھی ہوئی تھیں...... نیند نہ آئی تو لے کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت امی اندر آ گئیں۔

''ثناء...... تم جاگ رہی ہو...... اور یہ بھی نہیں سوئی'' انہوں نے عرشی کی طرف دیکھا جو گڑیا سینے پر رکھے لیٹی اس سے باتیں کر رہی تھی......

''جی امی...... اور جب تک میں نہیں لیٹوں گی، یہ کہاں سوئے گی......''

''اچھا آج حماد کو دیر ہو گئی ہے...... اسماء اور ہما سو گئی ہیں۔ تم کھانا گرم کر کے دے دینا......''

''بہتر......!''

☆☆☆

''انقل...... آپ اتا تھانا تھاتے ایں'' (انکل آپ اتنا کھانا کھاتے ہیں)

عرشی نے پہلی مرتبہ کسی کو تنہا کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تھا...... وہ ڈونگوں کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ جو اس کی امی نے میز پر لا کے رکھے تھے۔ وہ اور حماد بے ساختہ مسکرا دیئے۔

''بیٹا آپ نے کھانا کھا لیا......؟'' انہوں نے ڈھائی سالہ عرشی کو گود میں بٹھا لیا......!

''ہوں......!'' اس نے بے نیازی سے گردن ہلائی وہ کھانا کھا رہے تھے......

عرشی مسلسل باتیں کر رہی تھی۔

''عرشی انکل کو کھانا کھانے دو۔''

''مت ٹوکو بھئی۔''

''بہت بولتی ہے۔''

''بچے بولتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔''

کھانے کے بعد وہ اسے گود میں لینے لگی۔ مگر وہ حماد کے گلے سے لپٹ گئی۔

''رہنے دو۔''

''سونے نہیں دے گی...... تنگ کرے گی......''

''کوئی بات نہیں......!''

☆☆☆

وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی...... مگر نیند نہ آئی اس کا ذہن آج کی باتوں کی طرف چلا گیا۔

''اف...... امی'' آنکھیں دریا ہونے لگیں۔

شادی زندگی کا بہت بڑا انقلاب ہوتا ہے...... سوچوں کو نئے زاویے ملتے ہیں...... جذبات کی دنیا تجربوں کی بھٹی میں دہکتی ہے...... مرد کے لئے ہو نہ ہو عورت کے لئے بہت بڑی بات ہے...... شادی کھیل نہیں ہوتی۔ قدم قدم پر ذہنی و جذباتی انقلابوں سے سابقہ پڑتا ہے......

لڑکی جس روز دلہن بنتی ہے...... تو تصور بھی نہیں کرتی کہ وہ دوبارہ دلہن بنے گی...... ایسا ہولناک خیال بھولے سے بھی پاس نہیں پھٹکتا...... ایک ہی بات سوچتی ہے...... جس کی بن رہی ہے...... اسی کے لئے اس کا جنم ہوا تھا...... ہمیشہ اسی کی رہے گی...... یہ خوبصورت خواب زندگی کی سب سے بڑی حقیقت لگتا ہے۔

اور پھر وہ جن جذبوں کی لپیٹ میں تھی...... وہ تو اسے پاگل کئے دے رہے

تھے۔ سوچتی تھی شاید وہ اپنی بیٹی کو دیکھنے آجائے تب وہ اسے اپنی بے گناہی کا یقین ضرور دلائے گی۔ جانتی تھی کہ حاصل تو کچھ نہ ہوگا۔ مگر اس کے لئے یہ ہی بات بڑی ہوگی کہ وہ پچھاوے کی آگ میں جلے...... اسے احساس ہو وہ کیا کر گیا ہے...... اور کس قدر گر گیا ہے......

مگر...... آپا بی اسے کیوں آنے دیں گی...... وہ خود بھی کس منہ سے یہاں آئے گا......؟؟

نہیں...... امی......! دوسری بار بہار پر اعتبار کرنے کا حوصلہ نہیں رہا......

اس نے اشک دوپٹے میں جذب کئے۔ اس کو ایک دم خیال آیا...... عرشی کی وجہ سے وہ بہت ڈسٹرب ہو رہے ہوں گے...... ویسے ہی اتنا تھک کر آئے تھے......

وہ اٹھی۔

انگوٹھی سے دروازہ بجایا

''آجاؤ۔ کون ہے......؟'' اجازت اور سوال ساتھ ساتھ ہوئے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئی...... وہ لیٹے ہوئے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہی تھے ان کے پہلو میں عرشی ہاتھ پاؤں بے ترتیبی سے پھیلائے سو رہی تھی......

''اسے لینے آئی ہوں...... سوچا آپ پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''نہیں یہ تو بڑے آرام سے سوگئی تھی......!''

''رہنے دو جاگ نہ جائے......''

''نہیں...... بچوں کی اور بھی پرابلمز ہوتی ہیں......'' یہ کہہ کر اس نے احتیاط سے عرشی کو اٹھا لیا......

انہوں نے جاتے ہوئے دیکھا...... اور دوبارہ کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئے......

☆☆☆

گھر میں طرح طرح کے ہنگامے تھے...... اسماء اور ہما کو حماد سے بے اندازہ پیار تھا...... امی کو روز کوئی نہ کوئی لڑکی دکھانے لے جاتیں...... امی کی جان آفتوں میں پھنس گئی تھی...... کہ اس کیلئے بھی لوگ آجاتے تھے وہ حیران تھی...... کہ اس کے نزدیک تو مطلقہ عورت کو لوگ قابل اعتناء نہیں سمجھتے تھے...... اور قابل حقارت ہی سمجھتے تھے...... اور پھر مطلقہ عورت تو اپنی نظر میں آپ رسوا ہو جاتی ہے......

لوگ تھے کہ طلب گار تھے......

کوئی پہلی بیوی سے ناچاقی کے سبب عقد ثانی کا خواہش مند تھا......

کسی کی بیوی مرگئی تھی اسے بچوں کے لئے ماں چاہئے تھی۔ کسی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی اسے اولاد پیدا کرنے کی مشین چاہئے تھی......

اور جو کنوارے تھے......

حسن و جوانی کے طلب گار تھے......

کچھ دولت و جائداد کے پرستار تھے......

کسی کو ہمدردی تھی...... اس کے ساتھ...... اس کی بیٹی کے ساتھ......

گویا خلوص کار بھی تھے...... ریاکار بھی تھے۔

وہ بری طرح بوکھلا گئی...... باپ نے کہا تو چپ ہوگئی، ماں نے کہا تو رو پڑی بہن بولی تو جھلا گئی......

ایک طلبگار ایسا بڑھا کر مارے تحیر کی آنکھیں پٹ پٹ کرتی رہ گئیں...... کیسی نئی بات...... بالکل انوکھی پھر وہی دلائل...... وہی باتیں...... وہی نصیحتیں مگر نتیجہ وہی صفر...... قطعی بے اثر...... پھر طلب گار خود آگے بڑھا آیا...... اور اس کی کہی باتوں کا نچوڑ یہ تھا......

''زندگی کے طویل سفر میں منزلوں سے پہلے...... پڑاؤ بھی ڈالے جاتے ہیں...... جن کی صورت مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہو سکتی ہے...... پڑاؤ کے بعد تو سفر کی

اُمنگیں منزلوں کی لگن اور بڑھتی ہے...... کم ہمتی چھوڑو...... میرا ہاتھ تھامو...... منزل منتظر ہے''

اس نے بیٹی کو دیکھا جو طلب گار کی گود سے اس کی گود میں آنا پسند نہ کرتی تھی......اس نے دوسری بار بہار پر اعتبار کرنے کا رسک لے لیا...... مانگنے کے بھی انداز ہوتے ہیں، اس نے سر جھکا لیا......

☆☆☆

وہ آج پھر دوسری بار دلہن بنی...... صرف بہت قریبی عزیز تھے......شور مگر کم نہ تھا......

اس کی نظریں نادانستہ اُٹھ گئیں دور سیاہی مائل براؤن تھری پیس سوٹ میں حماد کھڑے تھے اب عرشی اسماء کے بجائے جوتوں سمیت حماد کی گود میں تھی......

اور وہ عرشیہ سے کہہ رہے تھے......

''انکل نہیں بیٹے! ابو......''

☆☆☆

عشق کو عشق سمجھ

''امی! چھوٹی ممانی آئی ہیں۔ اسماء نے دروازے سے جھانک کر اطلاع بہم پہنچائی۔

''ہائیں...... کیسے آ گئیں بھابی آج؟۔'' انہوں نے تعجب سے گویا خود سے خطاب کیا تھا۔

''اور تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ بے وقوف ہے یہ تو ایک دم۔'' ان کے تو جیسے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ چٹخنی گرائی تو واقعی سامنے بھاوج کھڑی تھیں۔

''السلام علیکم بھابی!'' ارے سجاد، حماد بھی آئے ہیں۔ ارے بڑی بھاگوان گھڑی ہے۔''

''آداب پھوپھو!۔ بڑے بچے نے شائستگی سے آداب کیا۔

''جیتے رہو۔'' وہ جلدی جلدی کرسیاں آگے کرنے لگی۔

''ارے بھئی عائشہ! اس پنکھے کی سپیڈ تو بڑھاؤ، ذرا ہوا محسوس نہیں ہو رہی۔''

''پرانا ہو گیا ہے بہت اس لیے اس کی ہوا بس اتنی ہی ہے، وہ شرمندگی سے

گویا ہوئیں۔"

"ارے...... تو تم نے کہا کیوں نہیں عباد سے کل لے آئے گا نوکر پنکھا، خود ہی لگا بھی جائے گا۔ دوسرے کمرے میں پنکھا ہے؟۔" انہوں نے رومال سے اپنا چہرہ پونچھا۔

"ارے نہیں بھابی......! ہمیں تو یہ پنکھا بھی بہت ہے آپ پنکھا مت بھجوایئے گا۔"

"تمہاری تو عادت ہے عائشہ ہر چیز کو نہ کرتی ہو، ارے دیال تمہارا اپنا بھائی ہے کوئی غیر تو نہیں۔"

"(جی...... اسی دیال بھائی کے ہوتے ہوئے بھی میرا چولہا ٹھنڈا رہتا ہے)

وہ خاموش رہیں۔ وہ چائے بنانے اٹھیں تو عذرا بولیں۔

"بھائی چائے وائے نہ بنانا ہم ذرا یہیں قریب ہی ایک سالگرہ پارٹی میں آئے تھے راستے میں تمہارا گھر پڑتا ہے سوچا خیر خیریت معلوم کرتی چلوں۔"

"بیٹی کہاں ہے تمہاری؟"

"اسماء...... بیٹے ادھر آؤ...... ممانی جان بلا رہی ہیں۔"

وہ اسے ان کے پاس بھیج کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

اسماء سہم کر دروازے میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔

گھسے ہوئے سرخ فراک اور پائجامے میں وہ شیشے کی گڑیا لگ رہی تھی حسن پرست ممانی نے گھائل ہو کر اسے چمکار کر اپنے پاس بلایا۔

"ادھر آؤ بیٹے!"

"وہ آہستہ روی سے ان کے پاس پہنچ گئی۔"

"امی! کتنی گندی ہے یہ لڑکی۔" حماد نے ناک سکوڑ کر گرد میں آئے ہوئے اسماء کے پاؤں دیکھے اسماء کا کلیجہ کانپ گیا۔

"بری بات، تین سال بڑے سجاد نے فہمائشی نظروں سے حماد کو دیکھا۔"

"ارے لڑکی! کیا تمہارے پاس جوتے نہیں ہیں؟"

"ہیں مگر وہ تو اسکول پہن کر جاتی ہوں۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اسے تو ننھا حماد شہزادوں جیسا لگ رہا تھا۔ لباس سے بھی، بول چال سے بھی۔"

"تو کیا گھر میں ننگے پاؤں رہتی ہو۔"

"حماد!۔" ماں نے نند کو آتے دیکھ کر گھورا۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناں، مگر تم نے پھر بھی اپنی ہی کی، یہ بچے تو ناشتے میں بھی چائے نہیں پیتے۔"

"نہیں امی! پھوپھو بنا کر لائی ہیں تو میں پی لوں گا۔"

سجاد نے آگے بڑھ کر کپ اٹھالیا۔

حماد اسی طرح تنا تنا بیٹھا رہا۔

"بھئی پرسوں عید ہے، اسماء کے کپڑے وغیرہ بنائے ہیں یا نہیں؟"

"ہیں اس کے کپڑے، آپ فکر نہ کریں۔"

"ارے حد کرتی ہو، ہم کیوں نہ کریں، بچی نہیں ہے ہماری۔"

انہوں نے پرس کھول کر سو سو کے تین نوٹ نکالے اور اسماء کو دینا چاہیے۔

"بھابی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں، میں کہہ رہی ہوں ناں ہیں اس کے پاس کپڑے۔"

اب اتنی اچھی چیز بھی نہیں تمہاری خودداری، میں خدانخواستہ بھیک تو نہیں دے رہی ہوں جو تم اس طرح میرے ہاتھ روک رہی ہو، ہٹو پیچھے۔ لو اسماء اپنی امی کے ساتھ جا کر اچھے کپڑے لے کر آنا اور پھر عید پر گھر آنا۔"

اسماء نے پیسے نہیں لئے، خوفزدہ سے انداز میں ماں کو دیکھا۔

وہ نظریں جھکا کر پیچھے ہٹ گئیں۔ عذرا نے پیسے اسماء کی مٹھی میں دبا دیئے اور
خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئیں۔

عائشہ نے میکے میں یتیمی کا وقت گزارا تھا۔ بھائیوں کو آگے بڑھنے، دولت
مند بننے کا جنون تھا، دونوں نے جلد ہی اپنا بوجھ اتار پھینکا تھا، یوں بھی دونوں بال بچوں
کی ذمہ داری میں الجھ چکے تھے شوہر کے ہوتے ہوئے بھی مہینوں نہیں جھانکتے تھے۔ تو
تین سال شادی شدہ رہ کر جلد ہی وہ بیوہ ہوگئیں تو کس برتے پر بھائیوں کی چوکھٹ پر
جا پڑتیں۔ جب کہ بھائیوں نے بہت کہا مگر انہوں نے یہ افلاس بھری خود مختاری نہ
چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ حساس اتنی ہوگئیں تھیں پہلے سے مقابل کے ذہن تک
جا پہنچیں۔ اس تنہائی سے ان کا سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ نزدیک سلائی کڑھائی کے مرکز میں
نگرانی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ اسی گزر پر بنا ہوا دو کمروں کا مکان ان کے
شوہر کی ساری تگ و دو کا صلہ تھا اس پر بھی وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی تھیں کہ سر
چھپانے کا آسرا تھا۔

وہ کبھی کبھار بھائیوں کے ہاں جاتی تو اسماء کو کبھی ساتھ لے کر نہ جاتیں۔ مبادا
وہ اپنے ماموؤں اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ سے مرعوب نہ ہوجائے۔ اور احساس کمتری کا
شکار نہ ہوجائے وہ بہت توجہ سے اسے تعلیم دلا رہی تھیں۔ اسے اعلیٰ اخلاقی تربیت دے
رہی تھیں۔ ہر وقت کی تنہائی نے اسے بے حد کم گو بنا دیا تھا۔ بے حد خوش طبیعت پائی تھی
اس نے۔

ان دنوں جب گزرتے ماہ وسال اسے درجہ دہم کی طالبہ بنا چکے تھے اور وہ
ماں کی بیساکھی بن رہی تھی ایک دن اچانک دروازہ بجا ماں موجود نہیں تھیں۔ لہٰذا اس
نے آنے والے کا نام پس در پوچھا۔

نام بتانے کے بجائے آنے والے نے تنتنا کر ارشاد کیا۔

''ارے بھائی دروازہ کھولیے۔'' پھر بڑبڑاہٹ سنائی دی ''اچھی مصیبت ہے''

اس نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایسا اجلا بانکا سجیلا نوجوان تھا کہ وہ
حیران ہوکر ایک دم پیچھے کو ہوگئی۔

''پھوپھو کہاں ہیں؟''

''وہ تو نہیں ہیں۔'' اب وہ از خود سمجھ گئی کہ وہ اس کا کوئی ماموں زاد ہے۔

ان سے کہہ دیجیے گا کہ امی سیونتھ ڈے میں ایڈمٹ ہیں۔ اور یاد فرما رہی
ہیں۔'' وہ ملاقات کا ٹائم بتا کر الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ ایسا جلال، اتنا کروفر دیکھ کر
اس کی تو ہمت ہی نہ ہوئی کہ کہہ دے اندر تشریف لائیں۔

تھوڑی دیر بعد عائشہ آ گئیں تو اس نے بتایا۔

''امی ایک صاحب آئے تھے آپ کو پھوپھو کہہ رہے تھے اور کہہ رہے تھے
امی سیونتھ ڈے میں ایڈمٹ ہیں۔ اتنے بجے آ کر ملاقات کرلیں۔ حالت بہت سیریس
ہے۔''

''اے ہے نام کیا بتایا تھا؟''

''نام نہیں بتایا تھا، میں نے تو پوچھا بھی تھا۔''

''پتا نہیں بڑی بھابی کے ہاں سے آیا تھا کہ چھوٹی بھابی کے ہاں سے، کیا عمر
ہوگی اس کی جو آیا تھا یہ کہنے؟''

''بس لڑکے سے تھے، مجھ سے بڑے ہوں گے۔''

''اچھا...... پھر تو چھوٹی بھابی کے ہاں سے آیا ہوگا۔ ارے خدا خیر کرے ابھی
بے چاری نے دیکھا ہی کیا ہے، خدا رحم کرے۔''

وہ اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''رات نو دس بجے تک آؤں گی، ساتھ والوں کو کہہ کر جا رہی ہوں دروازہ
اچھی طرح سے بند کرلینا۔'' وہ تو بوکھلاہٹ میں تیزی سے باہر نکل گئیں۔

''توبہ امی! شکوہ کناں بھی رہتی ہیں اور محبت کا یہ عالم ہے کہ کھانے پینے تک

کا ہوش نہیں رہا۔'' وہ دھلے ہوئے کپڑے رسی سے اتارنے لگی۔

رات کے لیے اس نے روٹی بھی ڈال لی مگر عائشہ نہ آئیں اب تو وہ ایک دم ہراساں نظر آنے لگی۔

''یا اللہ! کیسے معلوم کروں امی کیوں نہیں آئیں اب تک کہاں رہ گئیں خدایا! پتا نہیں انہیں بس ملنے میں وقت نہ ہوئی ہو، ہونہہ، اتنی لمبی لمبی گاڑیاں ہیں کیا انہیں کوئی پہنچا بھی نہیں سکتا۔'' وہ کبھی اٹھ کر صحن میں پھرنے لگتی۔ کبھی کھڑکی سے باہر جھانکتی، بی پڑوسن نے بھی کئی بار دیوار سے سر ابھار کر پوچھ ڈالا۔

''اے اسماء! آگئیں تمہاری امی؟''

''نہیں خالہ جان!'' وہ رونے کو ہوگئیں ''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے انہیں کوئی سواری نہیں ملی۔''

''ارے اللہ رکھے ان کے بھائیوں کی تو موٹریں ہیں چھوڑ جاتا کوئی بے چاری غریب عورت، ایک تو وہاں جان کھپا کر آئی، اس پر بلالے گئے۔ لو بھلا، ماں جایا بھی آج تو پرایا ہوگیا، اور کھانا کھالیا تم نے؟'' انہیں خون کی سفیدی کے تجزیے سے لمحاتی فراغت نصیب ہوئی تو کھانے کا پوچھا۔

''امی تو آجائیں، کھانا کیسے کھالوں۔'' اس کے آنسو بہہ نکلنے کو بے تاب تھے۔

''آرہے آتی ہوں گی، جی ہلکان نہ کرو، اے لو وہ واجد کے ابا برابر بانگ دے رہے ہیں کھانا دے دوں انہیں۔'' وہ اتر گئیں۔

اسماء دوبارہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

اسی دم سامنے سے گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں، اور گاڑی رک گئی۔

گاڑی دروازے کے سامنے رکی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ عائشہ آگئیں ہیں۔ وہ لپک کر دروازے پہ آئی دروازہ کھولا تو وہی سامنے شام والا نوجوان کھڑا تھا اس نے بے تابی

سے کار کی سمت دیکھا اس کے چاروں دروازے بند تھے۔

''مم...... میری امی کہاں ہیں؟'' اس نے تڑپ کر پوچھا۔

''میں آپ کو لینے آیا ہوں۔'' نہایت آہستہ جواب میں ایک دم الٹ جواب ملا۔

''امی......'' اس نے اپنے سوال کا جواب جاننا چاہا۔

''میری امی کی ڈیتھ ہوگئی ہے پھوپھو گھر پر ہی ہیں، مجھے پاپا نے کہا ہے کہ آپ کو لے آؤں آپ پریشان ہوں گی، حالانکہ ایک اچھی خاصی سمجھدار لڑکی کیا ایک رات تنہا نہیں رہ سکتی؟'' مگر پاپا اور پھوپھو...... جلدی کیجیے...... میرے پاس...... وقت نہیں ہے......''

اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا جیسے روتا ہو۔

اور وہ تو یہ سن کر دم بخود رہ گئی تھی کہ ممانی جان کا انتقال ہوگیا ہے وہ کمزور اعصاب کی لڑکی گھر بند کر کے پانچ منٹ کے اندر اندر گاڑی میں بیٹھ گئی، پڑوسن تک کو بتانے کی ضرورت نہ سمجھی، انہی کپڑوں میں آج وہ دوسری مرتبہ اپنے دولت مند ماموں کے گھر جارہی تھی پہلی مرتبہ سنا تھا کہ ماں کی گود میں گئی تھی۔

''ماں نے اپنے دولت مند بے نیاز بھائیوں کے گھر سے بیٹی کو اس لیے دور رکھا تھا کہ اس میں احساس کمتری پیدا نہ ہو وہ پڑھ لکھ کر کم از کم لیکچرار بن جائے مگر اس کے باوجود کہ اتنی احتیاط کی گئی تھی اس میں نام کا اعتماد نہیں تھا گھبرائی گھبرائی، بوکھلائی بوکھلائی، آخر ماں سے کوتاہی تو ہو ہی گئی تھی آس پاس کے متوسط رشتہ داروں کے اتنے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر جب ماں کے منہ بے ساختہ نکل جاتا کہ اس کے ماموں ان سے دس گناہ زیادہ مالدار ہیں تو وہ ان کی آرائش و آسائش کا تصور باآسانی کر سکتی تھی۔''

اتنا اعتماد بھی نہیں تھا کہ اس سے تعزیتی کلمہ کہہ دیتی کہ مجھے دکھ ہوا ہے یا ممانی

جان کو کیا ہو گیا تھا۔ سر جھکائے ہاتھ مسلتی رہی۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔

اس کے سامنے ایک عظیم الشان عمارت تھی جس میں داخل ہوتے وقت اس کی ٹانگیں کانپ کانپ گئیں اندر بے پناہ رش تھا۔ دو لڑکیاں پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہی تھیں، معلوم ہوا کہ ان کی بیاہتا صاجزادیاں ہیں جن کی نخوت اور غرور کے قصے اس نے بے پناہ سنے تھے۔ گھر کا ہر فرد غم سے نڈھال تھا۔ سفید سفید چاندنیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ تک آبدیدہ ہو رہے تھے ماموں جان کے علاوہ ایک وہ اسے مضبوط اعصاب کا نظر آیا۔ جو چہرہ بے تاثر کیے ادھر ادھر جا رہا تھا، تمام راستے جو ہونٹ بھینچے گاڑی چلاتا رہا تھا تب اس نے حیرانی سے سوچا تھا کہ کیا اسے اپنی ماں کا دکھ نہیں خدانخواستہ اگر اس کی امی کو کچھ ہو جائے وہ تو دوسرا سانس بھی نہ لے پھر۔

کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں ہوا تھا، ویسے بھی افراتفری مچی ہوئی تھی، اس نے امی کو دیکھا جو میت کے سرہانے بیٹھے قرآن پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی وضو کر کے وہاں ماں کے پاس ہی سپارہ لے کر بیٹھ گئی، امی نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی بس چشمے سے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر دوبارہ پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔

''آنٹی! انکل کہہ رہے ہیں جنازہ صبح ہی اٹھے گا، سجاد نے جوابی ٹیلکس بھجوایا ہے وہ صبح پہنچ رہے ہیں۔'' اسماء نے آواز کی سمت نظر اٹھائی۔

کوئی خاتون ایک بڑی بی سے مخاطب تھیں، تب اسے بھی معلوم ہو گیا کہ سجاد بھائی باہر ہیں۔

تمام رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ نزدیک سے آئے ہوئے لوگ واپس چلے گئے تھے کہ صبح جنازے پر آئیں گے۔

ممانی جان کے میکے والوں کی تعداد کثیر تھی ماموں جان کے رشتہ داروں میں تو ایک بڑے ماموں کا گھر تھا یا دونوں ماں بیٹی تھیں۔

کتنی ہی افراتفری سہی مگر کوئی جھوٹ سے بھی اس کی سمت متوجہ نہیں ہوا تھا، اس کا دل اپنی بے پناہ حساسیت کی وجہ نہایت اجنبیت محسوس کر رہا تھا، وہ سمجھ گئی کہ آخر اس کی ماں اسے یہاں لانا کیوں پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا وہ آئندہ ان برف کی سلوں کی مانند ڈھلے ہوئے فرعونوں کے ہاں نہیں آئے گی، موت کا گھر سہی کیا یہ خواتین آپس میں اتنی دیر سے غیر متعلق باتیں نہیں کر رہی تھیں؟ کس کی بیوی، کسی کی طلاق، کسی کی شادی اور منگنی پر تبصرے نہیں کر رہی تھیں......؟''

جنازہ اٹھتے اٹھتے دوپہر کے بارہ بج گئے تھے۔ سجاد اپنی غیر ملکی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ آٹھ بجے صبح کراچی پہنچ گئے تھے۔

جنازہ اٹھتے ہی اس نے ماں سے گھر چلنے کو کہا۔

''صبر کرو...... چلتے ہیں، کیا سوچیں گے سب لوگ؟ موت کا گھر ہے......؟''

انہوں نے دبی دبی زبان میں گویا اسے جھاڑا۔

اف اتنی بے نیازی...... اتنی اجنبیت کے باوجود امی کا جی نہیں چاہ رہا گھر جانے کو؟ وہ ایک دم گھٹ کر رہ گئی تھی۔

دوپہر کو کسی نے کھانا بھجوایا تھا مگر اس نے ایک نوالہ تک زہر مار نہ کیا تھا۔

امی سے معلوم ہوا تھا کہ ممانی جان کو ''لیکومیا'' ہو گیا تھا تشخیص میں دیر ہو جانے کی وجہ سے ان کی جان نہ بچائی جا سکی۔ گھر والوں کو گزشتہ دو ماہ سے معلوم تھا انہیں باہر بھیجنے کے انتظام کرتے کرتے یہ دن آن پہنچا تھا کہ وہ دنیا سے باہر ہو گئیں۔

اتنی ہنستی بولتی ممانی کے بارے میں اسے جان کر بہت دکھ ہوا۔

جب امی دوبارہ قرآن خوانی میں مصروف ہو گئے تو وہ باہر لان کی سیڑھیوں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی، اسے غصہ کرنا نہیں آتا تھا بس رونا آتا تھا۔

وہ سامنے کھڑا غالباً کسی کو خدا حافظ کہہ رہا تھا وہ جانے کیا سوچ کر آگے لپک کر چلی آئی۔

”حماد بھائی! آپ مجھے گھر چھوڑ آئیں۔“ اس نے سادگی سے جانے کیسے کہہ دیا۔

حماد نے اس پندرہ سالہ دوشیزہ کو یوں تعجب سے دیکھا جیسے خدا معلوم کیا انہونی ہوگئی ہو۔

”تکلیف کیا ہے آپ کو......؟ کیا یہ گھر نہیں ہے؟“

”میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”آپ کے خیال میں، میں اس قدر فارغ ہوں کہ آپ کو لاتا، پہنچاتا رہوں، رات پاپا نے کہہ دیا تو چلا گیا ورنہ آپ کے بنا یہاں کون سے کام رکے پڑے تھے۔“ اس کے لہجے میں سنگینی اور نخوت تھی۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا گویا خود ہاتھی ہو اور وہ چیونٹی ہو۔

اس نے غلط اندازہ کیا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی، اس کی زبان کا کوڑا اس کے کانپتے دل پر پڑا تھا...... دوسروں کے سامنے تو خود کو خوددار اور مصفی بنا کر پیش کرنا پھر بھی آسان ہوتا ہے اپنی نظر میں تمام تر حقائق کی موجودگی میں معتبر کرنا کتنا کٹھن عمل ہے وہ اپنی نظر میں کم تر ہوگئی تھی اسے وہاں کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑ پڑے۔ وہ وہیں زینے پر بیٹھ گئی۔

بعض اوقات کم مایا آدمی ”مایا“ کا نہیں ایک دوست، ایک شناسا کا بھکاری بن جاتا ہے۔ غریب آدمی کو امیر کی مہربانی کا رویہ بھی نہیں بھولتا۔

کتنا بڑا آدمی ہے مگر کس طرح سینے سے لگایا تھا۔ غرور تو نام کو نہیں۔

غریب آدمی کو امیر آدمی کے ہاتھوں اپنی تحقیر بھی نہیں بھولتی۔

آنکھیں تذلیل پر روئیں نہ روئیں خوددار دل لہو روتا ہے۔

اسے تو یہاں ایک بھی دوست ایک بھی شناسا نظر نہیں دکھائی دی تھی۔ اس کی ذہنی اذیت مرحومہ کے متعلقین سے بھی سوا تھی۔ کہ وہ تو اس حادثے کے لیے دو ماہ بیشتر

سے تیار ہوں گی اس پر تو ناگہانی ٹوٹ پڑی تھی۔

گیٹ سے برآمدے تک کتنے لوگ آ جا رہے تھے مگر کسی نے اس کی سمت نہیں دیکھا تھا، اب اس کے ماتھے پر تو نہیں لکھا تھا وہ غریب اور یتیم ہے مگر چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق اسے یہی احساس کھائے جا رہا تھا کہ غربت کی وجہ سی نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔

بعض اوقات بے پناہ حساسیت بھی انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔

اسی دم امی اسے ڈھونڈتی ہوئی باہر آ گئیں۔ اور اسے سمجھانے لگیں۔

”بیٹے! سوئم تک میں کیسے چلی جاؤں سب کیا کہیں گے سب کو معلوم ہے کہ عذرا بھابی کی اکلوتی نند ہوں لوگ کہیں گے کہ ایک دن بھی گھر نہیں سنبھال سکی۔ جان چھڑا کر چلی گئی پھر بھائی میاں نے بہت کہا ہے کہ میں یہیں ٹھہروں۔“

اس کا جی چاہا کہ ماں سے پوچھے کہ اس سے پہلے کتنی بار آپ کو روکا ہے؟ مفت کی منتظمہ ہاتھ آ گئی ہے ناں۔

مگر ماں کے سامنے وہ پھر عادتاً چپ ہو کر رہ گئی تھی۔

”اور تم یہاں سیڑھیوں پر کیوں بیٹھی ہو؟، چلو اندر آؤ۔“

”کیا کروں گی اندر جا کر؟“ اس کے لہجے میں ہلکی سی خودسری چھلک آئی۔

خواہ مخواہ کی مار پر تو گدھا بھی بدک جاتا ہے اور وہ تو پھر انسان تھی۔ خودداری پر چار چوٹ کھا کر اب اسے مزید کی تمنا نہیں تھی، وہ دوبارہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

سامنے کھڑے سجاد بھائی نے غالباً پھوپھو کو اس سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ اور اسے پہچان لیا تھا۔ بڑی بی تو ایک دم سے ہوگئی تھی۔ چار فٹ سے ایک دم ساڑھے پانچ فٹ پر آ کر ٹھہری تھی۔ دوبارہ زینے پر بیٹھ کر اپنی چوٹی آگے کر کے کھول کر دوبارہ بل ڈالنے میں مگن ہوگئی تھی۔

”بھئی، تم اسماء ہی ہو نا؟“

اس دودھ کی جلی نے کوفت بھری نظریں اٹھا کر اپنے مقابل دیکھا۔ مگر سجاد کی مشفق مسکراہٹ سامنے دیکھ کر آہستگی سے بولی ''جی......؟''

''تو بھئی، یہاں کیوں بیٹھی ہو؟''

''ایسے ہی......'' اس نے نظریں جھکا کر اپنے مخصوص دھیمے انداز میں جواب دیا۔

''ارے بھئی اندر چل کر بیٹھو۔'' تب وہ ناچار اندر آ گئی۔

''اچھی مصیبت ہے، اس گھر میں کوئی اپنی مرضی سے بیٹھ بھی نہیں سکتا۔''

جرات کلام تو تھی نہیں جی ہی جی میں جل کر رہ گئی۔

اسے تو یہاں اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا نوکروں کی طرح اس نے آگے بڑھ بڑھ کر کام کیا تھا ہر چند اس نے سوچا تھا وہ محض ایک کونے میں بیٹھ رہے گی۔ مگر سامنے جیسے ہی کوئی کام ہوتا وہ خود بخود آگے بڑھ آتی تھی۔ اس کی اس بھاگ دوڑ سے گھر میں کوئی متاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں جیسے یہ اسی کا کام اور مقام تھا۔

اپنی فیشن ایبل ماموں زاد بہنوں کو اس نے قرآن خوانی سے بھی غائب پایا تھا۔ سوائے ماموں جبار کی سب سے چھوٹی لڑکی ربیعہ کے جو اس سے بڑی اپنائیت سے پیش آئی تھی۔

سر شام اکتاہٹ کی انتہا ہوگئی، وہ ماں کے سامنے رو پڑی کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔

جب عائشہ نے بھائی سے کہا کہ وہ اسماء کو لے کر گھر جا رہی ہیں۔ تو انہوں نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ بہن کی اہمیت محسوس کی تھی۔ شتر بے مہار بے سمت بیٹیاں جنہوں نے اپنے بر خود ڈھونڈ کر انہیں بہت جلد الوداع کہہ دیا تھا۔ من مانی کرنے والی بیوی بہرحال حقیقی و مساز بھی تھیں۔ بہن نے جانے کو کہا تو وہ بولے۔

''عائشہ! تم بھی چلی جاؤ گی تو یہ سب کون سنبھالے گا؟''

بہن اس حقیقت سے ناواقف تھیں کہ مرحومہ نے شوہر کے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا تھا کہ عائشہ بے حد خوددار ہیں وہ مر کر ہی شوہر کی چوکھٹ چھوڑیں گی۔ البتہ وہ بچی کو اخراجات کے لیے مناسب رقم دے دیتی ہیں۔

اپنی بیویوں پر اندھا اعتماد کرنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے بہن کو بھائی اپنے بازوؤں میں تھام کر اپنے گھر خود لے کر آتا، اسے اپنے گھر میں معتبر مقام دیتا تو بہن سر آنکھوں پر بھائی کے گھر میں اپنائیت کے احساس سے چور ہو کر آتی، محض اس طرح کہنا کہ جیسے فرض ادا کر دیا جائے تو بات نہیں بنتی۔ بھاوج کے رسمی انداز سے وہ مستقبل میں ان کے گھر میں اپنے مقام کا اندازہ کر سکتی تھیں آگے چل کر انہیں اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ ان کا فیصلہ دانش مندانہ تھا۔ وہ مرحومہ کے خلاف بھائی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ وہ کون سے چیک ہیں جو میرے گھر بھیجے گئے ہیں۔''

اور اپنی بھاوج کو بھی دم مرگ اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا۔ تب ہی انہوں نے حماد سے کہہ کر انہیں بلوایا تھا ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس طرح معافی مانگی تھی کہ کئی لڑیاں آنسو کی آنکھوں سے ٹوٹ کر تکیے میں جذب ہوگئیں تھیں۔

اس نیک فطرت عورت کے اذیت ناک سال بھابی کے آنسوؤں میں گم ہوئے تھے۔ وہ تہہ دل سے اپنی بھاوج کو معاف کر چکی تھی۔ اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر۔

موت کے گھر میں انہیں فرصت ہی نہ مل سکی تھی کہ وہ اسماء سے یہ سب باتیں کرتیں بھائی نے پھر مجبور کر دیا کہ عائشہ یہ خودداری کا کون سا مقام ہے کہ اس گھر کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ وہ ہتھیار ڈال کر باہر آئیں تو وہ گھر چلنے کو بے تاب کھڑی تھی۔

مگر ماں کی چال کا انداز اور ہی تھا۔

''چلیں امی......؟''

''اسماء بیٹے......!''

جن لوگوں سے وہ ساری عمر شاکی رہی تھی۔ ان کی حمایت میں بیٹی، کچی کلی جیسی بیٹی کے سامنے بولنا بہت کٹھن مرحلہ تھا۔

''بھائی میاں، بہت روک رہے ہیں، وقت بھی ایسا ہے کہ میرا انکار بہت معیوب ہوگا۔''

''مجھے نہیں پتا امی! اگر ایک دو گھنٹے اور رک گئیں میرا تو دم گھٹ جائے گا۔''

''بری بات بیٹے! وقت کی نزاکت کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔''

''امی......!'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''اسماء...... کیا کسی نے کچھ کہہ دیا ہے؟''

''نہیں امی! میرا دم گھٹ رہا ہے ان مغرور لوگوں کے بیچ۔'' آخر اس نے حقیقت کہہ دی۔

''ایسے نہیں کہتے، ان بے چارے بچوں کے سر پر سے تو ماں کا سایہ اٹھ گیا ہے۔''

''امی......!'' اس کی آواز بھرا گئی، میں نہیں رہوں گی یہاں، آنسو سلسلہ وار رخساروں پر ڈھلک آئے۔

انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا، وہ سخت مجبور تھیں۔ شادی کا گھر ہوتا تو شاید وہ کبھی نہ رکتیں۔ اسماء بچی تھی، اسے ان کی مجبوری کا احساس نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی، وہ مزید کچھ بولیں گی تو وہ زیادہ رو پڑے گی۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ یہ وہ بیٹی ہے جس نے کبھی ضد نہیں کی تھی۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔

وہ ستون کی سمت منہ کر کے بچوں کی طرح آنسو بہانے لگی۔ اسے امی سے یہ اُمید نہیں تھی۔ وہ بہت چاہ رہی تھی کہ آنسو رک جائیں ساتھ ساتھ دوپٹے سے منہ پونچھے جاری تھی مگر آنکھیں تو گویا دریا بنی ہوئی تھیں۔ جس پر سیلاب کا زور ہو۔ معاً اسے

پیچھے سے قدموں کی آواز سنائی دی اس نے جلدی جلدی دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں، آنے والا سامنے آ گیا وہ گویا جیسے چوری کرتی پکڑی گئی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی سامنے دیکھا۔

سامنے حماد تھا جو اُلجھی اُلجھی نظروں سے اس کے آنسوؤں سے دھلے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ نہ آیا کہ وہ کس طرح بھاگے۔ اس نے لان کی سمت قدم بڑھا دیئے۔

''ارے بھائی، یہ رات کے وقت آپ ادھر کہاں جا رہی ہیں؟''

''میں ان کی کوئی بات مانوں گی نہ سنوں گی' وہ آگے بڑھتی چلی گئی، وہ پیچھے کھڑا اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کے وجود پر شک ہو۔

خدا معلوم اس نے وہاں ایک ہفتہ کس طرح گزارا تھا گھر واپس آئی، ایسا محسوس ہوا گویا دوبارہ زندگی ملی ہو، بڑے صبر وضبط کا مظاہرہ کیا تھا گھر آ کر ماں بیٹی نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بڑے خاموش سے سمجھوتے ہو گئے تھے اور ویسے بھی عائشہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کی اتنی معصوم اور فرمانبردار بیٹی ان پر بگڑنے کی جرأت کرے گی۔ وہ صرف رو سکتی تھی۔ اس کی خاموشی ان کا دل شمع کی طرح پگھلاتی تھی۔

رات کو جب وہ پیٹھ موڑے لیٹی نیند کا انتظار کر رہی تھی۔ عائشہ اس کے پلنگ کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''اسی......!''

''جی امی؟'' وہ اسی طرح چہرہ اندھیرے میں کیے بولی۔

''کیا سوچ رہی ہو میری جان؟''

''کچھ بھی نہیں امی! بس نیند آ رہی ہے۔''

''وہ سیدھی ہو کر ماں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے اس کے بال سنوارے جھک کر ماتھا چوما۔''

"تم شکایت کرتی تھیں ناں کہ میں تمہیں ماموں سے نہیں ملاتی۔ تو اب وجہ سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ بھائی میرے بہت اچھے ہیں مگر...... اور اب تم مصر تھیں کہ میں ایک دن بھی وہاں نہ ٹھہروں ابھی تمہاری سمجھ محدود ہے، عمر کے ساتھ ساتھ مقام اور توقعات بھی اپنی شکل بدلتے ہیں میری عمر میں آ کر بلکہ اب کہ چند سالوں میں خیر سے گھر بار والی ہو جاؤ گی تو میری مجبوریاں خود بخود سمجھ میں آ جائیں گی۔" اپنی ماں کے بارے میں کوئی غلط خیال نہ دل میں لانا۔

"امی!" اس نے اپنا سر ان کے گود میں رکھ دیا۔ "کیسی باتیں کرتیں ہیں آپ...... میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہی، میں تو یہ سوچ رہی ہوں، میرا رزلٹ آ جائے گا تو میں کون سے کالج میں ایڈمشن لوں......" اس نے گویا موضوع بدل دیا "کونسے کالج میں لوں امی؟"

"بھئی رزلٹ تو آ جانے دو، پرسنٹیج کے لحاظ سے کالج کا انتخاب کرنا ابھی سے اتنی فکر نہ کرو ویسے ہی مجھے تمہاری صحت کی طرف فکر رہتی ہے۔ لیجیے اتنی ہٹی کٹی تو ہوں" اس نے مسکرا کر لاپرواہی سے کہا تو عائشہ نے ایک دم ٹوکا۔

"ارے ایسے ایک دم منہ بھر نہ کہا کرو" انہوں نے اس کے گداز جسم سے نظریں چرائیں جس میں نئے وقت کے پھول کھل رہے تھے۔

"ارے اتنی سی روح اسی جگہ لاتے لاتے میری جان سولی پر لٹکی رہی، خدا سلامت رکھے دشمنوں کی نظر سے بچائے خود ہی اپنی جان کو ٹوک نہ لگایا کرو، میرا تو دل دہل جاتا ہے۔"

وہ ماں کے وسوسوں پر کھلکھلا کر ہنس دی۔ تو ان کے آنگن میں روشنیاں برس پڑیں۔

ممانی جان کے چہلم تک عائشہ کا آنا جانا ذرا تواتر سے رہا۔ وہ پلٹ کر دوبارہ نہ گئی، چہلم پر انہوں نے اس پر کافی زور بھی دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

دن بڑی سرعت سے گزرنے لگے۔ اس نے مقامی کالج میں ایڈمشن لے لیا تھا کالج کسی وجہ سے بند تھے۔ وہ اپنی قمیض پر کڑھائی میں مگن ہوگئی، ہمسائی کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور خوبصورت کڑھائی کرتی۔ ان کی لڑکیوں کی وجہ سے اس کا جی بہل جاتا تھا۔

اس دن بھی وہ نہایت جوش وخروش سے کڑھائی میں مصروف تھی۔ سندھی گلا تقریباً مکمل تھا، جب ہمسائی کی بیٹی نے اس کے بھرپور سراپے اور حسین مکھڑے کو دیکھ کر کہا۔

"اسماء باجی! لگتا ہے آپ کو تو آپ کے دولت مند ماموں کے صاجزادے ہی لے جائیں گے۔"

"ہائیں...... وہ کیوں......؟" وہ اپنی دھن میں مگن بولی۔

"میرا مطلب ہے، باجے گاجے کے ہمراہ۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"ارے نہیں بھئی، بڑے غلط اندازے ہیں تمہارے جب بھائیوں نے میری امی کو اہمیت نہیں دی تو ان کی اولادیں۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر سوئی دانتوں تلے دبالی اور فریم کسنے لگی۔

"کبھی آپ نے خود کو غور سے دیکھا ہے؟" اس کی نگاہوں میں بے پناہ رشک تھا۔

"دیکھا ہے، انسانوں جیسی ہوں۔" اس نے سوئی میں پڑے دھاگے کی نظروں سے پیمائش کی اور تیزی سے ٹانکہ لیا۔

"انسانوں جیسی ہی تو نہیں ہیں پریوں جیسی ہیں۔"

اسماء کھلکھلا دی۔

"مجھے پتا ہے تم مجھے بہت چاہتی ہو، اس سے زیادہ بھی مبالغہ آرائی کرو تو حیرت کی بات نہیں۔" وہ بدستور ٹانکوں میں الجھ کر بولی۔

''دراصل تم نے انہیں دور سے دیکھا ہے، اور سنا ہے میرے کزنز اتنے مغرور ہیں کہ انہوں نے تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کی مجھ سے۔ بہت گھمنڈ ہے ان لوگوں کو اپنی دولت پر۔'' اس نے افسردگی سے بتایا۔

''تو اسماء باجی! آپ بھی تو برابر کی چوٹ ہیں، خدا نے آپ وسیرت اور صورت کی دولت سے نوازا ہے۔''

''ارے بھائی...... آج کے دور میں یہ خوبی تو ہوسکتی ہے دولت نہیں۔''

ہمسائی نے لڑکیوں کی بات سن کر درمیان میں ٹکڑا لگایا اور ہمسائی کو درمیان میں بولتے دیکھ کر دونوں نے موضوع ہی بدل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گھر آ گئی تھی۔ عائشہ بھی آنے والی تھیں۔ وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی، اب تو چھوٹے ماموں اکثر ان کا احوال معلوم کرنے ان کے گھر آ جاتے تھے۔ ان کے اس اقدام نے بڑے بھائی کو بھی شاید خواب غفلت سے جگا دیا۔ وہ بھی پہلے کی نسبت جلدی جلدی آ جاتے تھے۔ اکثر ربیعہ ان کی چھوٹی بیٹی ہمراہ ہوتی۔

باقی بچوں سے تو وہ ممانی کی موت پر مل چکی تھی۔ بڑے ماموں کے ایک صاجزادے اور دو صاجزادیاں شادی شدہ تھیں۔ ربیعہ اور اس سے بڑے صاجزادے ہارون ابھی ''فارغ'' ہی تھے۔ بچوں میں سے تو ربیعہ اور ہارون ہی ان کے گھر آئے تھے۔ ہارون بھی برسوں پہلے کسی بہن کی شادی کا کارڈ لے کر یا شاید مہندی ابٹن کا بلاوا لے کر آئے تھے۔ ربیعہ آپا کے پاس پلی بڑھی تھی۔ اس لیے ممانی جان اسے ساتھ نہیں رکھتی تھیں۔ مگر اب اس کی ربیعہ سے دوستی ہوگئی تھی۔

اس دن شام کو جب وہ حسب معمول ماں کا انتظار کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک پر نامانوس سی دستک ہوئی۔

دروازہ کھولنے سے بیشتر اس نے آنے والے کا نام پوچھا۔

''میں گارمنٹس فیکٹری کا ورکر ہوں۔''

یہ سنتے ہی اس نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔

ماں کے بجائے شفیق گارمنٹس فیکٹری کے ورکر کو سامنے دیکھ کر وہ حیران تھی۔

''فیکٹری گودام میں آگ لگ گئی، کئی ورکر اندر ہی جھلس گئے آپ کی والدہ عباسی شہید اسپتال کی ایمرجنسی میں ہیں۔'' وہ اتنا بتا کر پلٹ گیا۔

وہ تو جیسے اپنے حوش وحواس کھو بیٹھی بھاگ کر ساتھ والوں کے ہاں گئی، اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ساری بات کہہ سنائی، ہمسائی جھٹ برقعہ اٹھا کر اس کے ہمراہ ہولیں۔ راستے بھر وہ اسے تسلیاں دیتی رہیں حوصلہ بڑھاتی رہیں۔

وہ وہاں پہنچی تو بڑے ماموں کو وہاں دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس سے پہلے وہ کیسے پہنچ گئے۔ عائشہ کے پرس سے جو فون نمبر برآمد ہوئے تھے ان پر فوری اطلاع کردی گئی تھی جس کے نتیجے میں بڑے ماموں وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دلاسہ دیا۔

پانچ ورکرز کی حالت بہت نازک تھی۔ جن میں عائشہ بھی شامل تھی۔ وہ گودام میں موجود کام تقسیم کر رہی تھیں۔ گودام بھی بالکل اندر کال کوٹھڑی کی مانند تھا۔

کہا جا رہا تھا کہ فیکٹری کی گاڑیوں کے لیے ڈیزل پیٹرول کے اسپئیر ڈبے وہیں دیوار کے ساتھ ہی لگے ہوئے تھے، کوئی ڈبہ لڑھک گیا تھا رات کو کپڑوں کی گٹھڑیوں میں وہ رات بھر جذب ہوتا رہا کسی ورکر کی سگریٹ نے قیامت برپا کردی۔

وہ وہیں بینچ پر بیٹھ کر آیات و دعاؤں کا ورد کرتی رہی اور کانپتی رہی۔

سفید بالوں والے ایک ''وارڈ بوائے'' نے اس کا نام لے کر اندر بلایا تو وہ ساری جان سے لرزتی اندر پہنچی، سامنے ہی بڑے ماموں کھڑے تھے ان کے سامنے اس کی عزیز جان ماں، پٹیوں میں جکڑی پڑی تھی۔ ان کا ایک ہاتھ بڑے ماموں کے ہاتھ میں تھا، ماں کے ہاتھ کی لرزش وہ دور سے محسوس کرسکتی تھی۔

وہ ماں کے قریب چلی آئی۔ مگر ماں کی آنکھیں تو بند تھیں۔ بند آنکھوں کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ اس نے ہراساں ہو کر پکارا۔

''امی......!''

ماں نے آنکھیں کھول کر صرف ایک لمحے کے لیے بیٹی کی آنکھوں میں دیکھا۔ اتنی ویرانی اتنا سناٹا، آنکھوں میں تھا کہ اس کا دل بیٹھ گیا۔ ماں کی آنکھیں پھر بند تھیں۔ وہ دوبارہ آنکھیں کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ مگر ان کی آنکھوں میں بیٹی کا نظارہ آخری نظارہ تھا۔

بھائی کے ہاتھ میں محروم بہن کا ہاتھ برف تھا۔

بے ہوش اسماء کو وہ بڑی مشکل سے باہر لائے۔

بے ہوشی کا سلسلہ رک کر نہیں دے رہا تھا۔

پورے سولہ گھنٹوں بعد جب اسے ہوش آیا تو آس پاس کئی چہرے تھے جنہیں وہ بالکل بھی پہچان نہ پائی تھی، کہ یہ سب کون لوگ ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ بڑے ماموں، چھوٹے ماموں، بڑی ممانی، ربیعہ، ہارون، سجاد اور حماد وہ غالباً اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر حماد فوراً باہر چلا گیا تھا۔

چھوٹے ماموں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''گھبرایئے نہیں بیٹے، حالات پہ کس کا اختیار ہے خود کو مضبوط بناؤ بیٹے۔''

ان کی شفیق آواز نے گویا اس کے سارے بند توڑ ڈالے وہ تڑپ کر رو دی۔

ربیعہ نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔

''اسماء باجی! کیا ہم آپ کے نہیں ہیں؟''

''آپ اس طرح رو رو کر ہمیں بھی دکھی کر رہی ہیں۔'' حماد نے بھی اسے دلاسہ دیا۔

''میرے ساتھ چلو بیٹا...... وہیں رہنا...... ٹھیک......'' چھوٹے ماموں نے اس کے سر پر دوبارہ ہاتھ پھیرا۔

اس نے خالی اسٹول کو دیکھا جہاں حماد بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے منہ پونچھ کر آہستگی سے کہا۔

''چھوٹے ماموں! اگر میں تنہا رہنے کے قابل نہیں ہوں اور مجھے ضروری کسی کے ساتھ رہنا ہے تو میں بڑے ماموں کے پاس رہوں گی۔ ربیعہ کی وجہ سے...... آپ لوگ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

ربیعہ کو اس فیصلے سے خوشی ہوئی، وہ بڑی ممانی کے تاثرات نہ دیکھ سکی۔

چھوٹے ماموں اور سجاد نے اس کی خوشی سمجھ کر زور نہ دیا۔

ماں کی کمی نے اس کی شخصیت کو مزید چٹخا کر رکھ دیا۔

اس کی حالت پہلے سے زیادہ خوفزدہ ہرنی کی مانند ہو گی۔

وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی۔

بڑی ممانی نے ایک بار اس کے کپڑے بنانا چاہے تو اس نے منع کر دیا۔

''ممانی جان! میرے پاس کافی کپڑے ہیں۔''

وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کا روپیہ پیسہ خرچ کرائے کہ وہ لوگ اس سے بےزاری دکھانے لگیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کہیں سروس کر لے گی فیکٹری سے اسے کچھ پیسے ملے تھے۔ جو اس نے پس انداز کر لیے تھے۔ اپنی کتابوں، فیسوں کے لیے، وہ چاہتی تھی جب تک وہ ان کی دست نگر ہے انہیں بہت کم تکلیف دے۔ تاکہ ان کے دل تو کم از کم اس کے لیے ہر دم وار ہیں کہ یہی تو سب سے دور تھے۔ اور یہی سب سے زیادہ قریب۔

دکھ کا مداوا نہ ہوتا تو دکھ رہتے یا پھر دنیا۔

سر پر پڑی سب کو جھیلنی پڑتی ہے۔ دکھ مقدر میں رقم ہو جائے، ہر راستہ پھر اسی

سمت لے کر جاتا ہے وہ بہت سمجھ داری سے وقت کاٹ رہی تھی۔

بہت کم بات کرتی تھی کچھ زیادہ عادت بھی نہ تھی باتیں کرنے کی۔

ربیعہ سے بڑی بہنیں تو آج بھی اسی طرح فاصلے پر تھیں اور انہی کی زبانی یہ انکشاف ہوا تھا کہ دونوں ماموؤں کی والدہ الگ تھیں۔ اس کی والدہ کی مادر محترم الگ دونوں الگ دونوں ماموں کی والدہ کے ساتھ اس کے نانا کے ہمراہ چند برسوں کا تھا جب کہ دوسری شادی عائشہ کی امی سے ہوئی اور یہ رفاقت طویل عرصے پر محیط تھی۔ اس کی سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ سوتیلے پن نے رشتہ از خود پر تکلف کر دیا تھا۔ اسے ماں کا اپنے بھائیوں سے کم ملنا ان کی طرف مدد کے لیے نہ دیکھنا وہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ کتنی عظیم تھا اس کی ماں کہ کبھی بھائیوں کو سوتیلا نہ بتایا۔

ادھر یہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ سب باتوں سے واقف ہے بہر حال اب اس کا ذہن اس طرف سے سلجھ چکا تھا۔

سمیعہ اور ملیحہ کا رویہ تو بڑا لیا دیا سا تھا اس نے زیادہ پرواہ اس لیے بھی نہ کی کہ وہ دونوں اپنے اپنے گھر کی تھیں۔

ہارون کی عادتیں بھی کافی حد تک حماد سے ملتی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے لہجے میں رعونت کی بجائے سنجیدگی تھی۔ رہ گئی ممانی جان، نہ اس نے ان سے خوش فہمی پر مبنی توقعات وابستہ کی تھیں نہ اس کی طرف سے دل انجانے خدشات سے لرزتا تھا۔ وہ ان کے کسی اچھے سلوک کی امید نہیں رکھتی تھیں۔ حقیقت کو قبول کرنے کا وصف اسے ماں سے ملا تھا، زندگی اپنی مخصوص جارحانہ چال چلنے لگی۔ زخم مندمل تو نہیں ہوئے وہ روز دلاسوں کے انداز بدل بدل کر خود کو سمجھا لیا کرتی تھی۔ وہ زندگی زندوں کی طرح گزارنا چاہتی تھی اور خود پر بہت محنت کرتی تھی۔ دوسروں کو سکھانا بہت آسان ہے مگر خود کو پڑھانا سکھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اس روز گھر میں تنہا تھی، ربیعہ اور ممانی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔

ہارون اپنی قمیص ہاتھ میں لیے اندر آ گیا۔

''بھئی، یہ امی اور ربیعہ کہاں ہیں؟ سارے گھر میں ڈھونڈ لیا۔''

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

''ایک تو اس گھر میں کوئی چیز مکمل اور صحیح نہیں ہے، اب یہ میچنگ شرٹ...... ایک نہیں پورے دو بٹن غائب ہیں۔''

''لائیے میں لگا دیتی ہوں، ہارون بھائی......! آپ ایسا کیجیے کہ تمام شرٹس مجھے دے دیں میں سب کو دیکھ لوں گی۔ یعنی ادھڑی ہو یا بغیر بٹن کی، میں ٹھیک کر دوں گی۔'' اس نے سادہ انداز میں اپنی خدمات پیش کیں۔

''ارے نہیں بھئی...... تم کہاں الجھن میں پڑو گی، امی کر دیں گی...... فی الحال اس شرٹ میں بٹن لگا دو۔''

وہ گیلے ہاتھ گاؤن سمیت وہیں کوچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اٹھ کر سوئی دھاگہ تلاش کیا اور بیڈ پر بیٹھ کر لرزتے ہاتھوں سے بٹن ٹانکنے لگی۔ کسی کے سامنے تو اس سے پانی بھی نہیں پیا جاتا تھا۔ خود اعتمادی تو رتی برابر نہیں تھی۔

پرنٹڈ شلوار کرتے میں ملبوس، سیاہ دوپٹہ سر پر بلکہ پیشانی تک اچھی طرح سے جمائے ہوئے وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بٹن ٹانک رہی تھی۔ دھلا دھلایا گلابی لہر مارتا گندمی چہرہ اور رسیلے غیر معمولی تراش کے بھرے بھرے ہونٹ۔

ہارون کو پہلی بار اس کے غیر معمولی وجود کا احساس ہوا۔

''پڑھائی وڑھائی کیسی جا رہی ہے؟'' وہ اپنے گیلے بالوں پر مالش کے انداز میں انگلیاں چلاتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''ٹھیک جا رہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے ٹیوٹر وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟''

''نہیں...... میں نے کبھی ٹیوشن وغیرہ کا سہارا نہیں لیا۔'' اس نے سوئی دانتوں

تلے داب کر کہا۔

''یعنی مطلب یہ ہے کہ تم غیر معمولی ذہین ہو۔'' وہ ہلکے سے مسکرایا۔

''نہیں...... میرا مطلب یہ نہیں ہے، ذہین تو میں بالکل نہیں ہوں، بس خود ہی محنت کر لیتی ہوں۔'' اس نے دوسرا بٹن ٹانکنا شروع کیا۔

''مضامین کیا ہیں تمہارے؟''

''فزکس، کیمسٹری، اور میتھ۔''

''انجینئر بنو گی؟'' وہ متعجب ہوا۔

''اپنی ایسی قسمت کہاں، کچھ بننا ہوتا تو پری میڈیکل کا انتخاب کرتی اور بائیولاجی لیتی۔ میں سائنس سے گریجویشن کرنا چاہتی ہوں، اسی لیے کہ ملازمت ذرا اچھی اور آسان سی مل جاتی ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اچھا تو تم ملازمت کی نیت سے پڑھائی کر رہی ہو۔؟''

وہ خاموش رہی۔

''آخر تم ملازمت کیوں کرنا چاہتی ہو، ٹھیک ٹھاک تعلیم حاصل کرو پھر شادی کر کے گھر سنبھالو، اسی میں عورت کی بقاء اور تحفظ ہے اور میرا خیال ہے ملازمت تمہارے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔ تم گھر داری کرتے ہوئے زیادہ......''

اسی دم کوئی پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔

وہ جھک کر دانتوں سے بٹن لگا کر دھاگہ کاٹ رہی تھی۔

''اچھی مصیبت ہے یار...... ساڑھے چھ ہو رہے ہیں اور ابھی تک تم گاؤن میں ہو، حد ہو گئی یار۔''

اسماء نے چونک کر سر اٹھایا، وہ مخاطب ہارون سے تھا اور تفصیلی نظر اس پر تھی۔

اس نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ اخلاق نے سلام دے مارنے کا تقاضا کیا مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔

''یہ لیجیے ہارون بھائی۔''

''دونوں بٹن لگا دیئے؟''

''جی......؟''

''اچھا تو تم یہاں بیٹھے بٹن لگوا رہے تھے۔ ویسے گھر میں تو ان کی وجہ سے بہت آرام ہو گیا ہو گا، کام وام کے سلسلے میں۔''

''نہیں یار...... تمہارے خیال میں ہم اتنے برے ہیں کہ اپنی فرسٹ کزن کو اپنے گھر میں یہ مقام دیں گے......؟ فی الحال تو یہ امی اور ربیعہ کی قائم مقامی کر رہی تھیں۔ وہ بھی اپنی خوشی سے کیوں اسماء؟''

''جی ہارون بھائی! گھر کے کام گھر والے ہی کرتے ہیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور رخ موڑ کر سوئی دھاگا اٹھا کر بکس میں بند کرنے لگی۔

ہارون عجلت میں باہر آ گیا تھا۔

''آپ کے حساب سے تو نوکر بھی گھر والوں میں شامل ہوئے۔'' وہ طنزیہ مسکرایا۔

''جو کام میں کر رہی تھی وہ اتنا بڑا تو نہیں اور نہ ہی معیوب، چلیں آپ مجھے نوکر ہی سمجھ لیں۔'' وہ اس کے تلخ لہجے پر آزردہ ہو کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

وہ چند لمحے اس کی پشت کو دیکھتا رہا پھر اپنی مخصوص تیزی سے باہر نکل گیا۔

''پتا نہیں ان کو مجھ سے اتنی چڑ کیوں ہے؟'' اس نے آزردگی سے سوچا۔

وہ اور ربیعہ لان میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھیں کہ بلو کرولا اندر پورچ میں تیزی سے جا کر رکی ربیعہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''حماد بھائی آئے ہیں، اب تو کافی جلدی جلدی آنے لگے ہیں پہلے تو اہم تقریبات تک میں شامل نہیں ہوتے تھے۔''

آپ سے تو کوئی سلسلہ نہیں چل نکلا۔ آپ کو آئے دوسرا سال شروع ہے ان

دو سالوں میں حماد بھائی از خود اتنی مرتبہ آئے ہیں کہ گزشتہ بیس سالوں میں نہیں آئے ہوں گے۔''

''ایسی باتیں نہیں کرتے ربیعہ۔''

''کیوں نہیں کرتے؟ ہارون بھائی کے لیے تو امی اپنی ایک بھانجی منتخب کر چکی ہیں ورنہ میں تو ان کے لیے آپ کا انتخاب کرتی۔''

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ربیعہ؟'' اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

''آپ کو میری قسم اسماء باجی! سچ بتائیں آپ کو حماد بھائی کیسے لگتے ہیں؟ میری قسم۔''

''ارے تم یہ کیا قسمیں وسمیں درمیان لے آئیں، بھئی جیسے تم لوگ کزن ہو ویسے ہی حماد بھائی ہیں۔''

(میں اس قابل کہاں ہو سکتی ہوں)

''میرے لیے تو محض فرسٹ کزن ہیں۔ شادی اتنے مغرور آدمی سے؟ جس کی دولت اور غرور سے ہر وقت میرا اعصاب تنے رہے خوف سے۔ ایسے شخص سے شادی تو در کنار میں تو اس کی باراتی بننا بھی پسند نہ کروں۔''

ربیعہ نے قسم دی تھی سو اس نے سنجیدگی سے دل کی بات اسے بتا دی، ربیعہ اس کی بہترین دوست بھی تھی۔ وہ اس کی دولت مند کزن تھی جس کے آستانے پر وہ عرصے سے پڑی تھی۔ لیکن اس پیاری لڑکی نے اس کی ذات کا غرور چھینا تھا۔ کبھی اپنی حیثیت جتا کر اس سے اپنی بات نہیں منوائی تھی۔

''ربیعہ! مغرور آدمی سے لوگ اس لیے کتراتے ہیں کہ وہ ان کی ذات کا غرور چھینتا ہے۔ ذات کا غرور نعمت ہوتا ہے اگر معمولی مزدور بھی ذات کے غرور سے سرشار نہ ہو تو وہ ہمیشہ نہیں اٹھا سکتا مغرور لوگ دوسروں کو کمترین جتا کر ان سے کچھ کرنے کا عزم و حوصلہ چھین لیتے ہیں میں تمہارے ہاں آ گئی، تو پڑھ بھی رہی ہوں،

اگر چھوٹے ماموں کے پاس ہوتی تو دن میں کئی بار اس احساس کے بعد کہ میں کمتر ہوں، میرے حوصلے ٹوٹ جاتے۔ میرا ذہن اپنی ذات کی نفی کیے جانے پر الجھا رہتا۔ اور آگے بڑھنے کے بجائے پچھلا پڑھا بھی بھول جاتا۔'' آج اس نے ربیعہ کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا۔

''اسماء باجی! حماد بھائی ذرا ریزور قسم کے آدمی ہیں۔ مغرور نہیں ہیں...... آپ......؟''

چھوڑو ربیعہ! جو تم نے دیکھا نہیں سنا نہیں، اب اس پر تم سے کیا بحث کروں۔''

اس نے گویا بات ہی ختم کر دی۔ پھر اندر سے ربیعہ کا بلاوا بھی آ گیا۔

ایگزام کے بعد وہ فراغت سے مکرامے وغیرہ بنانے میں مصروف تھی اس کے بنائے ہوئے کئی مکرامے برآمدے میں لٹک رہے تھے۔ ان میں دھرے گملوں میں پھول بھی کھل چکے تھے۔

گھاس پر سارا سامان بکھیرے وہ بے حد مگن تھی۔

''سنو بھئی تمہیں ایمرجنسی میں پاپا نے بلوایا ہے ذرا جلدی کرو۔''

وہ بری طرح چونک پڑی، سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ جین کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔

''مم...... مجھے......؟''

''جی...... آپ کو...... ذرا جلدی کرو...... ویسے ہی مجھے بہت سے کام ہیں۔'' وہ خشونت بھرے لہجے میں بولا۔

اس نے جلدی جلدی سامان سمیٹا، اور اجازت لینے ممانی جان کے پاس چلی آئی۔

''جاؤ بھائی ضرور جاؤ حماد! بے بی کو تم خود چھوڑنے آؤ گے؟''

دیکھوں گا تائی اماں! اس نے بے زار سے لہجے میں جواب دیا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی تو اس کی گاڑی باہر تھی۔ وہ دروازہ کھولے بیٹھا تھا وہ جھجک کر بیٹھنے لگی۔

"جلدی سے بیٹھو......"

"ماموں جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی سمت دیکھا۔

اس نے گویا سنا ہی نہیں اور کار ایک لامتناہی سڑک پر ڈال دی۔

دور دور تک گھر کی سمت کا نام ونشان نہ تھا۔ اس نے سہم کر اس کی سمت دیکھا اس کی نگاہیں سامنے مرکوز تھیں ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

"اتنی دیر ہوگئی ہے، گھر ابھی تک نہیں آیا؟" اس کا لہجہ کانپ رہا تھا۔

گھر بھی آجائے گا، میں تمہیں اڑا کر تو نہیں لے جا رہا۔ بے فکر رہو۔"

وہ دبی دبی سی لڑکی ایسی کھلی بات پر ٹپٹا کر رہ گئی۔

"سنو یہ ہارون نے تم سے اظہار محبت کب کیا تھا؟۔ پہلی بار؟"

"ہائیں......!" اسے تو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"دیکھو بھائی! تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اس کھیل سے باز رہو، کیوں اپنا ٹھکانہ کھونے پر تلی ہوئی ہو" اس نے تیزی سے موڑ کاٹا۔

"تائی اماں کو اس کی ہوا بھی لگ گئی تو نکال باہر کریں گی، تمہیں معلوم نہیں کہ ہارون انگیج ہے؟"

اس پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

"حماد بھائی! دیکھیں مجھ سے اس قسم کی خراب باتیں نہ کریں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اگر ہارون یہی باتیں کرے تو اچھی ہیں؟ جی محترمہ؟"

"جتنے برے آپ ہیں اتنا تو شاید کوئی ہوگا بھی نہیں، پتا نہیں کیسی باتیں کر رہے ہیں ہارون بھائی آپ کی طرح نہیں ہیں۔ وہ بے چارے مجھ سے بات بھی نہیں کرتے۔"

"جب ہی تمہارے عشق میں مجنوں بنا ہوا ہے۔"

"آپ کی ذہنیت ہی گندی ہے وہ ایسے نہیں ہیں، مارے شرم کے اس کی آنکھیں برس پڑیں۔"

"جی میری ذہنیت ہی گندی ہے مگر آپ ذرا ہوش سے کام لیجیے، چند دنوں میں طوفان اٹھنے والا ہے اپنی خیر منائیں۔"

"حماد بھائی!" وہ مارے ڈر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"اچھا بھئی مان لیا کہ تم انوالو نہیں ہو اپنی عزت و جان بچانے کا آسان طریقہ ہے وہ یہ کہ تم سے اگر ہارون کے بارے میں پوچھا جائے تو صاف انکار کر دینا۔"

"ایک مرتبہ نہیں ہزار بار۔" اس نے دوپٹے سے ناک رگڑی۔

"جن لوگوں نے ہمیں اتنی نزدیکی قرابت داری ہوتے ہوئے جانوروں کا درجہ بھی نہ دیا میں ان کی سمت اس نیت سے دیکھنا بھی کفر سمجھتی ہوں، چاہے آپ ہوں یا ہارون بھائی۔" جانے کیسے اس کے منہ سے نکل گیا۔

"ہوں......" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب کر ہنکارا بھرا۔

وہ اسے گھر واپس چھوڑ گیا۔ اور وہ سمجھ گئی کہ وہ اسی غرض سے بہانہ بنا کر اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ اور پھر حماد بھائی کی بات سچ نکل آئی گھر میں ایک سرد پن جھلکنے لگا، ممانی جان کا رویہ اس سے کھنچا کھنچا سا تھا، اس نے اپنے کانوں سے سن لیا۔

ممانی جان ہارون اور بڑے ماموں کے سامنے تیز آواز میں بول رہی تھیں۔

"تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے ہارون جس کی نانی نے تمہارے باپ کو

سوتیلے پن کے کچوکے لگائے زمین و آسمان کے فرق رکھے۔ میں اسی کی نواسی کو بہو بنا
لاؤں۔ تمہیں معلوم ہے ہم نے کبھی ان کو اہمیت نہیں دی۔ اب اس کا کوئی نہیں تھا، تو خدا
ترسی میں اپنے گھر میں پناہ دی۔ اور تم مجھے ٹھیک بتاؤ کیا وہ بھی تمہارے ساتھ شامل
ہے؟ اس کا تو کروں گی میں دماغ ٹھیک۔"

"امی! حد کرتی ہیں! اس کو تو کچھ بھی معلوم نہیں میں تو اپنے طور۔"

"بس کرو بھئی...... دیکھیں جبار! یا تو لڑکے کو سمجھائیں، یا اس لڑکی کو اپنے
بھائی کے ہاں بھجوا دیں، وہ تو ویسے بھی اس کے اور اس کی ماں کے والہ و شیدا ہیں، سدا
کے۔"

"بھئی تم ذرا تسلی سے بھی کام لیا کرو۔ اس قدر بات بڑھانے کی کیا ضرورت
ہے تمہیں یہ منظور نہیں تو نہ سہی، تم اپنی بھانجی کو مانگ چکی ہو تو یہ ہارون کی غلطی ہے۔ یہ
باتیں ہنسی کھیل نہیں ہوتیں۔"

"پاپا......؟"

"ہارون! بات زبان کی ہے تم حماقت کر رہے ہو، تمہاری ممی ٹھیک کہہ رہی
ہیں۔" اور اس نے رات کو ربیعہ سے کہہ دیا۔

"ربیعہ! میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ ہارون بھائی میرے لیے بھائیوں کی
طرح ہیں بس یہی رشتہ ہے میرے ان کے درمیان۔ ان سے کہہ دو مجھے در بدر کی
ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ کریں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔"

ربیعہ نے اس کے ستے ستے چہرے کی سمت دیکھا۔ اس کے دراز قد اور
سڈول جسم کو دیکھا قد و قامت میں وہ بارعب دکھائی دیتی تھی مگر چہرہ بچوں کی طرح بھولا
و معصوم تھا۔ گول چہرے کے نقوش غیر معمولی تھے۔ بلاشبہ وہ اس کی خالہ زاد سے ہزار
گناہ پرکشش تھی۔ مگر وہ تو اس رشتے کے لیے خود انکاری تھی۔

ممانی کا رویہ پہلے جیسا ہو گیا تو وہ سمجھ گئی کہ ربیعہ نے اس کی بات پہنچا دی

ہے۔

اس نے سکون کا سانس بھرا، تنے ہوئے اعصاب پر سکون حالت میں
آ گئے۔

پھر ممانی جان نے بہت جلد شادی کی تاریخ لے لی۔ وہ کافی محتاط ہو گئی تھیں
گھر میں تیزی سے تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

اس نے خود آگے بڑھ کر تیاریوں میں حصہ لیا۔ حالانکہ اس کے بی ایس سی
فائنل شروع ہو گئے تھے۔ دلہن کے دوپٹوں اور قمیضوں پر خوبصورت کام بنائے۔

ہر رسم میں حصہ لیا۔ نمائندگی کے طور پر نہ سہی اپنے مخصوص خاموش اسٹائل
میں۔

اس روز دلہن والوں کی طرف سے مہندی آئی تھی۔

وہ ایک طرف کھڑی شرارتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ سبز بروکیڈ کے چست
پائجامے جالی کے کرتے اور بڑے سے دوپٹے میں وہ بڑی محویت کے عالم میں چھیڑ
خانی دیکھ رہی تھی۔

لب خود بخود دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

کیمرے، مووی الگ روشنیاں برسا رہے تھے۔

وہ سب میں نمایاں تھی، پھر اپنی دلکشی سے بے نیاز بھی تھی۔

کتنے کیمرے بار بار اس کی سمت متوجہ ہوئے تھے وہ بے خبر لڑکیوں کے "خبر
لینے والے" انداز کے گانوں پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ربیعہ نے کئی بار اس کا ہاتھ پکڑ کر
کھینچا۔

"اسماء باجی! آپ بھی گائیے نا ہمارے ساتھ۔"

مگر اس نے ہنس کر ہاتھ چھڑا لیا۔

"ارے بھئی یہ جو سبز کپڑوں میں مس یونیورس کھڑی ہیں، دوست، ان کا ذرا

مزیدار سا کلوز اپ تو محفوظ کرو ہمارے لیے۔"

"اچھے خاصے ڈیل ڈول کے مالک ایک صاحب نے کیمرہ اٹھائے ہوئے نوجوان کی پشت سہلائی۔

"اور انعام کیا دیجیے گا صاحب!" وہ فوکس سیٹ کرتے ہوئے ہنس دیا۔

"ان" کے علاوہ جو مانگو!" وہ بڑے عاشقانہ انداز میں گویا ہوا۔

پیچھے کھڑا حماد فلش میں سیل فٹ کر رہا تھا۔ مارے جذب کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کھٹاک سے سیل چیمبر بند کیا۔

"جاؤ بھئی تائی اماں کہہ رہی ہیں ذرا ملازمہ کا ہاتھ بٹاؤ کچن میں۔"

وہ گانوں میں بے حد مگن تھی۔ ایک دم چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوئی۔

سرمئی قمیص شلوار میں ملبوس حماد کا چہرہ اسے غیر معمولی سرخ محسوس ہوا۔

"میں......؟"

"جی......آپ......اب جا بھی چکیے......" وہ جھلایا۔

وہ دل مسوس کر محفل سے کچن سے چلی آئی، ملازمہ مہمانوں کے لیے سینڈوچ پلیٹوں میں سجا رہی تھی۔

"لاؤ بھئی......کیا باقی رہ گیا ہے؟"

"سب کچھ تیار ہو گیا ہے بی بی، بس سینڈوچ رہ گئے تھے۔"

"لو بھلا، ممانی جان نے تو مجھے تمہارا ہاتھ بٹانے کے لیے بھیجا ہے۔" اسے سخت کوفت ہوئی۔

"سب تیار ہے آپ جائیں بی بی، میں چھمو کے ساتھ مل کر میزوں پر لگا دیتی ہوں۔"

وہ سوچتی ہوئی باہر آ گئی۔

ایک تو یہاں کسی کی سمجھ نہیں آتی۔

ایک خیال اسے بجلی کی طرح کوندا کہ حماد نے اسے وہاں سے ٹالا ہے۔

"مگر کیوں؟" وہ یہ نہ جان سکی۔

چھوٹے ماموں جان ہارون اور دلہن کی دعوت کرنا چاہتے تھے ایک بیٹی دمام میں تھی۔ ایک شکاگو میں سجاد اپنی بیوی کو لے کر جا چکے تھے اپنے "ٹھیئے" پر لہٰذا گھر پر کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اس شام انہوں نے اسے بلوایا تھا کہ وہ آ کر ملازموں کے "سر پر" کھڑی ہو جائے۔

بڑے ماموں کو ان کا فون آ گیا تھا، وہ صبح آفس جاتے ہوئے اسے وہاں چھوڑ آئے تھے اور کہہ گئے تھے بعد دوپہر تمہاری ممانی بھی آ جائیں گی دعوت شام کی تھی۔

بڑی ممانی کیسی ہی سہی مگر وہاں اسے پھر بھی آزادی کا احساس ہوتا تھا ایک تو بغیر مکین گھر اس پر احساس اجنبیت کافی دیر تو وہ بولائی بولائی پھرتی رہی مگر جب ربیعہ کالج سے سیدھی چھوٹے ماموں کے ہاں آ گئی تو اس کے دل کو اطمینان سا ہوا۔

خانساماں کچن میں خوشبوئیں بکھیر رہا تھا، شام کے بعد انہوں نے کراکری و کٹلری منتخب کر کے ملازم کو صاف کرنے کے لیے دی۔ کافی کے خوبصورت مگ نکال کر کچن میں رکھے اور ہدایت کی کہ کھانے کے بعد انہیں کافی دینا۔ ہارون کے سسرالی بھی دعوت میں مدعو تھے۔ اس لیے ان دونوں نے کافی محنت کی دوسرے ان کی صلاحیتوں کا امتحان بھی تھا۔

وہ ڈائننگ ٹیبل کے لیے پھولوں کا گلدستہ بنانے لان میں لائی تھی۔

انگریزی پھولوں اور دیسی پھولوں کے ملاپ سے اس نے نہایت دلکش گلدستہ بنایا۔ جسے سیٹ کرتی ہوئی، برآمدے کے زینے طے کر رہی تھی۔ کہ تب ہی اس کی خود اعتمادی ڈانواں ڈول ہوئی، سفید پینٹ شرٹ میں وہ اسے چور نظروں سے دیکھ رہا تھا بظاہر وہ گاڑی لاک کر رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" سامنے آ گیا تو اسے کہنا پڑا۔

"وعلیکم السلام، بھئی یہ کہاں نظر آ رہی ہیں؟" اس کی خوبصورت بھاری آواز ابھری اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"آج ہارون بھائی اور ان کی دلہن کی دعوت ہے ناں۔" اس کی مدہم آواز ابھری۔

"اور آپ اس دعوت میں کس قدر اہتمام سے شامل ہو رہی ہیں۔ لباس دیکھئے اپنا۔"

وہ اس کے بے حد نزدیک تھا۔ وہ اس خاندان کی تمام لڑکیوں میں نمایاں قد و قامت کی حامل تھی۔ اس کے باوجود حماد کے کان تک پہنچ رہی تھی۔ اور حماد کی اتنی قربت پر اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا اس وجود کے سائے میں وہ خود اپنی ذات سے ڈر گئی تھی۔

احساس کمتری پھر عود کر آیا۔ ظاہر ہے انہیں میرا لباس کیوں نہ کھٹکے گا پتا ہے کہ میرا تعلق غریب خاندان سے ہے۔ اس میں اتنا اعتماد نہیں تھا کہ اس کے سامنے سے گزر کر اندر چلی جائے خاموشی سے اس کے ٹلنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"کپڑے تبدیل کیجیے تاکہ گھر میں کسی تقریب کا گمان ہو۔"

"میں کپڑے نہیں لائی ہوں یہی ٹھیک ہے، میں مہمانوں کے سامنے نہیں آؤں گی، بے فکر رہیے۔" خدا معلوم کیسے کہہ دیا اس نے۔

اسی دم ربیعہ نے اسے آواز دے لی تھی۔ وہ گلدستہ سونگھتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی اور اس سمت بڑھ گئی جہاں سے ربیعہ کی آواز آئی تھی۔

سلاد تیار کرتے ہوئے کتنے آنسو اس نے خانساماں سے نظر بچا کر اپنے دوپٹے سے صاف کیے۔ آخر جو لوگ امیر ہوتے ہیں وہ مغرور کیوں ہوتے ہیں؟ دوسروں کا دل کیوں دکھاتے ہیں؟ جب وہ جانتے ہیں کہ غریب لوگ ان جیسے کپڑے نہیں بنا سکتے۔ تو وہ جتاتے کیوں ہیں؟ جب کہ یہ تو میرے حقیقی ماموں زاد ہیں اور

جانتے ہیں کہ یتیم اسیر بھی ہوں میرے تو سائبان ٹوٹ چکے ہیں۔

شام سات بجے تک مہمان آ چکے تھے۔ ممانی جان ذرا پہلے آ گئی تھیں۔

سب کھانے کے کمرے میں موجود تھے سوائے اسماء کے۔

وہ کچن میں قہقہے، آوازیں سن رہی تھی۔

میری حیثیت کسی خادمہ سے کم نہیں، کام ہو گیا ہے۔ سب خوش ہیں، مصروف ہیں۔ کریڈٹ خانساماں لے رہا ہے۔ میں ایسے میں کیوں کر کسی کو یاد آ سکتی ہوں؟

اور وہ چھوٹے ماموں جو سب سے زیادہ میرا خیال کرتے ہیں۔ اس وقت اپنے ہم پلہ لوگوں میں کتنے مگن ہیں۔

"بی بی......"

"خدا انسان کو زندگی دے تو عزت والی۔"

"بی بی۔"

اس نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں۔

"بی بی۔"

"کیا ہے بھئی؟" وہ اپنے سے کم مایہ پر جھلا کر مڑی۔

"بڑے صاحب بلا رہے ہیں آپ کو۔"

"میں کیا کروں گی وہاں؟"

"وہ آپ کو بلا رہے ہیں، کہہ رہے ہیں فوراً آئیں۔"

وہ دوپٹہ درست کر کے نظریں جھکائے اندر چلی آئی۔

حماد نے اس کی سرخ سرخ روئی روئی آنکھیں دیکھ لی تھیں۔

بلکہ وہاں بیٹھے سب لوگوں نے اس کی بے حد خوبصورت آنکھیں، بہت متورم اور سرخ محسوس کی تھیں۔

"بھئی رو رہی تھیں کیا؟" ربیعہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں تو......سلاد کے لیے پیاز کاٹی تھی ناں۔"

"بھئی، ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا منع ہے؟" چھوٹے ماموں نے پوچھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بری بات بیٹا جتنی بھوک ہے کھا لو سب کے ساتھ۔" بڑے ماموں نے محبت سے ٹوکا، تب وہ جھجکتی ہوئی ان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"صبح سے کام کر رہی ہو ابھی بھی بھوک نہیں۔" انہوں نے ڈونگہ اس کی سمت سرکایا۔

"ربیعہ! تمہیں بہن کا ذرا خیال نہیں خود آ کر بیٹھ گئیں۔"

ممانی جان نے بھی شوہر کے سامنے بے پناہ شفقت کا مظاہرہ کیا۔

"امی! ایک تو اسماء باجی میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئیں۔ سچ ہم ان سے اس قدر بے تکلف ہیں بالکل فیملی ممبر، مگر یہ تو ہم سے بے حد اجنبیت سے پیش آتی ہیں۔ بہت ہی لیا دیا سا انداز ہے مغرور لوگوں جیسا۔" ربیعہ نے اس پر شکایتی نظر ڈال کر جانے کب کب کا حساب چکایا۔

سب ہنس دیئے۔

ہارون کی بیوی نے اسے بے حد پسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔

جب وہ بڑے ماموں کے ہمراہ جانے کو تیار ہوئی تو چھوٹے ماموں نے کہا۔

"کبھی یہاں بھی رہو، ہم تو یہ سوچ کر زور نہیں دیتے کہ تم یہاں تنہا رہ کر بور ہو گی مگر کبھی "بور" ہونے کا بھی پروگرام بناؤ۔"

وہ شرما کر مسکرا دی۔

"رہ جاتی ہوں ماموں جان! اگر آپ۔" ربیعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"بھئی یہ گھر تو ابتدائی جنت ہے، جب آدم اکیلے تھے تم تو بور ہی......"

"بھئی تمہارے چچا کی پسلی تو چاک ہو گئی، اب بھائی ہی بچا ہے۔" ممانی نے

ہنس کر ٹکڑا لگایا۔ اور خوبصورت اور خاموش حماد کو شرارت سے دیکھا۔

"اب یہ جنت بھی مکمل کرنا ضروری ہے، بتایئے آپ کی حوا کہاں سے لائیں؟"

ربیعہ نے کہا مگر وہ خاموش کھڑا رہا۔

"بتا دو یار! پھر اتنی فرصت سے جانے کب یہ سب جمع ہوں" ہارون نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے چور نگاہوں سے اسماء کو دیکھا اور ہارون کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"خدا کرے ہارون جسے دل مانگتا ہے وہ تقدیر بھی ہو۔"

بڑے ماموں گاڑی میں بیٹھنے لگے تھے۔ اور ان کی طرف سے توجہ ہٹالی تھی۔

ہارون نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"فرصت سے پوچھوں گا چھپے رستم۔"

اور اسے فرصت سے پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

صرف ڈیڑھ ماہ ہی گزرا تھا جب وہ ربیعہ کے "بیوٹیشن ایکسپریس" کا شاہکار بن کر حماد کے جملہ عروسی میں تھی۔ وہ بانکا شہزادہ اسے سامنے دیکھ کر وارفتگی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بات کے سچے اور قول کے پکے لوگ بہت متاثر کرتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لو آج جب میں بارات لے کر تایا کے ہاں پہنچا تو تم میری بارات میں شریک نہیں تھیں۔ گویا میری باراتی بننے کی ذلت بہر حال نہیں اٹھائی۔"

اور اسے دھڑکتے دل کے ساتھ غصے پر بھی قابو پانا پڑا۔

یہ ربیعہ کی بچی، اسے وہ شام یاد آ گئی جب اس نے ربیعہ سے کہا تھا کہ وہ حماد کی دلہن بنا تو کجا اس کی باراتی بننا بھی پسند نہ کرے۔

"دیکھو اسماء بیگم! سب عشق کرنے والوں کے انداز ایک جیسے نہیں ہوتے اس

لیے کہ عشق کی تربیت کسی انسٹی ٹیوٹ میں نہیں دی جاتی۔بعض دفعہ انسان اپنے مقابل کو غلط سمجھ بیٹھتا ہے۔ ہوتے ہوں گے لوگ مغرور، مگر عموماً لوگ غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں، غریب آدمی چڑچڑا اور تلخ ہو تو کہا جاتا ہے معاشی پریشانیاں ہیں۔''

امیر آدمی سخت مزاج ہو تو اسے مغرور کہا جاتا ہے۔

انسانوں کو پڑھنا آسان نہیں ہوتا تاہم خود کو کمتر وحقیر سمجھ رہے ہوتے ہیں تو فرض کر لیتے ہیں ہمارے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی ہمارے متعلق یہی سوچ رہا ہے۔

نہ میں مغرور ہوں، نہ سخت ل، بس ذرا عشق کے میدان میں اناڑی ہوں، مجھے تو وہ روتی بسورتی لڑکی آج بھی اپنے دل میں بند محسوس ہوتی ہے۔ جو پھوپھو سے کہہ رہی تھی کہ ان مغرور لوگوں کے درمیان میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

''اگر میں تمہارے گھر کے پھیرے لگاتا، روز تمہارے دیدار کو پہنچتا تو تب تم شاید تم میرے جذبوں پر اعتبار نہیں کرتیں۔''

''اسماء بیگم! بعض اوقات عشق کا چہرہ ایسا بھی ہوتا ہے۔''

اسماء کو ایسا محسوس ہوا وہ بہت بڑی دولت مند ہے، محبت اس کے پاؤں کے نیچے تھی۔

☆☆☆

بند دروازہ

کیا اپچی سن میں عقل کی ڈگریاں بھی ملنے لگی ہیں؟ وہ باتھ روم سے منہ پونچھتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی باہر آئی تھی......''

کیا مطلب......صوفیہ نے حیرانی سے خوش رو کو دیکھا۔

مطلب یہ کہ ہمارا شاہ زمان تو عقل میں بھی گریجویٹ لگنے لگے ہیں......اس نے مسکرا کر شاہ زمان کو دیکھا۔

اس کا مطلب ہے آپ ہماری باتیں سن رہی تھیں......؟ شاہ زمان نے گھورا......مطلب وطلب تم جانو......میری مجبوری یہ ہے کہ میں باتھ روم کا دروازہ تو بند کر سکتی ہوں کانوں میں دروازہ ہی نہیں تو کیا کیا جائے؟۔

''ہوں......آپ نے ہمارا سارا پلان سن لیا محترمہ......؟ دیکھیں خوش رو تم نے باہرِ آزاد پراپیگنڈہ کیا۔ تو ہم تم سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔شاہ زمان نے دھمکی دی۔''

''ایسا کرو......'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

"جی......؟" سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"میرے منہ میں وہ نیلا دوپٹہ ٹھونس دو۔ اس نے سامنے دوپٹے کی طرف اشارہ کیا......اور فری تم اپنے دونوں پراندوں سے میرے دونوں ہاتھ پاؤں باندھ دو۔"

"کیا مطلب؟......" سب چیخے۔

بھئی پیٹ۔ کے ہلکوں کا اس سے بہتر علاج میری نظر میں نہیں، وہ افسردگی سے بولی۔

دیکھیں خوش رو آپی...... آپ...... آپ یہ نہیں کریں گی...... فری چیخی......

شاہ زمان نے پلٹ کر وارڈ روب کھولی...... ایک دم واپس خوش رو کی سمت مڑا...... اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اصلی پسٹل چمک رہا تھا۔

"شوٹ کر دوں گا خوش رو میں تم کو۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی، چولہے پر بیٹھے رہتے ہو ہردم......؟ جیسے شوٹ ہی تو کر دو گے، مت کیا کرو ایسے ڈرامے جاؤ تم سب پہ ترس کھایا......نہیں کہیں گے کسی سے...... پھر شاہ زمان کے کاندھے، پر ہاتھ پھیر کر چڑانے والے انداز میں مسکرائی

دراصل ہم ڈر گئے تمہاری اس "توپ" سے...... ہمارا دل تو اس کی "نال" سے بھی چھوٹا ہے۔

مجھے پتا تھا آپی ایسی نہیں ہیں......اور پھر آپی ہم بدتمیزی تو نہیں کریں گے

فری نے اچک کر اس کا رخسار چوم لیا وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

آج اس کی پھوپھی زاد سامیہ کی مایوں تھی اور ان سب شیطانوں نے دادا جان اور دادی جان کا ڈرامہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ظاہر ہے "اشیائے ضرورت" دادا دادی ہی سے اڑائی تھیں اور اسی کا وہ پلان بنا رہے تھے جو خوش رو نے سن لیا تھا وہ زمان ان سب کا لیڈر بنا ہوا تھا تین دن پہلے ہی پھوپھی جان کے ہاں خاندان بھر کے لڑکیوں کا اجتماع ہو گیا تھا جو زمین و آسمان ایک کیے دے رہے تھے۔

خوش رو کیونکہ سنیئر بچوں میں شامل تھی۔ اس لیے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی تھیں اس لیے وہ اس شیطانی پارٹی کے پروگرام میں اکثر شمولیت سے قاصر رہتی تھی۔

اور یہی ہوا تھا وہ نکلی تو دیکھا اس کی پکار پڑ رہی تھی۔

ارے بیٹا کہاں چلی گئیں تھیں...... کھانے کا وقت ہو چلا ہے اور مٹر پلاؤ ابھی باقی ہے ذرا دم کر لو میں تمہارے پھوپھا کا قیمہ بھون دوں، وہ مارے بوکھلاہٹ جانے کیا بول گئیں۔"

خوش رو بے ساختہ ہنس پڑی...... رحم کیجیے پھوپھو ایک تو بے چارے کا قیمہ بنائیں گی اور پھر بھونیں گی بھی......

اے جانے کیا اول فول بک گئی ہوں، وہ ماتھا پیٹ کر بولیں، تم ذرا جلدی سے مٹر پلاؤ چڑھا دو، یہ لڑکیاں تو جانے کون سے بلوں میں گھس جاتی ہیں کام کے وقت...... وہ بڑبڑاتی کچن کی سمت چلیں تو وہ ان کے پیچھے ہو لی۔

خوش رو آپی میری گولڈن پنیں دیکھیں ہیں؟ ابھی یہیں تو رکھی تھیں رومی روہانسی ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھیں ہیں شاہ زمان کی آواز آئی۔ میں سمجھا ٹائی کی پنیں ہیں وہ مسکین انداز میں گویا ہوا۔

کہاں کہاں...... امی تو اس پر چڑھ دوڑی، اور آپ کو کس نے اجازت دی اس کمرے میں آنے کی۔ پتا ہے یہ آج کل لڑکیوں کا ڈریسنگ اینڈ چیک روم ہے۔

لو بھلا یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے، روز دیکھتا ہوں جاتی کوئی اور ہیں اور نکلتی کوئی اور ہیں...... وہ دل کھول کر ہنسا۔

میری پنیں دیجیے...... رومی چیخی۔

سچ میں تو مذاق کر رہا تھا میں ایسی واہیات چیزیں نہیں دیکھتا میں تو خوش رو کے پاس ایک عدد چائے کے کپ کی درخواست لے کر حاضر ہوا تھا۔

دماغ ٹھیک ہے تمہارا...... مہندی لے کے آتے ہی ہوں گے وہ لوگ...... یہ بدعت نہیں چلے گی، تمہیں دیکھ کر سب کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آجائے گی، کسی کو یاد آئے گا کہ اس نے گذشتہ تین گھنٹوں سے چائے کی صورت تو درکنار اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھی کسی کو یاد آئے گا کہ وہ صبح اپنی چائے کی پیالی ناشتے کی میز پر ہی بھول گیا تھا۔

معاف کرو بابا...... اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنے ماتھے سے ٹکائے، اور سنو یہ ٹائی کی ناٹ کیا سلام پھیر رہی ہے؟ اس نے جاتے ہوئے شاہ زمان کی ٹائی کھینچی، سوٹ پہن لیتے ہو، آداب بھی ملحوظ رکھا کرو اس نے ناٹ درست کی...... بے ڈھنگے ایک تو میں تم سے تنگ آیا نماز پڑھ کر دعا کی بجائے شکوہ کرتا ہوں کہ خدا کیا خوش رو میرے بعد نہیں بھیجی جاسکتی تھی۔ عاجز ہوں میں اس دو سالہ سنیارٹی سے وہ تھوڑا سا جھک کر مسکرایا۔

بے کار باتیں مت کیا کرو تم نے کبھی بھولے سے بھی میرا احترام کیا ہے؟ یہ میں ہی ہوں جو یہ بے ادبی برداشت کر لیتی ہوں...... چھوٹتے ہی نام لیتے ہو۔

اب ماموں جان نے اپنی اکلوتی صاجزادی کا نام ہی اتنا خوبصورت رکھا ہے۔ خوش رو ہزار تسبیح پر بھی پڑھو تو بور نہ ہو۔ وہ شرارت سے بولا آس پاس کھڑی تمام لڑکیاں خوش رو سمیت بے ساختہ ہنس پڑیں۔ بہت بدتمیز ہے یہ شاہ...... کئی آوازیں ابھری تھیں۔

چھوٹی پھوپھو...... کیا گھر میں کوئی نہیں ہے وہ کاریڈور سے ہی شور مچاتی چلی آئی تھی۔

سب ہیں بیٹی، کہاں جائیں گے بھلا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام...... یونیورسٹی سے آرہی ہو......؟''

''جی...... ڈائرکٹ...... یہ شاہ کا بچہ کہاں ہے، کل اس کا رزلٹ آیا تھا اس نے بتایا بھی نہیں۔'' چھوٹی پھوپھو ایک دم خاموش ہوگئیں۔

اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ گویا گڑبڑ ہوگئی۔ وگرنہ پھوپھو کے تاثرات اس وقت اور ہی ہوتے۔

''کیا ہوا پھوپھو......؟''

''رہ گیا ہے۔'' وہ سخت رنجیدہ ہوگئیں۔

''اوہ...... خوش رو کو بھی دھچکہ لگا ہے کہاں......؟''

''اپنے کمرے میں......'' وہ آہستگی سے بولیں۔

''ذرا میں اس سے مل لوں۔'' وہ اٹھ کر شاہ کے کمرے میں آگئی۔

''اے مسٹر...... یہ کیا اٹھوائی اور کھٹوائی لیے پڑے ہو، اندھیرا کیوں کر رکھا ہے...... کیا رو رہے ہو؟''

''طعنے مارنے آئی ہو تو فوراً چلی جاؤ۔'' وہ اسی طرح اوندھا لیٹا رہا۔

''ارے...... کینہ پرور نہیں ہیں جو تم نے کیا بھلا دیا...... اٹھو...... اس طرح کیوں لیٹے ہو، اس نے اس کی پشت پر ہاتھ مارا تو وہ سیدھا ہوگیا۔''

اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔

ارے بالکل ہی مجنوں بنے ہوئے ہو، اچھے مرد ہو وہ اس کے نزدیک ہی بیٹھ گی۔

ناکامی...... ناکامیابی کی اہمیت دو چند کرنے آتی ہے...... ناکام بھی انسان ہی ہوتے ہیں، کہاں ہے وہ مردوں والا حوصلہ اتنی اتنی سی بات پر دل برداشتہ ہوتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ اس پہلوانوں جیسے جسم میں چڑیا جتنا دل ہے۔ ایمان سے شاہ تم سے تو اس پست حوصلگی کی امید نہیں کی جاسکتی تم نے کرنا ہی کیا ہے۔ شاہ زمان لغاری...... کھانا پینا سونا اور امتحان دینا۔

میں کم ہمت نہیں ہوں خوش رو...... خوف اس بات کا ہے جتنی جلدی کر رہا ہوں اتنی دیر ہو رہی ہے کہیں امتحانوں میں ٹارگٹ ہی گم نہ ہو جائے۔ اس نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

ٹارگٹ نہ ہوا چھلاوا ہو گیا مجھے بتاؤ...... باندھ کر تمہارے سامنے بٹھا دیتی ہوں ابھی وہ ہنسی...... بے ایمان نیت صاف منزل آسان...... کہیں گم نہیں ہوتا ٹارگٹ خوش رو

''ہوں......؟''

''ابھی میں واقعی بہت اداس تھا، بہار کا پہلا جھونکا بن کر آئی ہو۔''

اچھا شاعری ہو رہی ہے خیر اڑھائی دن تو سقے نے بھی بادشاہت کی ہے تم بھی ایک دن کے شاعر ہوئے تو کوئی مضائقہ نہیں......'' وہ پھر مدھر ہنسی ہنسی۔

''پہلی ناکامی سے گھبرا گئے...... ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟''

''تم پھر عمر بیچ میں لے آئیں۔'' وہ جھلایا۔

''اے بد اخلاق نوجوان...... بعض اوقات نیکیاں بھی کامیابی سے ہمکنار کر دیتی ہیں مہمان کا اٹھ کر استقبال کرنا بھی میرے نزدیک نیکی ہے۔ اس نے فلسفہ بگھارا۔''

وہ ہنستا ہوا اٹھ بیٹھا۔

اٹھو شاباش شیو بناؤ غسل کر کے اچھی سی ڈریسنگ کرو، اور مجھے دکھاؤ تاکہ میں خوش ہوں میں دیکھتی ہوں پھوپھو نے دوپہر کے کھانے کے لیے کیا انتظام کیا ہے جلدی کرو...... پھر کھانا کھائیں گے وہ فوراً ہی باہر نکل آئی۔

کچن میں پہنچی تو پھوپھو کھانا گرم کر رہی تھیں۔

کیا کہہ رہا ہے...... کل شام سے بھوکا ہے، زبردستی صبح ایک بوائل انڈا کھلایا تھا باپ اتنے سخت ہیں لیکن انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا پھر بھی......

آ رہا ہے نہا دھو کر...... دراصل وہ ناکامی کا عادی نہیں ہے۔ پہلا دھچکہ تھا اس لیے بہت محسوس کیا ہے، خیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ارے کیا ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر وقت کے کھیل تماشے تو یہی رنگ لائیں گے۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے...... وہ آزردگی سے بولیں۔

بس یہی بات غلط ہے پھوپھو آپ لوگ اگر اس کی ناکامی کا احساس دلائیں گے تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ کیا اس سے پہلے ایسا کبھی ہوا، اس کی ہمت بڑھایئے اسے توڑیئے مت...... کھیل تماشے تو اس کے ہمیشہ ہی سے ہیں پھر بھی وہ کامیاب ہوتا رہا ہے بس آئندہ تذکرہ مت کیجیے گا...... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کتنے ہی دن گزر گئے وہ اپنے ایم اے کے امتحانوں میں مصروفیت کے سبب کہیں آ جا نہ سکی۔ بقول شاہ کے تم سمیسٹر دیتی یا اعتکاف میں بیٹھ جاتی ہو۔ ترس جاتے ہیں تمہارے ''خوش رو'' کو رات کو بہت دیر تک جاگتی تھی اس لیے ناشتا کر کے پھر سو گئی۔ ظہر کے وقت اٹھی تو امی نے بتایا کہ شاہ زمان آیا تھا میں نے کہہ دیا کہ تم سو رہی ہو۔ رات بھر جاگی ہو تو اس نے اٹھانے سے منع کر دیا۔

اسے شاہ زمان کی حساسیت پر بڑا شفیق سا پیار آ گیا۔

کھانا کھا کر نہیں گیا امی؟

نہیں کہہ رہا تھا کہ سعدیہ (بڑی پھوپھو کی لڑکی) کو لینے جا رہا ہوں امی نے بلوایا ہے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں شام کو دیکھنے جاؤں گی تم چلو گی؟''

کل میرا آخری پیپر ہے امی...... واپسی پر چلی جاؤں گی آپ چلی جائیں۔

اگلے روز وہ پھوپھو کے گھر پہنچی ابھی راہداری بھی پار نہیں کی تھی کہ پھوپھا جان کی گرجتی ہوئی آواز آئی، جانے کن شہدوں میں بیٹھنے لگا ہے۔ جب ہی پڑھائی میں کورا ہو رہا ہے۔ یہ عمر ہے ان حرکتوں کی۔ صاجزادے تین میں نہ تیرہ میں بیچنے

کھڑے ہو تو کوئی مفت نہ لے۔ یہ سب تمہارے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ ایک ہی بچہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اسے لاڈ پیار سے ناکارہ کر دیا جائے...... میں کہہ رہا ہوں ابھی بھی آنکھیں کھول لو روؤ گی ورنہ سر پکڑ کر۔

ہو جاتی ہیں بچوں سے غلطیاں، آئندہ نہیں پڑے گا...... پھوپھی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

خوش رو کا دل کانپ کر رہ گیا...... کیا پینے لگا ہے؟

پوری ڈبیہ خالی ہے...... صاجزادے سگریٹ کے عادی ہو چلے ہیں...... ایک اطمینان کی سانس خوش رو کے سینے سے خارج ہوئی وہ ہچکچاتی ہوئی پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

''السلام علیکم''

''وعلیکم السلام...... دونوں میاں بیوی اپنے اپنے موڈ پر قابو پا کر بولے...... کیسی طبیعت ہے پھوپھو آپ کی......؟''

اب تو کچھ ٹھیک ہے...... یونیورسٹی سے آ رہی ہو، پیپر کیسا ہوا......؟ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ٹھیک ہی ہو گیا...... اس نے تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت سے ٹک کر کہا۔

''خوش رو کا پیپر اور صرف ٹھیک...... ہماری بیٹی کا پیپر بیسٹ ہوتا ہے ٹھیک نہیں'' پھوپھا جان نے قدرے تفاخر سے کہا، پھر بولے...... ''کاش ایسے ہی شوقین لڑکے بھی ہوں پڑھنے لکھنے کے تو کیا بات ہے'' ان کے لہجے میں محرومی بول رہی تھی۔

وہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے پھر حسب سابق خوش رو اس کے کمرے میں چلی آئی...... وہ صرف جینز ہی پہنے ہوئے اوندھا لیٹا تھا۔ اس کے مضبوط و

جوان جسم کو اس حالت میں دیکھ کر خوش رو ایک دم جھینپ سی گئی۔ اسے بغیر دستک دیئے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ لاکھ وہ اس سے چھوٹا سہی لیکن اب تو ماشاء اللہ جوان ہے مگر اب تو آ ہی چکی تھی وہ بھی سیدھا ہو کر جسم پر گاؤن لپیٹنے لگا تھا۔ اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ گاؤن لپیٹ کر اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ اور لائیٹر نکالا...... وہ ہکا بکا کھڑی دیکھتی رہ گئی، باپ کی اتنی گرج چمک کے باوجود بڑی لاپرواہی سے سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔

''یہ کیا ہے شاہ......؟'' وہ الجھی۔

''اسے سگریٹ کہتے ہیں...... غیر ملکی برانڈ ہے'' اس نے سارا دھواں خوش رو کے منہ پر چھوڑ دیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے، خوش رو کو واقعی غصہ آ گیا...... اسے دھواں کہتے ہیں بدتمیزی نہیں۔''

شاہ...... واقعی تم بہت بگڑ گئے ہو...... خوش رو کیا میں بچہ ہوں؟ وہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔

''ہاں...... وہ قطعیت سے بولی۔''

''تم تو کم از کم نہ کہو، بچپن کی بھی حد ہوتی ہے۔'' وہ جھلایا۔

''ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے جو ابھی سے سگریٹ بھی پینے لگے ہو......؟''

''لڑکیاں کہتی ہیں سگریٹ پیتا ہوا بہت ہینڈسم لگتا ہوں'' وہ شرارت سے مسکرایا...... ''ہونہہ لڑکیاں کہتی ہیں...... اور جب کھوں کھوں کرو گے تو یہی لڑکیاں ناک پر رومال رکھ کر بات کریں گی سمجھے...... مگر اس وقت تک کافی انجوائے منٹ تو ہو چکی ہو گی'' وہ حلق پھاڑ کر ہنسا۔

''کہیں ڈوب مرو جا کر چلو بھر پانی میں......'' وہ آگ بگولا ہو گئی۔

عورت کی تقدیس...... سخت نابلد ہو تم اس سے...... جوان مرد کی شان اس

میں نہیں کہ وہ پھل کو چکھ کر دیکھے، مردانگی تو یہ ہے کہ انجوائے منٹ کے ایسے لمحوں پر حقارت سے تھوک کر لعنت بھیجے خدا نے تمہیں مرد بنایا ہے مردوں کی سی آن بان بھی پیدا کرو، مرد کے ساتھ اس کی ''جیت'' نہ ہو تو وہ بھی کوئی مرد ہے کبھی نفس کو چاروں شانے چت گراؤ تو بات ہے۔''

ایک تو میں تمہاری Teaching سے بہت عاجز ہوں وہ واقعی عاجز آ کر بولا۔ یہ Teaching نہیں ہے، دوستانہ سی بات ہے غور کرو...... پسند آئے تو...... کرو ورنہ...... وہ اس کی طرف دیکھتا رہا...... کافی دیر تک......

بات تم بھی تو کہتی ہو خوش رو...... دل کو لگتی ہے...... مگر باقی دوسرے تو مجھے گنہگار ثابت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ذرا سی بات پر اتنی انسلٹ کرتے ہیں کہ خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے یار...... ان لوگوں کی عمریں گزر گئیں، انہیں بات کرنا نہیں آتی تعجب ہے، خوش رو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اپنی اپنی سمجھ ہے شاہ...... ذرا ذرا سی بات کا برا مناتے...... بے وقوفی کی نشانی ہوتی ہے۔ ضد سے انسان خود ہی تباہ ہو جاتا ہے، اہم بات یہ ہے شاہ کہ دکھ نہیں دیتے۔ جوابی دکھ پھر نا قابل برداشت ہو جاتے ہیں، گندم بو کر کسی نے چنا بھی پایا ہے یا چنا بو کر کبھی گندم بھی کاٹی گئی ہے، خود کو تباہ نہ کرو شاہ...... وقتی طور پر برہم ہونے والے یہ سب لوگ تمہارے سب سے زیادہ ہیں۔ یہ تمہیں بہت شدت سے سوچتے ہیں۔ انہیں دکھ نہ دو شاہ...... میں انہیں کیا کہتا ہوں خوش رو...... یہ مجھے ضد کیوں دلاتے ہیں۔''

پندرہ دن بیشتر چھوٹے ماموں کے ساتھ ہنسی مذاق میں سگریٹ کا ایک کش لے لیا تھا بابا نے مجھے ضروری کام سے اپنے کمرے میں بلایا میں گیا تو کہنے لگے۔ سگریٹ پی ہے؟

میں نے کہا چھوٹے ماموں کے ساتھ ہنسی مذاق میں کش لیا تھا کہنے لگے جھوٹ بولتے ہو اتنا گرجے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ یاسر اور اویس ڈرائنگ

روم میں بیٹھے ہوئے تھے بابا نے ان کے سامنے میری اس قدر انسلٹ کی میں تمہیں بتا نہیں سکتا، بس مجھے بھی غصہ آ گیا اس دن سے باقاعدہ سگریٹ پی رہا ہوں۔ سگریٹ تک بات نہیں کی، انہوں نے بلکہ یہ بھی کہا کہ میں آوارہ ہو گیا ہوں، لڑکیوں میں گھیرا رہتا ہوں، ارے حد ہوتی ہے اس نے سر جھٹکا۔

انہوں نے میرا جیب خرچ بند کر دیا۔ میں نے کار کے وہیل کیپ بیچ دیئے، پھوپھا کو میں نے بتا دیا کہ سگریٹ کے لیے پیسے چاہئیں تھے۔ اسی لیے ابھی اس قدر گرم ہو رہے تھے وہ آرام سے بولا خوش رو نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''اوہ میرے خدا...... شاہ کے بچے...... تمہیں پھوپھا جان کے غصے سے ڈر نہیں لگا۔ اگر وہ تمہاری ان ضدوں سے عاجز آ کر عاق کر دیں تو؟۔''

''تو کیا......؟ بھیک مانگنا شروع کر دوں گا وہ بھی ان کے دوستوں کے محلے...... میں...... نام تو انہی کا روشن ہوگا وہ زہریلی ہنسی ہنسا...... خوش رو اٹھ کر باہر آ گئی پھوپھو برآمدے میں بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں۔

''پھوپھا جان کہاں ہیں؟''

اپنے کمرے میں ہیں شاید سو گئے ہوں وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

خوش رو پھوپھا جان کے کمرے میں چلی آئی......''میں آ سکتی ہوں پھوپھا جان؟'' وہ دستک دے کر بولی۔

''آ جاؤ بیٹی......'' ان کی آواز بوجھل تھی۔

''سو رہے ہیں......؟''

''ارے نہیں...... اب سونا کہاں عمر بھر کا رونا ہے، وہ سرد آہ کھینچ کر بولے......

پھوپھا جان ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے......؟ وہ ڈرتے ڈرتے بولی......

''کہو...... لیکن اس بدبخت کی وکالت نہ کرنا......'' وہ ناراضگی سے بولے۔

''ارے نہیں، بس آپ میری بات سن لیجیے۔''

''ہوں......؟''

''پھوپھا جان...... ہمارے مسائل اس لیے اور زیادہ الجھ جاتے ہیں کہ ہم باہمی اعتماد کی فضاء قائم کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو لعن طعن کرنے لگ جاتے ہیں...... ہمیں اپنے گھروں میں گھٹی ہوئی زندگیوں کے مدفن نہیں بنانے ہیں کہ آخر ہم لوگ پڑھے لکھے ذی ہوش ہیں۔ بعض اوقات حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے جو ہم سمجھتے ہیں...... پھر اس نے شاہ زمان کی کہی ایک ایک بات پھوپھا جان کے سامنے دہرا دی...... پھوپھا جان یہ حقیقت ہے کہ زمان مجھ سے کوئی بات کبھی نہیں چھپاتا...... پھوپھا جان فاصلے کم کر کے پرانے زمانے کے پرہیبت باپ کے بت توڑ کر اس سے دوستوں کی طرح پیش آیئے، یقین کیجیے وہ آپ کی آن بان کو چار چاند لگا دے گا...... وہ بڑا خود پسند سا ہے عقل آنے پر بدل جائے گا آپ اس کے پندار کا احترام کیجیے یقین کیجیے غیر معمولی ذہین ہے وہ مایوس نہیں کرے گا آپ کو...... اگر اس کے الٹ ہوا تو میں ذمہ دار ہوں۔''

پھوپھا جان پر اس کی باتوں اور شاہ زمان نے ان جملوں کا جو خوش رو کی زبانی سنے تھے بے حد اثر ہوا...... وہ خاموش ہو گئے تھے۔ شاید انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا...... وہ پھر کچھ نہیں بولی بلکہ موضوع بدل کر بات کرنے لگی مثلاً انہوں نے نئے سال کی ڈائری کیوں نہیں دی ابھی تک، اور وہ اتنے دن سے گھر کیوں نہیں آئے...... وہ بہت ہشاش بشاش سے اس کے سوالات کا جواب دینے میں مگن ہو گئے تھے۔ اس نے باہر قدموں کی چاپ سنی تو گمان کیا پھوپھو ہوں گی۔

خوش رو کے رشتہ تو اس وقت سے آنا شروع ہو گئے تھے جب وہ اسکول میں تھی لیکن اب ان میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لی جانے لگی تھی۔

آخر ایک رشتہ سب کو بے حد پسند آ گیا لڑکا ایک اعلیٰ عہدے دار تھا خاندان کا تھا کہ ان کے ہاں ابھی تک لڑکیاں غیر خاندان میں نہیں دی جاتی تھیں۔

خوش رو کے والد نے آج اس سلسلے میں اپنے بہن بھائیوں کا اجلاس طلب کیا تھا۔ خوش رو ایک حقیقت پسند لڑکی تھی۔ اس کی خاندانی اور تعلیمی زندگی اس قدر بھرپور گزری تھی کہ اس نے کبھی آئیڈیل وغیرہ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے جو اسے بے پناہ چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے سوچیں گے بہتر ہی سوچیں گے اس لیے وہ بے حد مطمئن تھی۔ اجلاس رات گئے تک جاری رہا۔ اور اس دوران وہ اپنی کزنز کی چھیڑ چھاڑ کی زد میں رہی...... ارے خوش رو، ہم تو وقار بھائی اور شاہ زمان کی مونچھوں کی نشوونما پر تشویش کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اور تمہارے ''ان'' کی مونچھیں تو ان دونوں کی مونچھوں سے بھی سنئیر ہیں۔ اس کی چچازاد حمیرا نے اسے خبر بہم پہنچائی۔

ارے تو کیا خوش رو آپی نے انہیں دیکھا نہیں ہے جو اس طرح بتا رہی ہو؟ فرحی نے حمیرا کو ٹوکا...... ارے تو فکر کی کیا بات ہے...... ترکیب تمہیں ہم بتا رہے ہیں، ایک گول پیالہ لینا اور انہیں پانی پینے کا حکم دینا جتنی مونچھیں بھیگ جائیں اپنے دست مبارک سے کاٹ دینا۔ مونچھیں نارمل ہو جائیں گی، چھوٹے چچا کی عائشہ نے ترکیب بتائی۔

واہ واہ...... وزیر باتدبیر ہے ہماری عائشہ، سب نے تالیاں پیٹیں تو خوش رو نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا...... سب لوگ رات کا کھانا کھا کر تقریباً نو بجے رخصت ہو گئے، رشتے کی حمایت میں ووٹ دے کر وہ کام کاج سے شل ہو کر بستر پر بدن ڈھیلا چھوڑ کر دراز ہو گئی تھی۔

''معاً'' دروازے کا پردہ آہستگی سے اٹھا شاہ زمان اندر داخل ہوا...... آداب عرض ہے......'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا...... ''ہم بھی جواباً تسلیم عرض کرتے ہیں...... وہ اسی طرح لیٹے لیٹے مسکرا کر بولی...... ہوں...... بہت خوش نظر آ رہی ہو...... وہ پاؤں پھیلا کر مزید آرام سے بیٹھ گیا۔

جی ہاں...... اس لیے کہ سنا ہے تم میری بارات کے استقبال کے چیف ہو گے
اور شامیانے کے کھونٹے گاڑنے کا مبارک فریضہ بھی تم ہی اپنے مبارک ہاتھوں سے
انجام دو گے...... وہ اپنی بات کے اختتام پر خود ہی ہنس پڑی...... شامیانے کے کھونٹے
گاڑنے کا نہیں اکھاڑنے کا سنا ہوگا...... وہ سنجیدگی سے گویا ہوا وہ اس کے انداز پر ذرا
چونک گئی، ارے اس قدر اداس ہونے کی کیا بات ہے...... تمہاری باری بھی انشاء اللہ جلد
ہی آ جائے گی۔

”کیا ہماری باری ایک دن نہیں لگ سکتی......“ اس کی آواز آہستہ تھی۔

”لگ سکتی ہے لڑکی پسند کر کے بزرگوں سے منظوری لے لو......“ وہ
مسکرائی ”میں چاہتا ہوں پہلے لڑکی سے رائے لے لوں...... وہ آہستگی سے بولا ”ایسا
کرلو...... میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہے“ وہ نرمی سے مسکرا رہی تھی۔

پھر کیا خیال ہے تمہارا......؟ وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا! خوش رو کانپ
کر رہ گئی، وہ نادان بچی تو نہیں تھی بڑے بڑوں کو بیچ کرتی تھی۔ کیا واہیات ہانکنے لگے
ہو...... وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”وہ جس کا رشتہ آیا ہے اسے بھی کہا ہے تم نے یہ جملہ......؟ بلکہ خوش نظر
آ رہی ہو...... دیکھو شاہ...... اب تم خاموش ہو جاؤ...... شرم کرو...... رشتوں کا احترام کرنا
سیکھو...... احترام ہے تو ہی کہہ رہا ہوں...... بہت بری بات ہے شاہ...... آخر تمہارے
ذہن میں یہ احمقانہ بات آئی کیوں...... تمہیں پتا ہے تم مجھ سے تقریباً دو سال چھوٹے
ہو، کہاں اپنے ساتھ مجھے بھی ذلیل کرنے لگے ہو...... تار تار آنچل کی آبرو محفوظ کی ہے،
احتیاط سے...... مت کرو مجھے اس طرح رسوا...... اس نے ہاتھ جوڑے۔

”ناں...... تو مجھے برائی تو بتاؤ...... یہ ہماری سات پشتوں میں اس سے زیادہ
حیرت انگیز باتیں نہیں ہوئیں، کیا دادا جان کی سب سے بڑی بہن خاندان میں جوڑ کا
رشتہ نہ ہونے کے باعث ایک گیارہ سال کے لڑکے سے نہیں بیاہی گئیں...... جس کو تیار

کر کے اسکول بھیجا کرتی تھی۔ اور ہماری نانی جان کی بڑی خالہ بیوہ ہونے کے بعد اپنے
سے دس سال چھوٹے دیور سے نہیں بیاہی گئیں۔ صدیوں پہلے ہمارے ہاں کی سید
زادیوں نے قرآن کو گواہ کر کے اپنے والدین کو اپنے حقوق نہیں معاف کیے؟ وہ غیروں
میں تصفیہ لوگوں سے نہیں بیاہی جا سکتی تھیں؟ جائیداد بچانے کی خاطر جوان لڑکیوں کی
اُمنگوں کا خون کرنا...... اس سے زیادہ سفاکی کیا ہو سکتی ہے...... اس سے زیادہ حیرت
انگیز واقعات کیا ہوں گے؟“ کیا یہ غیر معمولی باتیں نہیں ہیں؟“

وہ شاید پوری تیاری سے آیا تھا، وہ گنگ بیٹھی رہ گئی۔ وہ وقت وہ زمانے گزر
گئے، نئے دور کی نئی قدریں ہیں، اب اس دقیانوسیت کا پیچھا چھوڑ دو، آخر کار وہ بولی۔

”کیسے چھوڑ دوں......؟ ناممکن ہے۔“

جب میں ہی انکاری ہوں تو تم کیا کر سکتے ہو، خبردار جو تم نے آئندہ یہ بات
دہرائی وہ چپل ٹٹول کر پاؤں میں اڑسنے لگی۔

میں...... نے تم سے اچھا کوئی نہیں دیکھا خوش رو...... میں تصور بھی نہیں کر سکتا
کہ تم مجھ سے کہیں دور چلی جاؤ...... شاہ زمان اس وقت اسے ایک معصوم بچہ لگا، اس نے
خود پر قابو پالیا اور بولی...... یہ جذباتیت ہے...... ہم تمہاری بیوی اتنی اچھی لائیں گے کہ
تم بے اختیار ہمارا شکریہ ادا کرو گے......“

کہاں سے آئے گی میری بیوی۔“ اسی خاندان سے اس خاندان کی سب
لڑکیوں کو جانتا ہوں...... کوئی بھی تم سے اچھی نہیں ہے۔“

اچھا جاؤ فی الوقت یہ موضوع ختم کرو، تمہارے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں اس
نے دانش مندی سے اس پر قابو پانے کی کوشش کی مجھے حوصلہ افزاء خبر سنا کر رخصت کرو
خوش رو...... میں کافی نہیں پیئوں گا، وہ اٹھ کھڑا ہوا عین اس کے مقابل...... وہ اس سے
تقریباً دو ہاتھ اونچا تھا سیاہ شلوار قمیض میں اس کا سراپا مزید مضبوط و توانا ظاہر تھا خوش رو
کو اس کا قرب پہلی مرتبہ کھلا...... اس کا جی چاہا وہ اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر

بھی لگ جائے۔

شاہ عقل کے ناخن لو...... ایک دن خود ہی جذباتیت پر پشیمان ہو سکے مجھے آئندہ تباہ کرو گے۔

خوش رو...... تمہیں ہمیشہ کی طرح صرف باتیں سوجھ رہی ہیں جو مجھ پر گزر رہی ہے تم تمام تر عقلمندیوں کے ساتھ اس کی تہہ میں اترنے سے قاصر ہو خوش رو...... خدا کرے تم بھی کبھی اس امتحان سے گزرو...... پھر تم میری آج کی حالت کا احساس کر کے بہت روؤ گی۔ میری جان پہ بنی ہوئی ہے تمہیں کافی سوجھ رہی ہی، وہ جھٹکے سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

وہ ششدر کھڑی رہ گئی...... ایک دم خالی الذہن، اسے اپنی دوست صبا کی بات یاد آئی۔

''خوش رو...... تم اس قدر ''خوش رو'' ہو کمال کی بات ہے کسی نے تم پر مر مٹنے کی کوشش نہیں کی۔''

اور اس بے حد عملی سی لڑکی نے بھی حیرانی سے سوچا تھا وہ اس قدر غیر جذباتی کیوں ہے؟ اسے نہیں معلوم تھا، کوئی اسے چاہ نہیں رہا پرستش کر رہا ہے۔

کس قدر احمق ہے یہ شاہ بھلا کوئی تک ہے جی میں آ رہا ہے پھوپھا جان کی زبردست جھاڑ پلواؤں، ٹھیک ہے کسی زمانے میں ہمارے خاندان میں یہ سب ہوا جس کا ذکر شاہ کر رہا تھا مگر اب تو سارا خاندان شہروں میں آباد ہو چکا ہے۔ نئی تہذیب اور قدروں کو جو عقل سے ہم آہنگ ہیں اپنا چکا ہے۔

میں حیران تو رہی تھی کہ یہ شاہ ایک دم سے اتنا بڑا بڑا کیوں لگنے لگا ہے اور ''آپ'' کے بجائے ''تم'' سے کلام کرنے لگا ہے، پرلے درجے کا احمق...... وہ دوبارہ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

پھر اس نے اتنی بری خبریں تواتر سے سنیں کہ اس کا دل بیٹھ گیا۔

شاہ اپنے ماں باپ سے الجھ پڑا...... شاہ نے خواب آور گولیاں نگل کر خودکشی کی کوشش کی...... آگ اس کے گھر تک پھیل گئی تھی، خدا کا کرم تھا کہ سب کو خوش رو پر پکا اعتماد تھا سب اسی کو احمق گردان رہے تھے۔ خوش رو کو تو سب کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرم آنے لگی۔ پھر اس نے سنا...... ''پھوپھا جان نے شاہ زمان کو عاق کر دیا ہے...... اپنے لخت جگر شاہ زمان کو۔''

''اپنی عمر بھر کی کمائی...... اپنے بڑھاپے کے مان کو...... اپنی واحد اکلوتی نرینہ اولاد کو......''

اس نے یہ بھی سنا کہ پھوپھو نے کہا تھا کہ اگر وہ شاہ زمان کی ضد مان بھی لیں تو کیا خوش رو اور اس کے والدین اس احمقانہ فیصلے سے اتفاق کریں گے؟ آخر خوش رو بھی تو اپنے والدین کی واحد اولاد ہے۔

اب سب کچھ ناقابل برداشت ہو گیا تھا اور ''عاق'' کا سن کر تو خوش رو کا احساس دل تڑپ تڑپ گیا خدا معلوم کہاں کہاں ٹھوکریں کھائے گا۔ اس قدر نازوں کا پالا...... اس کی خاطر۔

وہ اپنی ماں کو بتا کر پھوپھو کے ہاں چلی آئی۔ اور پھوپھو سے کہا وہ اسے ایک بار پھر سمجھانے آئی ہے پھوپھو رو پڑیں کہ تمہارے پھوپھا یہ کہہ گئے ہیں اس کے پاس شام سات بجے کا وقت ہے وہ سات بجے تک گھر چھوڑ دے۔

وہ فوراً اس کے کمرے میں چلی آئی...... وہ ایزی چیئر پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا شیو بڑھی ہوئی ستا ہوا چہرا، اسے دیکھ کر چونک اٹھا پھر واپس نظریں موڑ کر لاتعلقی کا اظہار کیا۔

''السلام علیکم۔'' وہ بولی۔

''مت بھیجو مجھ پر سلامتی، گوشت کھانے اور سلام کرنے تک مسلمان ہو

بس......؟ وہ باتیں جو ہماری پاکیزہ ہستیوں نے معیوب نہیں سمجھیں تم سب انہیں گناہ قرار دے رہے ہو وہ بگڑ اٹھا۔

یہ بات نہیں ہے شاہ...... وہ باتیں اس دور کے مطابق بھی معیوب تھیں کہ اس زمانے میں کزنز قطعی نامحرموں کی صف میں تھے۔ ان سے پردہ کیا جاتا تھا آج کے دور میں رشتے دار اگر ایک گھر ایک ہی کنبہ ہوں تو کزنز کو بہن بھائی ہی سمجھا جاتا ہے۔ بالخصوص عمروں کے تفاوت سے انہیں ادب واحترام اور تعظیم کی تلقین کی جاتی ہے۔ چھوٹی عمر کا کزن اپنے بڑوں کو حقیقی بہن بھائیوں کی طرح سمجھتا ہے کہ اسے بڑوں سے رشتے کا احترام بتا دیا جاتا ہے۔ اب اگر اس طرح کے قدم اٹھائے جانے لگیں تو کیا یہ بات معاشرے میں بگاڑ پیدا نہیں کرے گی۔ عمروں کے لحاظ، بیچ سے اٹھ جائیں گے تو بتاؤ تہذیب کی یہ شکل باقی رہ سکے گی! خدا کے لیے نادان نہ بنو، ایک سنہرا مستقبل تمہارا منتظر ہے وہ منت سے بولی۔

مت کرو تقریر، دلیل سے عقل قائل ہوتی ہے عشق نہیں۔ مگر یہ بات تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' وہ اس کی بے باکی کو ہضم نہ کرسکی۔

جس دن تمہیں کوئی لینے آیا تو گولی ماردوں گا اس کے لہجے میں سفاکی اور عزم تھا۔ وہ لرز کر رہ گئی اسے معلوم تھا یہی جملہ اس نے باپ کے سامنے کہا تھا جس کی وجہ سے اسے عاق کر دیا تھا۔

وہ اندر ہی اندر اس کے جذبے کی شدت اور مضبوطی سے خائف سی ہوگئی تھی۔

میں جا رہا ہوں خوش رو آج یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر، میں نہیں چاہتا بابا میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگیں، یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی مگر خوش رو...... وہ رک گیا اور اپنے غصے پر قابو پانے لگا۔

مت تباہ کرو خود کو تم مجھے بہت عزیز ہو شاہ مجھے جیتے جی مت مارو......

آنے والے دنوں کا انتظار کرو جو تمہیں عقل و دانش دینے آ رہے ہیں وہ بھر ملتجی ہوئی۔

نہیں ہوں میں بے وقوف سمجھیں؟ تم ہو کر تو دیکھو کسی اور کی......'' وہ اٹھ کر باتھ روم میں بند ہوگیا۔ وہ مردہ قدموں سے پھوپھو کے سامنے چلی آئی۔

پھوپھو...... وہ تباہ ہو رہا ہے۔ بخدا اس میں میرا کوئی قصور نہیں، میں اس کی ضد مان لیتی ہوں آپ دونوں کی خاطر میں اسے پرورش کروں گی۔ میری عمر کار خیر میں گزر جائے گی۔ یہ زندگی کا بہترین مصرف ہوگا۔ میں اس کی زندگی کو کارآمد بنانے کی کوشش کروں گی، آخر وہ ہمارا اپنا ہے......''

پھوپھو آنکھیں پھاڑے خوش رو کو دیکھ رہی تھیں، جو کاٹ کاٹ کر اشک روکنا چاہ رہی تھی۔ زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا، خاص خاص عزیزوں کی موجودگی میں نکاح کی رسم انجام پا گئی خوش رو کے پاپا رخصتی میں التواء چاہتے تھے لیکن پھوپھو نے اصرار کیا کہ عمریں گزر گئیں میاں کی سختیاں اور بیٹے کی لاپرواہی و خودسری جھیلتے، ایک عمر بعد بہار دیکھی ہے۔ وہ اب خوش رو کی جدائی برداشت نہیں کر پائیں گی۔ خوش رو آج بھی ان کی تھی اور کل بھی انہوں نے مزید رود کد کے رات گیارہ بجے اسے بچوں کی طرح بلک بلک کر رخصت کیا۔

ان کی خاندان بھر میں یکتا والا ثانی بیٹی کسی کی ضد کی بھینٹ چڑھ رہی تھی۔ وہ اس کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھے۔ خوش رو کی زندگی کا خوبصورت ترین وقت زندگی کا سب سے الجھا ہوا وقت بن گیا تھا۔ شاہ زمان نے جب کرسی پر نیم دراز سا ہو کر اسے بچوں کے سے انداز میں خوش ہو کر دیکھا تو خوش رو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

خوش رو...... آج ٹیچنگ نہیں ہوگی، آج میں اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے یقین کرنا چاہتا ہوں کہ واقعی یہ تم ہو، جذبے جیت جاتے ہیں خوش رو...... وہ فخریہ بولا۔

''ہاں شاہ زمان واقعی جذبے جیتا کرتے ہیں، جیسے رحم کا جذبہ ہمدردی کا جذبہ، تمہارا خدا معلوم کون سا جذبہ ہے، مگر ہاں میرے ہاں محض جذبہ ہمدردی ہے۔''

اس نے پہلی مرتبہ شاہ زمان کو نظر اٹھا کر دیکھا آف وہائیٹ شیروانی اور سفید پاجامے میں وہ خوش رو سے لاکھ گنا خوش آسودہ اور کئی گنا ''بڑا'' نظر آ رہا تھا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ وہ ابھی تک اپنے دل میں اپنے مقام کا تعین نہیں کر پائی تھی وہ اسے ''پنکج ادھاس'' کی غزلیں سنانے لگ گیا۔ اسے ایک ہندوستانی آرٹ فلموں کی اداکارہ بے حد پسند تھی۔ اس کے جمع شدہ کلوز اپ دکھائے، جب خوش رو کو ٹوٹ کر نیند آنے لگی تو وہ لباس تبدیل کرنے چلا گیا خوش رو نے وہیں بیڈ پر گر کر آنکھیں موند لیں، سولی کے انتظار میں نیند نہیں آتی......مگر سولی پر آ جاتی ہے۔

اسے بھی آ گئی تھی۔

صبح جب آنکھ کھلی تو شاہ زمان کمرے میں موجود نہیں تھا۔

پھوپھا جان اور پھوپھی جان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا ان کا بیٹا کس قدر بدل گیا تھا ہر دم اپنے مستقبل کی فکر میں گامزن، خوش رو پھوپھو کے سامنے ہنستی کھلکھلاتی رہتی تھی، مگر تنہائی میں اس کی آنکھیں بھیگی رہتی تھیں۔

خوش رو کی بھرپور لگن آخر رنگ لائی شاہ زمان بار ایٹ لاء کے لیے باہر جا رہا تھا، پھوپھا پھوپھی خوشی سے بے حال تھے ان کے خواب ایک ایک کر کے پورے ہو رہے تھے۔ وہ خوش رو کے بے حد ممنون و مشکور تھے۔ پھوپھو خوش رو کو آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی تھیں۔''

شاہ زمان ماں باپ کو اور اسے باقاعدگی سے خطوط لکھتا تھا وہ اس کی بیوی تھی مگر اس کا خط بے حد دوستانہ سا ہوتا تھا ایک جملہ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا خوش رو تم اس قدر اچھی سی ہو اور میری ہو سوچتا ہوں خوش رہتا ہوں۔

وہ جملہ پڑھتی تو دو موٹے موٹے اشک خط پر پھسل پڑتے تھے۔

پہلی عید تھی شادی کے بعد، پچھلی عید کے مہینے میں تو وہ رخصت ہوئی تھی، پہلے اس نے گھر وغیرہ صاف کیا پھر امی کی طرف چلی گئی، وہاں ان کا ہاتھ بٹانے تراویح کے بعد پھوپھا اسے لینے آ گئے۔ رات جب وہ اپنے کمرے کی سیٹنگ بدل رہی تھی تو پھوپھو نے شاہ زمان کا خط لا کر دیا کہ وہ دوپہر کو بھول گئی تھیں۔ اس نے معمول کی نرمی سے خط چاک کیا۔

خوش رو

سلامت رہو

عید آنے والی ہے سوچ رہا ہوں کیا تحفہ بھیجوں؟ خوش رو تم میری سب سے اہم خوشی بھی تھیں اور امتحان بھی، میں تمہارا شوہر ہوں مگر تمہاری نظر نے کبھی مجھے اس حالت میں قبول نہیں کیا۔

خوش رو میں نے روح و عشق کے تقاضے پورے کیے میری روح خوشی سے سرشار ہو کر میرے نفس کو چت گرا کر اس کی پیٹھ پر تھرکتی رہی۔

مگر یہاں کے آزاد ماحول میں آ کر مجھے محسوس ہوا تم نے مجھے بے حد محروم رکھا ہے کیا تم تھوڑی دیر کے لیے دانا و بینا انٹیلیکچوئل لڑکی سے ایک انجان والہڑ دلہن نہیں بن سکتی تھیں۔''

تمہاری نظر بڑوں کی نظر کیوں بن جاتی ہے، تم ایک استاد کی طرح مجھے کیوں برداشت کرتی رہیں، خوش رو، نفس بڑی طاقت ور چیز ہے گر کر بڑی جلدی اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے کچھ زندگی فطری تقاضے ہوتے ہیں اور تم ایک بند دروازہ ہو، دستک بھی دینے نہیں دیتیں۔ امکان وجدان کہتا ہے تمہاری نظر ایک دلہن کی نظر نہیں ہوگی محض ایک ٹیچر کی تنبیہہ ہوگی میں تمہاری پرستش ضرور کر سکوں گا چھو نہ سکوں گا، تم ضرورت سے زیادہ بزرگ نہیں ہو گئیں بلکہ از خود بن گئیں خوش رو......؟''

میں نے بہت سے قرض جو میرے وجود کے مجھ پر تھے چکانے کے لیے ایک بے وقوف سی غیر ملکی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ واپسی پر وہ میرے ساتھ ہوگی۔ ہم سب ایک گھر میں رہیں گے یہ احساس کس قدر خوش کن اور باعث طمانیت ہے کہ تم اس قدر اچھی ہو اور میری ہو۔

شاہ زمان!

عجب مرد شاہ زمان، اپنے ہی تقاضے یاد رہے تمہیں، کیسے بہادر ہو دنیا سے جیت سکتے ہو ایک عورت سے نہیں مجھے کس خوشی میں محروم رکھا ہے، اے خود غرض ملکیت پرست اور......اور ''احمق انسان'' ......وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ

دیکھ شہوار! مرد نہ آفیسر ہوتا ہے نہ سپروائزر زکمشنر نہ پروفیسر اپنی عورت کے لیے صرف مرد، مرد ہوتا ہے؟ کیا سمجھی؟'' وہ آنکھ دبا کر ہنس پڑی۔

''توبہ جیہ!'' شہوار کے چہرے پر گلال پھیل گیا۔''ایسی باتیں یوں منہ پھوڑ کر تو نہ بولا کر۔''

''ہائے میری انارکلی!'' جیہ اسے گدگدا کر ہنس پڑی۔

''نہ تے ہور کیہہ۔ تینوں اوہدی رسپیکٹ کرنی چاہدی اے۔ تیرے کول تے حیا ای مک گئی نی۔'' شہوار اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ تو جیہ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

''واہ، واہ سبحان اللہ کیا ملن ہے انگریزی اور پنجابی کا واہ واہ۔''

''ناں میں کیہڑی جگ توں نرالی گل کیتی اے؟ (میں نے کون سا زمانے سے الگ بات کی ہے؟) جے توں ہنس ہنس کملی ہون لگ پئی۔'' (جو تو ہنس ہنس کر پاگل ہو رہی ہے) تسی اردو وچ انگریزی بولدے تے کج نئیں ہوندا میں ذرا سی اردو بولدی تے

توں میرا مذاق اڑان لگ پئی۔“

جیہ کی سیدھی سادی کزن سچ مچ برا مان گئی۔ جیہ کو پھر ہنسی آ رہی تھی کیونکہ اب شہوار نے اردو پنجابی کا گٹھ جوڑ کیا تھا۔ مگر وہ ضبط کر گئی۔ اور اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

”ارے بابا! میں تو ایسی ہی پاگل ہوں خواہ مخواہ ہنس پڑتی ہوں۔ تمہاری باتیں تو میری جان ہیں۔ دیہات میں رہنے کی وجہ سے تمھیں خواہ مخواہ ہی کامپلیکس ہے۔ ہم سب میں کیوٹ ہو تم اور دیکھو نا۔ وسیم ٹھیک ہے ڈپٹی کمشنر ہیں مگر میرے کزن میرے منگیتر ہیں۔ میں نے ان کا نام لیا تو کہہ رہی ہو ان کی رسپیکٹ کرنا چاہیے۔ کرتی ہوں۔ بابا نام لینے میں کوئی قباحت نہیں ورنہ وسیم خود ہی مجھے ٹوک دیتے بھئی اگر وہ بڑے عہدے دار ہیں تو ان کے لیے جو ان کی فیلڈ میں ان سے متعلق ہیں ان کے ماتحت ہیں۔ جو عزت و توقیر میرا فرض ہے میں تو صرف وہ ہی کروں گی میں کیوں آؤں خواہ مخواہ ان کی ”کمشنری“ کے رعب میں انھیں میری عزت و توقیر کے ”ہم وزن“ لامحدود محبت بھی چاہیے۔ عزت و توقیر لوگ انھیں خود بخود دے دیتے ہیں۔ محبت تو صرف میں کروں گی ناں۔ سچی۔ دل کی گہرائیوں سے۔“

”بس کر۔“ شہوار نے جیہ کو چپ کرا دیا۔ ”تجھے تو بالکل شرم نہیں، کیسے پٹ پٹ وسیم بھائی کی باتیں کر رہی ہے۔ یہ محبت وحبت کی باتیں کسی نے سن لیں تو کیسا ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ توبہ توبہ۔“ شہوار نے سر پر پڑا آنچل مزید آگے کھینچا۔

”دیکھو شہوار! وہ کیا کسی نے کہا ہے۔ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔ وسیم کے رشتے کے سلسلے میں اگر بجو امی کو نہ بتاتی کہ میں اور وسیم ایک دوسرے کو......“

”ہائے میں مر جانواں۔ اللہ دی کسم؟“ (اللہ کی قسم) شہوار کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ایمان سے بھئی۔“ جیہ مزے لے کر کھلکھلائی۔

”ہائے جیہ شہر میں تو واقعی بڑی بے شرمی ہے۔ دادی ٹھیک آکھدی ہیں۔“

شہوار نے پھر اردو اور پنجابی کو گلے ملایا۔

”ہائے شہوار سچی دادی جان نے تو تجھے دو کوڑی کا نہیں رکھا۔“ جیہ سنجیدہ ہو گئی۔

”نہ بابا۔ میں نئیں بننا کوڑی ٹکے دا۔ میں ایتھے ای بھلی۔ میں نئیں تیرے ورگا بننا (میں نے تجھ جیسا نہیں بننا) ہور دسو کڑی نے آپ ای ماں پیو کولوں بر منگیا اے۔ توبہ ربا۔ توبہ۔“ (اور سنو لڑکی نے اپنے آپ ہی ماں باپ سے دلہا مانگا ہے) مارے شرم کے شہوار کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

جیہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”شہوار، تو چل گھر ذرا، تجھے بتاؤں گی شرم ورم۔“

جیہ اپنے والد کے ہمراہ دادی اور شہوار کو لینے پنجاب کے دور افتادہ گاؤں آئی ہوئی تھی۔ دادی کو سانس کی تکلیف ہو گئی تھی۔ جیہ کے والد ان کا شہر میں علاج کرانا چاہتے تھے۔

جیہ کے دادا کی پانچ اولادیں تھیں۔ وہ بیٹے رضا حسین، اور افتخار حسین۔ تین بیٹیاں۔ ثریا۔ رقیہ اور عطیہ رضا حسین اور ان کی بیگم اب دنیا میں نہیں تھے بلکہ جب شہوار چھ برس کی تھی تو دونوں آگے پیچھے گزر چکے تھے۔ شہوار کو دادی ہی نے پالا۔ آٹھویں جماعت تک باقاعدہ اسکول میں تعلیم حاصل کی پھر پرائیویٹ انٹر کروایا۔ بچوں کے ہزار کہنے پر بھی دادی سیدہ حجاب اختر اپنا گاؤں چھوڑنے پر راضی نہ ہوتیں نہ پوتی کو شہر بھیجنے پر۔ ماں تھیں زبردست ماں...... بچے اپنا کہنا نہ منوا سکے۔ صرف ثریا پھوپھی کے شوہر منسٹری آف ہیلتھ کے اعلیٰ عہدے دار تھے۔ باقی دونوں پھوپھا سگے بھائی بھی تھے اور مشترکہ بزنس تھا دونوں کا۔ دادی جان پوتی سمیت اپنے گھر اور زمینوں پر نگراں تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد ایک چوکس نگراں تھیں۔ اب زیادہ حالت خراب ہوئی تو وہ رضامند ہوئی تھیں۔

شہوار کے سارے ہی کپڑے ڈھیلے ڈھالے اور بے ڈھب تھے۔ مگر جیہ منع نہ

کر سکی مبادا وہ برا مان جائے۔ شہوار کم عقل تھی۔ اور کم عقل آدمی برا بہت مانتا ہے۔

درشہوار اپنے تمام کزنز میں سب سے حسین تھی۔ بال گھٹنوں کو چھوتے تھے۔ بے حد سادہ اور کم گو۔ مگر حد سے زیادہ احساس کمتری کا شکار تھی۔ اپنے ایڈوانس کزنز سے اسے خوف آتا تھا۔ ان کے رہن سہن سے اسے بے غیرتی کی بو آتی تھی۔ اس کا لہجہ دادی جان کا تھا۔ اس کی زبان دادی جان کی تھی۔ دادی اس کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھیں۔ اسے ان کی تقریروں کے تمام اقتباسات ازبر تھے۔

بڑوں کا احترام کرو۔ ان کی ہر بات بے چون و چرا مانو۔

سہیلیاں نہ بناؤ۔ یہ پکی لڑکیاں نیک لڑکیوں کو خراب کر دیتی ہیں۔

''عورت کے ہاتھ ہر وقت گھر گرہستی میں مصروف رہنا چاہئیں۔''

گھر کے اندر کوئی مرد ملازم نہ تھا۔ اسے دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھیتوں پر جانے کی ممانعت تھی۔

مرد کے سائے سے بھی بچو! خود غرض ہوتا مطلب پرست ہوتا ہے۔ اس کی نظر میلی ہوتی ہے۔

لڑکیوں کی عزت کو بٹہ لگ جائے تو بڑھے بیل سے بھی گئی گزری ہو جاتی ہیں۔ کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔

ڈھنگ سے چادر اوڑھ کر رکھا کر۔ عورت کے جوبن کو عورت کی نظر ہی کھا لیتی ہے۔

نامراد بال کس کے باندھا کر۔ نوکرانیاں بھی عورتیں ہیں۔ حسد سے خالی نہیں۔''

اس کا پور پور روم دادی کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ شہوار کی ماں بھی ان پڑھ عورت تھی۔ باپ نے بھی میٹرک کے بعد زمینداری سنبھال لی تھی۔ افتخار حسین قسمت کے دھنی تھے۔ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ شادی بھی پسند سے کی تھی۔ اور افتخار حسین کا

دام تھا کہ ان کی بہنیں بھی تعلیم یافتہ شائستہ گھرانوں میں بیاہی گئیں۔ دادی جان آمر نہیں تھیں۔ جس حال میں جس نے رہنا چاہا انھوں نے منع نہیں کیا۔ مگر خود گاؤں چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئیں۔ وہ پوتی جو انصار حسین کو شادی کے نو سال بعد ملی تھی دادی کو بے حد عزیز تھی۔

شہر کا ماحول انھیں ناپسند تھا وہ افتخار حسین اور اس کی بیگم سے صاف کہہ دیتی تھیں۔ مجھے نہیں بھاتا تمہارے گھر کا چلن کوئی لڑکی مجال ہے جو سر پر دوپٹہ اوڑھ لے۔ بیٹیوں سے وہ شاکی تھیں جو شہر کے رنگ میں رنگ چکی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان سے کوئی بڑی غلطی ہو گئی جس کا بھگتان وہ آزار خیال خاندان کی صورت میں بھگت رہی تھیں۔

مگر اب ان کی حالت تشویش ناک تھی تو انھیں مجبوراً آنا پڑا۔

بیگم افتخار نے بچوں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ دادی کے سامنے ان کی پسند کے مطابق رہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ساس یہاں سے بیزار ہو کر جائیں۔

کراچی سب کو اطلاع تھی کہ دادی جان محترمہ فلاں تاریخ کو قدم رنجہ فرما رہی ہیں۔ سو افتخار حسین کے ہاں ان کے بچوں کے علاوہ تینوں بہنیں مع اپنی اولادوں کے موجود تھیں۔ لڑکیاں سروں پر دوپٹہ اوڑھے ایک دوسرے کی سمت شرارت سے دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

ثریا پھوپھو کے دو بیٹے تھے۔ حماد، اور عمار۔ رقیہ پھوپھو کے دو بیٹیاں حنا اور ہما ایک بیٹا حسان تھا۔ عطیہ پھوپھو کی صرف ایک بیٹی عالیہ تھی۔ اس وقت تمام کزنز نے ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ڈرائیور ائیر پورٹ گیا ہوا تھا۔ وہ سب اوپر بالکنی میں کھڑے تھے۔

''ارے یہ جیہ تو دیکھنا بارہ من کی دھوبن بن کر آئے گی بچی۔ بہت صحت افزا مقام ہے۔'' ہما نے باہر دیکھتے ہوئے رائے زنی کی۔

"اور اپنے کمشنر صاحب جمیل صاحب کے سر پر دے ماریں گے۔ بارہ من کی دھوبن کو۔ آخر جمیل بھائی ہی تو اس کے بڑے اور سگے بھائی ہیں۔" جمیل بھائی مسکرائے۔ سب ہنس پڑے۔

"ارے وہ اپنی "مٹیار" بھی تو ساتھ ہو گی۔ جیہ اور عالیہ تو کئی مرتبہ گاؤں جا چکی ہیں۔ ان کے مزے ہیں۔ سات سال پہلے جب امی کے ساتھ ہم سب گئے تھے تو وہ شہوار بالکل کشمیرن لگتی تھی۔ اب پتہ نہیں کیسی ہو گی؟" حنا نے بھی لب کشائی کی۔

"ممانی جان (بیگم ساجدہ افتخار) کہہ رہی تھیں، شہوار تو بالکل سیدھی اور ڈرپوک قسم کی ہے۔" ہما نے اطلاع بہم پہنچائی۔

"اللہ! کب آئیں گے یہ لوگ، کم بخت جیہ گاڑی کے دروازے میں نہ پھنس گئی ہو!" عالیہ کو دھڑکا لگا تھا۔

"ارے اب اپیا پندرہ دن میں اتنی موٹی بھی نہیں ہو گئی ہوں گی۔" جیہ اور جمیل سے چھوٹی گڑیا نے قدرے برا مان کر کہا۔

اسی دم سفید ٹیوٹا کرولا گیٹ میں داخل ہوئی۔ سب دھڑ دھڑ کرتے نیچے اترے لڑکوں نے شطرنج کی بساط الٹ دی۔

دادی جان سب کے سروں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ جیہ سرخ تمتماتے رُخساروں کے ساتھ بے حد خوش تھی۔ سیاہ پیلن لیلن کی اجرک میں شہوار جیہ کے بازوؤں میں کانپ رہی تھی۔ جس طرح لڑکے کھڑے تھے اس طرف سے اس نے رخ موڑ لیا تھا۔ سب بے ساختہ مسکرا دیئے مگر جیہ نے دادی جان کی سمت اشارہ کر کے چپ رہنے کو کہا۔

"ارے بیٹی! یہ تو سب تمہارے بہن بھائی ہیں ان سے کیا شرمانا ان سے ملو۔ دیکھو تمہارا کتنا انتظار کر رہے تھے۔ یہ لوگ۔" ساجد بیگم نے پیار سے اس کا رخ سب کی سمت موڑا۔ اور سب کے حواسوں پر بجلی سی گر پڑی۔ سیاہ اجرک کے ہالے میں سرخ و

سفید صحت مند چہرہ بے حد سادہ تھا۔ قدرتی سرخ ہونٹ تراشیدہ جو کسی آرٹسٹ کی بڑی چاہ سے بنائی ہوئی تصویر پر ملتے ہیں۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح جڑے تھے۔

"اوہ گاڈ!" لڑکیاں بے ساختہ بولیں۔

"آؤ بیٹی۔" ساجدہ بیگم نے اسے تھاما اور تعارف کرانے لگیں۔ "یہ تمہاری ثریا پھوپھو کے بیٹے ہیں تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ حماد اور عمار۔ یہ تمہاری رقیہ پھوپھو کی لڑکیاں ہیں حنا اور ہما اور یہ ان سے بڑا احسان۔ یہ تمہاری عطیہ پھوپھی کی بیٹی عالیہ اس سے تم پہلے بھی مل چکی ہو۔ گئی تھی ناں یہ گاؤں؟"

اور شہوار سے اثبات میں سر ہلانا دوبھر ہو رہا تھا اسے تو اپنی الٹرا ماڈرن کزنز کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی تھی۔ جیہ تو ان کے مقابلے میں بے حد سادہ تھی۔ اس پر مستزاد اس کے شیر جوان بے حد شاندار کزنز جو زیر لب مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ پھوپھیاں دادی جان کو اندر لے جا چکی تھیں۔ جیہ اور دوسری کزنز کے جلو میں وہ کمرے میں آئی۔ جیہ نے اشارے سے جمیل بھائی وغیرہ کو منع کر دیا تھاے وہ ان کی طرف نہ آئیں۔

وہ سب بے حد حیران تھے۔ سب کی شوخیوں کو قفل لگ گئے تھے۔

"بھئی اب تم یہ اپنا شیامیانہ اُتار دو، کہو تو ان سب کی آنکھیں بند کرا دوں۔" جیہ ہنسی۔

شہوار جھینپ گئی اور اجرک اتار دی۔ ڈھیلے ڈھالے ریشمی عنابی لباس اور ڈھیلی ڈھالی دو خوبصورت چوٹیوں میں وہ اس قدر دلکش نظر آ رہی تھی کہ ان کے دلوں میں اتراہٹ ہونے لگی یہ ان کی کزن ہے۔ یہ ان کی بہن ہے۔

عالیہ نے بے ساختہ اس کا رخسار چوم لیا۔ "اوہ شہوار تم تو اور زیادہ حسین ہو گئی ہو۔ کہیں نظر نہ لگ جائے۔"

"ماشااللہ تو کہہ دو۔" جیہ نے ٹوکا تو گڑیا سمیت سب نے کورس کے انداز میں ماشااللہ کہا۔ شہوار ہنس پڑی۔ "تسی وی تے ساریاں ای واوا ہو" (تم سب بھی پیاری ہو)

ان سب نے جیہ کی سمت دیکھا پریشان ہو کر۔

ارے بھئی، گھبراؤ مت، ہماری شہوار اردو بھی بول لیتی ہے بڑی حد تک انگریزی بھی بے چاری کی وہاں کوئی سہیلی تو ہے نہیں نوکرانیوں سے پنجابی بولنا پڑتی ہے۔ اس لیے اسے اور دادی جان کو پنجابی بولنے کی عادت ہے۔ روانی میں ہوتی ہے تو بول جاتی ہے وگرنہ اچھی خاصی اردو بولتی ہے۔"

شہوار کو تو بے حد مصروف رہنے کی عادت تھی۔ یہاں لڑکیاں صبح سات بجے تک سوتی رہتی تھیں۔

وہ فجر کے وقت بیدار ہو کر نماز و تلاوت میں مصروف ہو جاتی پھر ڈسٹر اٹھا کر سارے گھر کی کھڑکیاں، دروازے، گرل، شیشے، رملنگ صاف کرتی۔ ڈرائنگ روم کی آرائشی چیزیں صاف کرتی۔ بند کمروں اور ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں دروازے کھولتی۔ پردے۔ سرکا دیتی کہ کمروں میں تازہ دھوپ اور ہوا آنی چاہیے۔ پھر رات کو جمائی ہوئی دہی بلوتی لسی بناتی، ایک گلاس خانساماں کو دیتی اور دو گلاس خود پیتی۔ اور نکالے گئے چھٹانک آدھی چھٹانک مکھن سے ناشتہ کرتی۔ سب کے ساتھ مل کر۔ خانساماں کے ساتھ پراٹھے بھی بنواتی تھی۔ دادی جان کو دودھ سے ناشتہ کراتی تھی۔ یہاں آتے ہی سب سے پہلے دادی جان نے دودھ کا انتظام کرایا تھا۔ وہ دودھ پیتی تھی اور پوتی لسی۔

ایک دو دن تو اس نے کوکر میں پکا گوشت کھایا تیسرے دن خود کچن پہنچ گئی۔

"تسیں گوشت کسراں پکاؤندے او۔" (تم گوشت کس طرح پکاتے ہو؟)

"جی!" خانساماں گھگھیایا۔

"اوفوہ! گوشت کیسے پکاتے، ہیں آپ؟" جھنجلا کر بولی۔ اپنی دانست میں

شائستہ اردو بولی تھی۔

"کوکر میں۔" خانساماں نے کوکر کی جانب اشارہ کیا۔ جو جلتے چولہے پر چڑھا تھا اور ویٹ ہل رہا تھا۔

"ساری چیزیں یعنی لہسن ادرک پیاز ثابت اس میں ڈال کر بند کر دیتا ہوں۔ پندرہ منٹ تک گل جاتا ہے۔"

"اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے۔؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ "آپ عرصے سے کھانا پکا رہے ہوں گے۔ اور جانتے ہوں گے کہ گوشت دال، کڑھی جتنی دیر اور آہستہ آنچ میں پکتے ہیں اتنے ہی ذائقے دار ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو جلدی ہی ہوتی ہے اور کوکر میں پکانا ہوتا ہے تو صرف پیاز نمک مرچ، دھنیا وغیرہ ڈال کر بند کر دیا کریں۔ اور ادرک لہسن ٹماٹر بھونتے ہوئے ڈالا کریں۔ تب وہ عجیب سی مہک نہیں آئے گی۔ ادرک لہسن کو پیس کر ڈالا کریں۔"

نہایت شائستگی سے خانساماں کو بتا کر پلٹی تو ساجدہ بیگم خفیف سی کھڑی نظر آئیں۔ یہ لڑکی تو ان کی لڑکیوں پر ایک طرف ان پر بھی امور خانہ داری میں فوقیت رکھتی تھی۔

"کیا ہوا چچی؟" وہ انھیں اپنی طرف دیکھتا پا کر بوکھلائی۔

"کچھ نہیں بیٹی! ماشااللہ! خدا نے صورت سیرت، ہنر ہر چیز سے نوازا ہ۔۔ خدا معلوم کسی بخت آور کا نصیب بن کر آئی ہو، دنیا میں۔" انھوں نے اس کی پیشانی چومی۔ تو وہ شرما گئی۔

بڑی مشکلوں سے وہ تھوڑی بہت ایڈجسٹ ہوئی تھی۔ اور سب کے سامنے بیٹھنے لگی تھی کہ پھر بکھر گئی۔ دادی جان اسے بیٹے کے سپرد کر کے مکان ابدی میں جا بسیں۔ تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس کی تو ماں باپ دادی جان ہی تھیں۔

اس نے یہ صدمہ اتنا دل پر لیا کہ مہینوں تک گم صم رہی۔

چچا چچی نے اس کا اپنی اولاد سے بڑھ کر خیال رکھا۔ لمحہ لمحہ اسے شفقت و محبت سے نوازا۔ بعض لوگ ہوتے ہی اتنے پیارے ہیں کہ بے ساختہ محبت دینے کو جی چاہتا ہے۔

اس دن چھٹی تھی سب عطیہ پھوپھو کے ہاں تھے۔ عالیہ ایک کونے میں بیٹھی ایک ہفت روزہ دیکھتے ہوئے بول اٹھی۔

''شہوار تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے۔؟''

''ہو گیا اسے اسٹار خولیہ!'' حسان نے چڑایا۔

''بکتے رہو۔ بتاؤ ناں شہوار تم سے پوچھ رہی ہوں۔؟'' وہ مصر ہوئی۔

''میرے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں 5 اگست لکھی ہے۔''

''اوہ خدایا۔!'' عالیہ خوشی سے چیختی ہوئی بولی ''(Leo) شیر۔''

''ارے لیو عورتیں بے حد حسین اور سحر انگیز ہوتی ہیں۔ اگر شوہر من پسند ہو تو اپنا آپ مٹا ڈالتی ہیں۔ حتیٰ کہ برفیلی سردیوں میں صبح صبح اٹھ کر اپنے شوہر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ ان کی شادی عموماً مال دار گھرانوں میں ہوتی ہے۔''

شہوار کا برا حال تھا۔ کبھی پٹر پٹر پڑھتی عالیہ کو دیکھتی، کبھی انتہائی محو سامعین کو۔

''گھر کو بے حد آرٹسٹک بناتی ہیں۔ عموماً مغرور بھی ہوتی ہیں۔''

''کیوں بھئی اپنی شہوار مغرور ہے کیا؟'' عالیہ نے اخبار سے سر اٹھا کر کہا۔ اور سب کو دیکھا۔

''توبہ جی میں نے جہنم میں جانا ہے غرور کر کے۔'' شہوار نے بے ساختہ کہا تو سب بے ساختہ ہنس دیے۔

جیہ نے اسے ڈھیروں خوبصورت رنگوں کے قیمتی، سوتی، ریشمی شلوار سوٹ سلوا کر دیے۔ شہوار کو بے حد پسند بھی آئے مگر ٹائٹ قمیضوں سے اس کی کمر کا خم بے حد

نمایاں ہو جاتا۔ تو وہ دوپٹہ پورے وجود پر پھیلا لیتی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا جیہ اسے لباس تبدیل کرنے کو کہہ کر باہر نکل آتی کمرے سے۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں جاتی تو سر پیٹ کر رہ جاتی۔ کہ موصوفہ سوئی ہاتھ میں پکڑے بے حد اسٹائلش قمیض کے گلے کو آگے کی جانب سے پکڑے دو تین چنیں دے کر کھونپیں'' بھر رہی ہیں۔

''بھئی یہ کیا کر رہی ہو؟''

''گلا بڑا ہے یہ۔ دادی منع کرتی تھیں بڑا گلا پہننے سے۔'' سادگی سے جواب ملتا۔

''اوہ ابا کہاں بڑا ہے گلا؟ بالکل نارمل ہے۔'' وہ جھلا جاتی۔

''نہیں، بعض دفعہ سلائی کرتے ہوئے، جھاڑو دیتے ہوئے جھکنا پڑتا ہے۔ بھائی بندوں کا گھر ہے۔'' شہوار قطعیت سے اپنی بات کہتی۔

''تمہیں یہاں کس کی ''جہیز بریاں'' سینے کو کہا جا رہا ہے یا جھاڑو لگانے کو کہہ کر کون ''مہترانی کی پوسٹ'' دے رہا ہے۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیڈ پر بیٹھ جاتی۔ اتنی شاندار قمیض کا یہ حال دیکھ کر۔ اس کی یہی عادات دیکھ اس کی تمام کزنز جیہ کو شاباش دیتی تھیں جس نے اسے تھوڑا بہت تبدیل کر کے معرکہ کیا تھا۔ جیہ منہ پھلا کر بیٹھ جاتی تو شہوار کی جان کانپ جاتی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے اس کے گھٹنے چھو کر کہتی۔

''جیہ میری بہن! ناراض مت ہو۔ تم ناراض ہوتی ہو تو لگتا ہے میں بالکل اکیلی ہوں۔''

جیہ کا دل کٹ کے رہ جاتا۔

''زندگی۔'' جیہ اس کی روتی آنکھیں چوم لیتی۔ وہ اس سے دو برس بڑی تھی اس لیے شہوار پر بڑائی کا رعب بھی جما لیتی تھی۔

''شہوار! تو یہ کیوں سوچتی ہے کہ ہم تیرا برا چاہتے ہیں؟''

"مجھے ان چیزوں کی عادت نہیں ہے ناں!"

"بھئی عادت ڈالو ناں! اب ہم تیرا بیاہ شہر میں کسی بڑے آدمی سے کریں گے۔ اگر تو نے میرا کہنا نہ مانا تو دیکھنا تیرا میاں تجھے چار چوٹ کی مار مار کر سیدھا کرے گا۔"

شہوار کی آنکھیں پھیل جاتیں۔ "کیا پڑھے لکھے شہری مرد؟"

"ارے یہ شہری مرد سب سے زیادہ جنگلی ہوتے ہیں بڑے نخرے ہوتے ہیں ان کے شہوار ایک بات بتائے گی؟"

"ہوں!"

"بتا، تیرا شوہر کیسا ہونا چاہیے۔ یعنی تجھے کیسے لوگ پسند ہیں؟"

"ہائے توبہ" شہوار شہابی ہوگئی۔ "میرے یا تمہارے کہنے سے کیا ہوگا۔ سنجوک تو آسمان پر بنتے ہیں۔ اللہ کے کاموں میں بھلائی ہوتی ہے۔ بندوں کی کیا دخل۔؟"

"نہیں پھر بھی بتا تو سہی ہم تیرا آرڈر آسمانوں پر بھجوا دیں گے۔" شہوار کھلکھلا اٹھی۔ "توبہ!"

"شہوار! رقیہ پھوپھو کے حسان کیسے ہیں؟ تجھے کیسے لگتے ہیں؟"

"نہیں۔ نہیں۔" شہوار نہیں نہیں کہنے پر شرمندہ بیٹھی تھی۔

"بول شہوار!"

مگر واں ایک خاموشی سب کے جواب میں۔

"تجھے میری جان کی قسم، بتا ناں۔"

"وہ جی، بڑے چپ چپ رہتے ہیں۔ مجھے چپ رہنے والے آدمی سے ڈر لگتا ہے ایسے آدمی کا غصہ تیز ہوتا ہے۔"

"اے میری ماہر نفسیات۔ یہ پٹی تجھے کس نے پڑھائی؟" جیہ ہنسی ضبط کر کے بولی۔

شہوار نے مسکرا کر چہرہ جھکا لیا۔ "بس جی، کہہ جو دیا نہیں۔"

جیہ کو حیرانی نہیں ہوئی۔ ایسی دبی و بائی سی لڑکی کا صاف جواب سن کر کیونکہ وہ شہوار کا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ لڑکیاں بزدل ہوں یا بہادر سوچیں، امنگیں، تمنائیں ایک سی رکھتی ہیں لڑکیاں تو ایک سی ہوتی ہیں سب۔ بزدلی و جرأت مندی بس انھیں درجوں میں بانٹ دیتی ہے۔ جیہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"اچھا، تجھے جان محفل قسم کے لوگ پسند ہیں۔ ہنستے مسکراتے؟" شہوار چپ رہی۔

"بول ناں، مجھ سے کیا پردہ۔ تو تو میری سکھی، بہن، دمساز ہے۔"

"ہاں جیہ! مجھے وہ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو بہت بہادر ہوتے ہیں جو دل میں ہوتا ہے صاف بول جاتے ہیں۔ سچ بولتے ہوئے ذرا نہیں ڈرتے۔ جنھیں کسی کے برا مان جانے کا خوف نہیں ہوتا۔ جن سے سب محبت کرتے ہیں۔ جب وہ محفل میں بیٹھیں تو بس وہی وہ نظر آئیں۔"

"کون؟" جیہ نے شرارت سے ٹوکا۔

شہوار خود فراموشی کی کیفیت سے نکل آئی اور شرما سی گئی۔

جیہ کر تو بین الاقوامی تعلقات میں رہی تھی ایم۔ اے مگر سلجھی ہوئی ذہین لڑکی تھی۔ سمجھ گئی کہ اس کی اپنی عادات و اطوار سے گھٹن کا شکار رکھتی ہے۔ اپنے شوہر کو وہ اپنا برخلاف دیکھنا چاہتی تھی۔

"جیہ!"

"ہوں؟"

"کمشنر صاحب......"

"شہوار کی بچی! وسیم بھائی کہہ دیا کر کیا کمشنر صاحب کرتی رہتی ہے۔" جیہ نے جھلا کر ٹوکا۔

"ہاں۔ وسیم بھائی تمھیں ملے کہاں سے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ایسے ہی ایک دن کالج جا رہی تھی کہ میرے پاؤں کے نیچے آ گئے میں نے اٹھا کر پرس میں رکھ لیا۔"

اور شہوار کے شنگرفی ہونٹوں سے کرنیں پھوٹ نکلیں۔ "نہیں میرا مطلب یہ ہے۔"

"وہ تو مجھے بھی پتہ ہے تیرا مطلب کیا ہے تجھے یوں کہنا چاہیے تھا تم لوگ کب ملے کہاں ملے۔ کہاں سے نہیں وہ کوئی دال چاول یا باجرے کا دانہ تھا۔ یا کوئی مسروقہ گھڑی۔" جیہ خود ہی ہنس پڑی۔ بھئی پڑوسی میں ہمارے دو بہنیں شادی شدہ ہیں اور انگلستان میں ہیں بڑے بھائی پشاور میں رہتے ہیں جہاں میری ساس آج کل گئی ہوئی ہیں اور ہمارے ڈپٹی کمشنر صاحب اندرون سندھ کام سے گئے ہوئے ہیں۔ بڑے سوبر بہت گریس فل ہیں۔ پورے نو سال بڑے ہیں مجھ سے۔ بھئی مجھے تو بارعب وسوبر لوگ بہت اپیل کرتے ہیں۔ بس دیکھتے ہی دل دے دیا...... آنے والے ہیں مل لینا۔"

"تم پردہ کرتی ہو؟" پھر معصوم سوال آیا۔

"پردہ، ہاں بڑا زبردست وہ ہماری برتن دھونے والی مائی جیراں ہے ناں اس کے جیسا خیمہ سلوا کر رکھ چھوڑا ہے جب وہ آتے ہیں تو وہ جالی لگا خیمہ اوڑھ کر انھیں چائے پیش کرتی ہوں ان سے دل کی باتیں کرتی ہوں۔ بہت بڑا ہے میرا خیمہ تمہاری سے بھی بڑا اس بار وسیم صاحب آئیں تو تم بھی گھس جانا میرے خیمے میں چھپ کر ہماری باتیں سن لینا۔ کچھ تجربہ ہو گا جو آگے کام آئے گا۔"

شہوار جو بڑی سنجیدگی سے اس کی باتیں سن رہی تھی آخری جملوں پر چونکی۔ پھر برا مان کر بولی۔

"کیا میں بے وقوف ہوں جو تم مجھ سے اس طرح مذاق کرتی ہو، میں تو سنجیدگی سے باتیں کر رہی تھی۔"

"ارے نہیں میری الہڑ مٹیارے! تو تو بے حد عقل مند ہے دانا و بینا۔"

اس نے اسے اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ مسکرا دی۔

ایڈجسٹمنٹ کافی ہو چکی تھی۔ جمیل بھائی کی شادی نزدیک آ رہی تھی گھر میں رونق رہنے لگی تھی۔ خرید و فروخت و لباس سازی کی وجہ سے۔

انھی دنوں میں یونیورسٹی میں فائنل کے اسٹوڈنٹ نے عید ملن پارٹی کے عنوان سے ایک خوبصورت تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ تب جیہ نے عالیہ، ہما وغیرہ کو بھی چلنے کو کہا۔ وہ جنرل سیکرٹری تھی، انتظامیہ میں کافی پاورفل تھی جانے کس کس کو گھسیٹ کر یونیورسٹی لے جا رہی تھی۔ مگر شہوار نے صاف انکار کر دیا کہ وہ نہیں جائے گی۔ وہ چادر پہن کر جائے گی سب مذاق اڑائیں گے۔

"ارے بابا! کوئی مذاق نہیں اڑاتا۔ یونیورسٹی میں تو لڑکیاں برقع پہن کر بھی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔"

"وہ لوگ انگریزی میں باتیں کرتے ہوں گے، مجھے اچھی طرح انگریزی نہیں آتی۔"

"شہوار کی بچی! میں تجھے خطابت کے لیے نہیں لے جا رہی بچی بڑے اچھے اچھے فنکار آئیں گے۔ بے حد مشہور گلوکار وغیرہ اور وہ جو پرسوں ڈرامے میں ہیرو تھا جیسے عالیہ وغیرہ بہت پسند کر رہی تھیں میرا کلاس فیلو ہے۔ کاش شہوار! تجھے اپنی قدر معلوم ہو جائے پھر تو شاید تو اور کونفیڈنس ہو جائے وہ جو نیا براؤن سوٹ ہے سلکی۔ وہ پہننا۔"

"چلے گی ناں۔"

حنا، ہما، عالیہ، صبح سے آ گئی تھیں۔ شہوار اور گڑیا جیہ کے ماتحت تھیں۔ اور شہوار کے مرمر سے بدن پر براؤن سوٹ جچتا دیکھ کر گویا جیہ کو جوش سا چڑھ گیا۔ اس کی دونوں چوٹیوں میں سفید موتی ڈالے۔ کانوں میں سفید نگوں کے آویزے پہنائے "بے کار ہے اپیا! یہ کون سا اپنا شامیانہ اتاریں گی۔" گڑیا نے مایوسی سے کہا۔

"ارے نہیں، ہمارا کہنا مانے گی۔ ہم تو لڑکیوں میں بیٹھیں گے ناں۔"

اس نے شہوار کو گھبراتے دیکھ کر تسلی دی، شہوار کے ہونٹ تو قدرتی سرخ تھے، لپ اسٹک لگانے پر وہ راضی نہ تھی۔ تب عالیہ نے لپ گلوز ہونٹوں پر لگا کر شہوار کو جانے کیا بنا دیا۔

ہونٹ چمک کر اتنے قاتل ہو گئے تھے کہ جیہ نے نظریں چرالیں مبادا نظر لگ جائے آج پہلی مرتبہ انھوں نے شہوار کا ہلکا سا سنگھار کیا تھا۔

انتہائی متناسب گداز بدن۔ خوبصورت تراشیدہ لباس سینے پر پڑی دو چوٹیاں آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل چمکتے ہونٹ اس پر بے ساختہ مسکراہٹ۔

"ہائے شہوار! تجھے تو ہم کبھی باہر نہ جانے دیں گے جمیل بھائی تو بندھ چکے ہیں، حماد، عمار، حسان بھائی کسی کے لیے بھی کیوں عالیہ باجی؟" حنا نے پوچھا۔

"نیک خیال ہے! کسی نیک ساعت خیال کو عمل بنا دیں گے۔" عالیہ نے بوڑھوں کے اسٹائل میں کہا۔

ہنستا مسکراتا قافلہ کراچی یونیورسٹی کی جانب روانہ ہوا۔ ڈرائیونگ جیہ کر رہی تھی شہوار اس کے پہلو میں تھی سیاہ چادر میں چاند چہرہ سجے سجائے پیکر پر حاوی تھا۔

یونیورسٹی میں جیہ بے حد پاپولر تھی ہر سمت وجیہہ، مس وجیہہ افتخار کی پکار تھی۔

ڈھیر سارے لوگوں سے جیہ ان سب کا تعارف کرایا۔ ان میں لڑکے بھی تھے لڑکیاں بھی اساتذہ بھی، ایک شخص کو دیکھ کر عالیہ وغیرہ بے تحاشہ خوش ہو گئیں۔

"ہائے اصفہان قاضی!" سیاہ ڈنر سوٹ اور سرخ ٹائی میں بے حد شاندار مگر بے اندازہ مصروف سا، بڑا اکڑتا دھرتا سا نظر آ رہا تھا۔

"اے فانی!" جیہ نے آواز دی۔

"فانی......؟" عالیہ حنا وغیرہ کے نام پر حیرت ہوئی اصفہان نوٹ کر چکا تھا۔

"انسان سمیت ہر شے فانی ہے گرلز۔ وجیہہ غالباً یہ آپ کی سٹرز۔"

بڑا بے تکلفانہ انداز تھا۔ اتنے مقبول اداکار کو اپنے سامنے دیکھ کر گڑیا بڑی ایکسائیٹڈ تھی۔

"غالباً نہیں حقیقتاً۔" پھر جیہ نے تعارف کرایا۔ اصفہان عین شہوار کے سامنے ڈٹا کھڑا تھا۔ مارے بوکھلاہٹ وحجاب کے وہ بے وقوفانہ انداز میں دائیں بائیں دیکھنے لگی تھی۔ بھلا یہ نمایاں انداز کیوں کر چھپتا۔ اس نے سرسری دیکھا پھر دیکھا۔ غور سے دیکھا۔ ٹھٹھک کر دیکھا۔

"یہ آپ کی حقیقی بہن ہیں، چھوٹی ہیں؟"

مرد کی نظر بے حجاب تو ہوتی ہے، بے باکی سے جم جائے تو بولڈ سے بولڈ لڑکی بوکھلا جاتی ہے۔ اور وہ تو تھی پکی دیہاتن جس نے پڑھ کر بھی گدھے پر لادا تھا۔ اپنے آپ کو موضوع بنتا دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے اور جیہ کے پیچھے ہو گئی۔

"ارے اصفہان! یہ میری فرسٹ کزن ہے، بڑی پیاری، بے حد سادہ۔ بات وات نہیں کرے گی تم سے درشہوار نام ہے کیا سمجھے؟" جیہ حسب عادت کھلکھلائی۔

پھر اصفہان کہیں بھی کھڑا ہوا کہیں بھی گیا بس اسے دیکھا۔ جیہ نے اپنی ناراضگی کی دھونس دے کر اس کی اجرک تہہ کر کے گاڑی میں رکھ دی تھی۔ وہ جدھر سے گزری، سب نے بے ساختہ دیکھا۔ بار بار دیکھا۔ اس کی بہنوں کو انجانے میں فخر کا سا احساس کئی بار ہوا۔

جیہ تو جانے کہاں غائب ہو گئی۔ انھیں جہاں جگہ ملی بیٹھ گئیں۔ پروگرام موسیقی کا شروع ہونے والا تھا۔ پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک بے حد مقبول گلوکار نے غزل چھیڑی تو سماں بندھ گیا۔ اسی محویت کے عالم میں اس نے سنا، کوئی کہہ رہا تھا۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ بیٹھنے کے اسٹائل میں جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔

گڑیا اصفہان کا نوٹس لے چکی تھی فوراً بولی۔ بیٹھ جائیے۔"

شہوار کے بالکل ساتھ تھا اس کا دھیان گلوکار کی طرف سے بالکل ہٹ گیا۔ وہ

بہت بوکھلا رہی تھی۔ اور یہ سب کچھ اصفہان کی نگاہ میں تھا۔ بلکہ زیر لب مسکرا بھی رہا تھا۔ دن رات لڑکیوں میں رہنے والے کو اس صنف کی بڑی پرکھ تھی۔

''کیا میں سگریٹ سلگا لوں؟'' وہ نہایت مہذبانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''مجھے کیا پتہ۔'' اس کے لہجے میں تھوڑی ناگواری شامل ہو گئی۔ مگر عالیہ گڑیا وغیرہ جو اس کی زبردست فیتر تھیں اس کی طرف متوجہ تھیں۔

''شوق سے۔'' آخر عالیہ نے کہا۔

گلوکار نے فیض کی غزل چھیڑ دی تھی۔ بے حد حسین دھن میں۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

عجیب سیراب سا شخص تھا۔ بھرپور مہکا مہکا گمبھیر سگریٹ و پرفیوم کی مہک شہوار کے اعصاب ہلا رہی تھی۔ بعض اوقات پہلو بدلنے سے اس کی سانس بھی شہوار کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی، شہوار کی اپنی سانسیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔ اس نے سر پر دوپٹہ کھینچا تو چوڑیاں بج اٹھیں۔

''پڑھتی ہیں آپ؟'' بے حد آہستگی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' (اسے کیا پڑھوں نہ پڑھوں؟)

''کہاں رہتی ہیں؟'' اس نے اپنی بھاری مخمور آواز میں سوال داغا تو شہوار کی جی چاہا اٹھ کر بھاگ جائے۔

''وہ جی جیہ کے گھر۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''جیہ۔؟ آپ کا مطلب وجیہ افتخار۔''

''ہوں!'' شہوار نے سر ہلایا۔ تو اسے بھی ترس آ گیا۔ گلوکار فیض کے مشہور شعر پر آ چکا تھا۔

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہے لگا دو ڈر کیسا؟
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

''واہ!'' کئی بلکہ ڈھیروں بے ساختہ واہ واہ میں اصفہان کی واہ بھی شامل تھی۔

رات کافی ہو رہی تھی۔ عالیہ وغیرہ اٹھ کھڑی ہوئیں ادھورا پروگرام چھوڑ کر۔ پنڈال سے باہر آ کر کھڑے ہی ہوئے تھے جیہ کو پھر کوئی بلا لے گیا۔

وہ کاریڈور میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ گڑیا اور ہما گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ عالیہ اور حنا اس سے آگے کھڑی ہوئی تھیں کہ جیہ کی سہیلی کہیں سے آ نکلی اور ان سے باتیں کرنے لگی۔

''آپ بڑی جلدی اٹھ آئیں؟'' اصفہان کی آواز پر اس کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ (یہ یہاں بھی آ گیا)

''کل رات میں آپ کو فون کروں گا بارہ بجے کے بعد۔ وجیہہ کا فون نمبر میرے پاس ہے، آپ کو فون ریسیور کرنا ہوگا۔ ورنہ تمام رات گھنٹی بجے گی۔''

شہوار کا دل بیٹھ گیا۔ وہ بھاگنے کے انداز میں عالیہ وغیرہ کو بتائے بغیر گاڑی کی سمت چلی آئی اور پھر بالکل وہی گم صم...... بالکل خاموش سی ہو گئی۔

☆☆☆

اگلے روز جیہ نے اس سے ساڑھے گیارہ بجے تک باتیں کیں وہ حاضر غائب کی کیفیت میں رہی۔ جیہ نے لائٹ بجھائی اور وہ کم عقل نمایاں طور پر بے چین رہی۔ جیہ نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ پھر سوتی بن گئی۔ شہوار نے پھر تھوڑی دیر اس کا تنفس نوٹ کیا پھر دبے پاؤں بغیر سلیپر کے لابی میں چلی آئی۔

جیسے ہی گھنٹی بجی اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

ماؤتھ پیس میں بولی۔ ''جی؟''

''در شہوار؟'' اصفہان کی آواز تھی۔

''دیکھیں جی! میرے حال پر رحم کریں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ سوائے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ارے۔ ارے۔ او کے۔ آج آپ رولیں کل میں اسی وقت پھر فون کروں گا۔" ادھر سے فون رکھ دیا گیا۔ اور شہوار وہیں زمین پر بیٹھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ کیا بلا ہے یہ؟

جیہ نے سب دیکھا مگر شرارتاً چپ رہی۔ حالانکہ اسے روتا دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ سینے سے لگا لے مگر وہ تجسس میں تھی کہ شہوار کا اگلا قدم کیا ہوگا۔

دوسری رات جیہ ذرا جلدی سو گئی۔ شہوار بارہ بجنے سے کچھ پہلے کمرے سے نکل گئی۔

گھنٹی بجتے ہی شہوار نے ریسیور اٹھا لیا۔ کپکپاتی آواز میں بولی۔

"جی!"

"در شہوار؟"

"جی۔؟"

"خدا کے لیے رونے سے پہلے بات سن لیجیے۔"

"جی؟"

"آپ کس دیس سے آئی ہیں؟ یعنی آپ کے والدین کہاں رہتے ہیں اگر کوئی ان سے ملنا چاہے تو کہاں ملے۔؟"

"میرے والدین نہیں ہیں۔ اس لیے آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔"

"اتنی آسانی سے۔ پاگل کر کے رکھ دیا ہے آپ نے مجھے۔"

"دیکھیں جی مجھ بے بس پر رحم کریں ورنہ میں جیہ کو سب کہہ دوں گی۔ کیا عزت رہ جائے گی۔" اب کی مرتبہ وہ غصے سے پھنکاری۔

"کہہ دیجیے وجیہہ سے بے حد ممنون ہوں گا آپ کا مگر فون رکھنے سے پہلے میری ایک بات توجہ سے سن لیں پلیز!"

مگر اس نے فون رکھ دیا۔ وہ پلٹی ہی تھی کہ گھنٹی پھر بج اٹھی۔ شہوار نے فون اٹھا

لیا۔ مگر کانوں تک لے جانے کے بجائے ماؤتھ پیس پر ہتھیلی جما کر کھڑی ہو گئی۔ ماؤتھ پیس سے آواز ابھر رہی تھی۔ اور وہ کانپ رہی تھی آخر ہیلو! ہیلو! کہہ کر بند ہو گئی۔ شہوار نے فون رکھ دیا۔ اور پلٹ گئی مگر اس کا سانس جہاں تھا وہیں رک گیا۔ جیہ بڑی سنجیدہ صورت بنائے کھڑی تھی۔

"کس کا فون تھا شہوار؟"

"فف۔ فف۔ فون کسی کا بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔" اس نے بوکھلا کر جیہ کو دیکھا۔ جو بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ تاب نہ لا سکی اور ہلکی سی آواز کے ساتھ جیہ سے لپٹ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"جیہ! تم سے اسی لیے کہا تھا کہ مجھے نہ لے جاؤ۔ وہ لڑکا جو ٹی وی پر آتا ہے اس نے مجھے کل سے پریشان کر رکھا ہے۔ اس روز بھی تم نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا تھا جیہ میں ایسی نہیں ہوں۔ چچا چچی کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔ میں کہاں جاؤں گی؟"

"اوہ! میرے خدا۔ شہوار رانی کیا پاگل پن ہے؟ تو نے مجھے اسی روز کیوں نہیں بتایا تھا ٹھیک کر دیتی اصفہان کے بچے کو ارے بھئی وہ دراصل سمجھا نہیں کہ تم ہم سب لڑکیوں سے یکسر الگ ہو! کوئی کچھ نہیں کہتا۔ کل یونیورسٹی جاؤں گی ناں تو دیکھنا جھاڑ کر آؤں گی۔" وہ اسے ساتھ لپٹائے کمرے میں چلی آئی۔ جیہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی تھی۔

اصفہان جیسا گلیمر بوائے جس کا آج تک کوئی اسکینڈل نہ بنا تھا کبھی کسی لڑکی کے ساتھ تنہا نہیں دیکھا گیا تھا ہر کوئی اس کی عزت کرتا تھا۔ بے حد فعال وسرگرم رہنے والی شخصیت تھی۔ تعلیمی ریکارڈ عمدہ تھا۔ ایک جانا پہچانا فنکار تھا۔ سنا تھا کاروبار میں باپ کی ہیلپ بھی کرتا تھا۔ یعنی عیش پسند کاہل الوجود امیر زادہ نہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جیہ

کو تاؤ نہیں آیا تھا کہ وہ جانتی تھی کہ وہ فلرٹ نہیں خود جیہ کا بہترین دوست تھا، تمام دن میں کئی مرتبہ جیہ کا اس سے سابقہ رہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اصفہان کو شہوار کے متعلق سب کچھ بتا دے گی۔ ویسے بھی وہ شہوار کے آئیڈیل سے بے حد قریب تھا۔ جان محفل قسم کا شخص۔

شہوار سو چکی تھی۔ سبز ہلکی روشنی میں جیہ نے اس کا چندر ماں مکھڑا دیکھا۔

شکر منا شہوار تو اگر پہلے آگئی ہوتی جانے ایسے کتنے حادثوں سے گزر جاتی۔

اس شہر میں، یہاں حسن پرستوں کی کمی نہیں! فنکار تو عام آدمی سے زیادہ حساس ہوتا ہے، عام آدمی سے زیادہ حسن پرست ہوتا ہے۔ حسن شکل میں ہو، لباس میں ہو، جگہ میں ہو۔ گفتگو میں ہو۔ جملوں میں ہو۔ اسے دیوانہ کر دیتا ہے۔

☆☆☆

شہوار تو کچھ دنوں میں بالکل ہی بھول بھال گئی کچھ جمیل بھائی کی۔ شادی بھی عین قریب آگئی تھی اور وہ ان رونقوں میں بے حد خوش تھی اس بات سے بھی بے نیاز کہ حسان قریشی نظروں ہی نظروں میں اسے دل میں اتارتا رہتا ہے جیہ نے شہوار کو شادی کے لیے بطور خاص بے حد خوبصورت ڈریسز تیار کروا کر دیے تھے۔

جس دن جمیل بھائی کو ابٹن لگایا گیا شہوار نے لیمن کلر کا کرتا شلوار پہنا۔ اپنی دونوں چوٹیوں میں سنہری ربن ڈالے۔ مہندی کے روز جیہ نے اسے بڑے چاؤ سے پشواز اور تنگ پاجامہ پہننے کو دیا بڑے سے کامدانی کے سبز دوپٹے اور کاجل بھری آنکھوں نے اس دن کس کس کا سانس نہ روکی۔

بارات کے روز آتشی گلابی مخمل کا غرارہ سوٹ اور ہلکے ہلکے سنہرے زیورات سے سجی تو جیہ نے اس کا گھونگھٹ نکال دیا۔

''بلاؤں اصفہان کو تجھے بھی ساتھ ہی نمٹا دیں۔'' شہوار کے ہونٹوں سے کرنیں پھوٹ پڑیں۔

''چپ کرو جیہ کوئی سن نہ لے۔''

''سن لے تو سن لے۔'' جیہ کا بلیو کامدانی ساڑھی کا آنچل سنبھال کر گویا گنگنا کر کہا۔

اسی دم ایک باوقار سی خاتون کمرے میں داخل ہوئیں، جیہ نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ تو شہوار نے بھی کر ڈالا۔

''اچھا تو یہ ہے شہوار'' انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ''اچھی تو ہو بیٹی۔''

''جی۔ جی۔ ہاں۔''

انھوں نے جیہ سے کچھ باتیں کیں پھر چلی گئیں۔

شہوار نے سوالیہ نظروں سے جیہ کو دیکھا۔

''ارے بھئی، میری ہونے والی ساس ہیں۔''

''چل آلان میں چلیں اپنے کمشنر صاحب بھی آ گئے ہوں گے۔ تجھے ملواؤں۔''

وہ باہر آئیں تو گڑیا نے بتایا وسیم بھائی ڈرائنگ روم میں ہیں۔ وہ شہوار کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔ لائٹ براؤن سوٹ سنہری فریم کا قیمتی چشمہ لگائے سامنے نہایت باوقار سا شخص بیٹھا تھا۔

جیہ نے بھی بڑے وقار سے آداب کہا اور شہوار کا تعارف کرایا۔

پھر وہ جیہ سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اندرون سندھ کیے گئے دورے کے متعلق، اپنے ،فلو، کے بارے میں۔

وہاں اٹھائی گئی بوریت کے بارے میں۔ تب شہوار چپکے سے کھسک آئی۔

تھوڑی دیر بعد جیہ بھی آگئی۔

''کیوں کیسے ہیں وسیم؟'' اس نے رائے لی۔

''شکل کے تو بہت اچھے ہیں۔ رعب دار بھی ہیں۔ بس حسان بھائی کی طرح لگے مجھے تو۔ ہائے جیہ مت بالکل بھی نہیں شرمائیں۔''

''ارے بھئی تاہم شروع سے دوست رہے ہیں۔ پسند سے شادی ہو رہی ہے ہماری، پھر ہمارا گھرانہ اتنا بیک ورڈ بھی نہیں بالکل اجنبی ہوتے تو ظاہر ہے پھر اس طرح تھوڑا ملتے اور پگلی بس یہ تو لڑکی کی بے کار سوچیں ہیں۔ منگنی یا شادی ہو جائے تو دوری بہت کھٹکتی ہے۔'' جیہ شرارت سے ہنسی۔

دادی ٹھیک کہتی تھیں شہر میں کہاں کرتی ہیں لڑکیاں شرم ورم۔''

''اچھا تو ہم بے شرم ہیں۔'' جیہ بناوٹ سے برا مان کر بولی۔

''جیہ کیسا لگتا ہے جب تم وسیم بھائی کے سامنے آتی ہو؟''

''بتادوں؟'' جیہ ہنسی۔ ''سچ بڑا اچھا لگتا ہے، دل چاہتا ہے وسیم سامنے بیٹھے رہیں۔''

اس نے شہوار کو دیکھا جو حیرانی سے کچھ سوچ رہی تھی۔

پھر مہمانوں کا جم غفیر امڈ آیا بارات روانہ ہونے والی تھی۔ گاڑیوں میں بیٹھنے کے لیے لوگ لان کراس کر کے باہر جا رہے تھے۔ معاً جیہ کو یاد آیا کہ ہونے والی بھابھی کا بیوٹی بکس اس کے کمرے میں رہ گیا ہے اس نے شہوار کو دوڑایا اور جب وہ بیوٹی بکس تھامے مہندی کی باڑ کے پاس سے گزری اس کا بڑا سا آنچل اس میں اٹک گیا۔ اس نے نہایت آہستگی سے چھڑانا چاہا۔ معاً پیچھے سے آواز آئی۔

جس بھی فنکار کا شاہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمھیں سوچا ہوگا

اصفہان کو دیکھ کر بری طرح سٹپٹا گئی۔ ''جیہ۔'' اس نے آواز دی۔ ''جیہ۔ جیہ!''

''وہ لوگ تو گاڑی میں بیٹھ چکے۔ میں خود آپ کو دیکھ کر گاڑی سے اتر کر

یہاں آیا ہوں۔''

''جیہ کی ہدایت میرے لیے خوش بختی کا سبب رہی۔ اس نے کہا تھا کہ عین بارات کی روانگی کے وقت آنا ورنہ لڑکے لڑکیوں نے گھیر لیا تو جمیل بھائی پر بن آئے گی۔ سو اس کی ہدایت کے عین مطابق بالکل وقت پر آیا ہوں، لگتا ہے قسمت مہربان ہے۔''

اتنے میں وہ آنچل چھڑا چکی تھی۔ بیوٹی بکس اٹھا کر ایک دم دوڑ گئی۔

دعوت ولیمہ مقامی ہوٹل میں تھی۔ رو پہلے کامدار شلوار سوٹ میں وہ تقریب میں موجود اصفہان قاضی سے بہت بچتی پھری تنہا تو وہ بھی نہیں تھا۔ اس کی دیگر یونیورسٹی فیلوز فینز اس کے ہمراہ تھے بظاہر وہ بھی ان میں مگن تھا۔ عالیہ جیہ وغیرہ کی ڈھیروں سہیلیاں انھیں اڑائے پھر رہی تھیں۔ ہنگامہ کچھ سرد سا پڑنے لگا گویا لوگ جانے کے لیے پر تول رہے تھے تب وہ ساجدہ چچی کی طرف جانے لگی جو چند بزرگ خواتین میں گھری ہوئی تھیں۔ سبزہ پار کر کے وہ کاریڈور کی طرف آئی۔ لیٹ آنے والے مہمان اب بھی کھانے میں مصروف تھے۔

''سنیے!'' جانے کیسے وہ ہجوم کو ڈاج دے کر آ گیا تھا۔

''جی۔ جی۔'' وہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی کیفیت میں گڑبڑائی۔

''ٹھیک ہے۔ فیشن و اہتمام۔ سب درست مگر یہ ایک کان میں بندے کا فیشن کب چلا بھئی؟''

اس نے بے تحاشا بوکھلا کر اپنے کانوں کی لووں کی چھوا۔ ساجدہ چچی کے سچے موتیوں کے آویزے تھے جو انھوں نے زبردستی پہنائے تھے۔

''ہائے اللہ!'' اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

''شاید کہیں گر گیا۔'' اصفہان نے ہمدردی جتائی۔

''ہائے جی۔ وہ جی۔'' جیہ نے بظاہر اسے بہت بدل دیا تھا۔ مگر اس کی گفتگو

پول کھول دیتی تھی۔

"کیا جی؟" وہ مسکرایا۔

مگر وہ ڈھونڈنے کو لپکی۔

"سنئے!"

مگر وہ پریشانی سے بڑھے گئی۔

"ارے بھئی یہ تو نہیں ہے؟" ناچار اسے بتانا پڑا۔

وہ بے ساختہ پلٹ پڑی آویزہ اصفہان کی انگلیوں میں جھول رہا تھا...... ہتھیلی پھیلا کر اس نے گویا آویزہ طلب کیا۔

"لاؤ...... میں تمہارے کان میں ڈال دوں۔ شاید تم سے نہ ڈلے۔"

شہوار کے چہرے پر گویا سارا خون سمٹ آیا۔

"کتنے بے شرم ہو، غیر لڑکیوں سے اس طرح بولتے ہیں؟" نہ جانے کہاں سے اس میں اتنی ہمت آ گئی تھی۔

اصفہان کی کھوپڑی الگ گھوم گئی۔ جیہ سے بالکل الگ لب ولہجہ۔ ٹھیک ہے وہ اسے سادہ و معصوم سمجھا تھا مگر اس قدر کبھی نہیں۔ اس نے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ اور آویزہ اس کی سمت بڑھا دیا۔

"جب آپ دلہن کے اسٹیج سے اتری تھیں یہ وہیں گرا تھا۔ میں دراصل وہاں فلم بنا رہا تھا جیہ کی خاص ہدایت پر بے تکلفی پر شرمندہ ہوں۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے جوتوں کی چرچراہٹ اس نے اپنے دل پر محسوس کی۔

☆☆☆

یونیورسٹی ہنگاموں کی وجہ سے غیر معینہ مدت تک بند ہو چکی تھی، لہذا جیہ کو اصفہان سے نہ اصفہان کو جیہ سے اس کے متعلق بات کرنے کا موقع مل سکا۔

ویسے اصفہان کئی مرتبہ گھر آیا تھا۔ مگر وہ اس کے سامنے نہ گئی۔ ایک مرتبہ اپنی برتھ ڈے کا بلاوا دینے آیا تھا۔ دوسری بار جیہ سے اپنی کتابیں لینے۔ اگرچہ جیہ اس سے شہوار کے متعلق بات کرنے کو بہت بے چین تھی مگر اصفہان کے آنے پر گھر کے افراد بھی موجود ہوتے تھے۔ سو بات ٹلتی رہی۔

چاند رات والی مخصوص افراتفری گھر میں تھی۔ گڑیا اور بھابی ڈرائنگ روم میں صفائی کر رہی تھیں جیہ۔ پتہ نہیں کیا بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ اچانک کسی کام سے کمرے میں آئی تو شہوار کو بے حد مصروف پایا۔

دبے پاؤں پیچھے سے آ کر دیکھا۔ پاس ہی شہوار کا وینٹی پرس پڑا تھا۔ وہ سر جھکائے اخبار کا ایک حصہ تراش رہی تھی خواتین کا صفحہ تھا عید کی مناسبت سے انتخاب کلام شائع ہوا تھا۔ وہی حصہ قینچی کی زد میں تھا۔

جیہ نے وہ تراشہ جھپٹ لیا۔ شہوار بے تحاشہ گھبرا گئی "جیہ سچی کچھ بھی نہیں ہے۔ دیکھو دے دو۔"

جیہ بلند آواز سے پڑھنے لگی۔

چڑھ کوٹھے ڈٹھاں لوکاں عید دا چن
مبارکاں ڈیون پئے۔ گلے ملن
ڈسو کیویں عید مناواں میں
میکو نظر نئیں پوندا میڈا چن

(لوگ چھتوں پر چڑھ کر عید کا چاند دیکھ رہے ہیں، گلے مل رہے ہیں مبارک باد دے رہے ہیں۔ کہو میں کیسے عید مناؤں مجھے میرا چاند نظر نہیں آتا۔)

"ہوں۔!" جیہ نے سر ہلایا۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

"اے بناوٹ کی پڑیا! بڑی مشکل زبان میں شعر جمع کر رہی ہے استاد اتنا تو سمجھ ہی لیتے ہیں ہم ابھی فون کر دوں بچی صبح گرتا پڑتا آئے گا۔ کر دوں۔؟"

"کک کیا؟ میں تو ایسے ہی پڑھ رہی تھی مجھے اچھا لگا۔ تم تو ہر بات میں میرا مذاق اڑاتی ہو۔" اس نے گویا برا مان کر کہا۔

"شہوار، ادھر دیکھو میری طرف بچو ہم سے بھی اڑی؟"

"جیہ مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو مجھے ڈر لگتا ہے، چچا چچی نے سن لیا تو میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟"

"ارے وہ اصفہان کا بچہ تو ہتھے ہی نہیں چڑھ رہا ورنہ کب کی پوچھ گچھ کر چکی ہوتی۔ بالکل تیرے مطلب کا ہے، ہے ناں۔"

"جیہ۔!" وہ پرلے درجے کی بزدل لڑکی لرز کر رہ گئی۔

"کم بخت کہیں کی۔ مجھ سے بھی چھپاتی ہے۔ صاف کہہ دے۔

جاؤ دنیا سے کہہ دو ہمیں پیار ہے۔"

"جیہ! جیہ! صرف ایک شعر کاٹنے کی اتنی بڑی سزا۔ ایسے مذاق تو نہ کیا کر۔"

وہ روہانسی ہوگئی۔ تب جیہ کو ترس آ گیا وہ جانتی تھی کہ یہ حماقتوں کی پوٹ مرتی جائے گی مگر اقرار نہ کرے گی۔

☆☆☆

جیہ نے گاؤن ایک طرف ڈالا خود صوفے پر گر کر سینڈل کے اسٹریپ کھولتے ہوئے شہوار کو آواز دینے لگی۔

شہوار کچن میں کھڑی پھلکے ڈال رہی تھی۔ پھلکا اتار کے جلدی سے چولہا بند کر کے بھاگی آئی۔

"اتنی جلدی آ گئیں جیہ آج؟"

"ہاں بھئی! اتنے دنوں بعد یونیورسٹی کھلی ہے کوئی خاص پڑھائی نہیں ہو رہی

تھی۔ اس پر اصفہان کے بچے نے پکڑ لیا۔ بس اس کے بعد تو دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر گھر آ جاؤں!" اس نے چٹکی سے دونوں سینڈل اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

شہوار نے اپنی بھاری آنکھیں جیہ کی سمت کیں مگر چپ رہی۔

"اچھا یہ بتا تیرے پیٹ میں کچھ ہو رہا ہے؟"

شہوار نے نفی میں سر ہلایا۔

"دل میں ہو رہا ہوگا؟" جیہ نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔

شہوار نے بری طرح جھینپ کر اس کا ہاتھ جھٹکا۔ "نہیں ناں!"

"اچھا تے اٹھے میرے کول آ جا بے جا۔" اس نے اس کے ہاتھ کھینچ کر بٹھایا۔

"اصفہان آج تیرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے سب بتا دیا۔ اصرار کر رہا تھا اپنی اماں کو دکھاؤں گا۔"

شہوار کا دل دھڑ دھڑ بجنے لگا۔

"کہہ دوں لے آؤ؟ بلکہ پورا سنسر بورڈ لے آؤ۔ یعنی 10 ماں بہنیں، بھابھیاں۔"

"نہیں جیہ! سوچو تو سہی سب کیا کہیں گے۔ میرا یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہاں کا آدمی میرے لیے۔"

"خود ہی تو کہہ رہی تھی مجھے ایسے لوگ پسند ہیں۔"

"اصفہان کا نام کب لیا تھا۔؟"

جیہ کو اس کے منہ سے لفظ "اصفہان" بے حد پیارا لگا۔

"مجھے پتہ ہے تیرا دل سارا دن "راگ اصفہان" الاپتا رہتا ہے۔"

اور شہوار زمانے بھر کی عاقبت نااندیش جیہ کا اندھیرے میں چلایا تیر نہ سمجھ سکی۔

سرخ پڑ گئی تیر پر خود اڑ کر نشانہ لگا تھا۔ واہ ری قسمت۔

☆☆☆

رقیہ پھوپھو آخر کار دھماکہ کر گئیں۔ ابھی ابھی افتخار حسین سے مل کر گئی تھیں۔ انھیں شہوار حسان کے لیے چاہئے تھی۔ ثریا پھوپھو کے بیٹے حسان سے چھوٹے تھے۔ دونوں بہنوں نے افہام وتفہیم کے مرحلے سے گزر کر فیصلہ کر لیا تھا کہ حسان کے لیے شہوار لے لیں گے۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا گئی تھیں۔

جیہ خود شش و پنج میں تھی۔ رات کو اس کی آنکھ کھلی تو شہوار کھڑکی کی گرل سے پیشانی ٹکائے کھڑی تھی۔

جیہ نے خلاف توقع وخلاف عادت کچھ بولے بنا کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

”امی! آج لوگ شہوار کو دیکھنے آرہے ہیں۔“

”کون ہیں وہ لوگ؟“ ساجدہ بیگم نے استفسار کیا۔

”وہ اصفہان ہیں ناں اس کے گھر والے۔“

انھوں نے کہاں دیکھ لیا شہوار کو؟“ انھیں اچنبھا ہوا۔

”انھوں نے نہیں اصفہان نے!“

”یہ تو تمھیں علم ہے کہ شہوار کو رقیہ پھوپھو نے مانگا ہے۔“ جمیل بھائی کی دلہن سائرہ درمیان میں بول اٹھیں۔

”جی، معلوم تو ہے، آنے والوں کو روکا تو نہیں جا سکتا۔ پھر دیکھ لیں ہو سکتا ہے وہ زیادہ بہتر ہوں۔“

”بات زیادہ کم کی نہیں ہے، جب خاندان میں لڑکے موجود ہیں پھر لڑکیاں باہر کیوں دی جائیں۔؟“

”بس آپ لوگ مل لیں پھر جو چاہے کریں، بات معقول تھی، ساجدہ بیگم چپ ہو گئیں۔

☆☆☆

شہوار نے وہی براؤن سوٹ پہن رکھا تھا جو یونیورسٹی پہن کر گئی تھی۔ ان لوگوں نے چار بجے آنے کو کہا تھا۔ جیہ نے اسے کہہ کر غسل کرایا تھا۔ وہ گیلے بال کھولے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ تب جیہ نے اس کی آنکھوں میں کاجل کی باریک لکیریں کھینچ دیں۔ اور باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”یہیں بیٹھی رہنا۔ جب وہ لوگ آئیں گے تو لے جاؤں گی۔“

”سنو جیہ! اگر وہ بھی ساتھ ہوئے تو میں نہیں جاؤں گی ڈرائنگ روم میں۔ مجھ سے نہیں بیٹھا جائے گا۔“ اس نے بڑی ہمت کر کے جیہ سے دل کی بات کہہ دی۔

”جو حکم شہزادی عالیہ کا!“ جیہ ہنس کر باہر چلی گئی۔

بیٹھے بیٹھے وہ اکتا گئی تو لیٹ گئی۔ غسل کے بعد ویسے ہی طبیعت ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔ اور غنودگی سی آجاتی ہے لیٹنے پر، سو وہ ذرا دیر میں بے خبر تھی۔

جانے کب جیہ نے اسے تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ اصفہان کی امی اور دونوں بہنوں کو لے کر کمرے میں آئی تو محترمہ خوابوں کی نگری میں پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ تینوں ماں بیٹیاں دم بخود سی ہو گئیں۔ بات یہ نہیں کہ انھیں آج سے پہلے کہیں حسن دکھائی نہیں دیا تھا۔ بڑے سے بڑا طرح دار حسن دیکھا تھا مگر ایسا بے خبر اور نیاز حسن نہ دیکھا تھا۔ سیاہ دراز بال کچھ پلنگ سے نیچے لٹک رہے تھے کچھ سینے و رخسار پر پڑے تھے۔ کچے بور سی مہک دیتا انمول جسم۔

جیہ کے جھنجھوڑنے پر وہ جاگ گئی کچھ ہڑبڑا کر۔ خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ معاً ایک خیال آیا تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ جیہ کے بتائے ہوئے طریقے سے آداب کہا۔

وہ تینوں اس کے اردگرد بیٹھ گئیں۔

”پڑھتی ہو بیٹی؟“ اصفہان کی امی نے پوچھا۔

”نہیں!“ اس نے آہستگی سے کہا۔

"انھوں نے انٹر کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے بتایا ناں، انھیں ہماری دادی جان نے پرورش کیا۔ اور وہ زمینوں کی وجہ سے دیہات میں رہیں۔ ڈگری کالج وہاں سے بہت دور ہیں ہاسٹل میں دادی جان بھیجنا نہیں چاہتی تھیں۔ اب ان کا انتقال ہو گیا ہے تو یہ سات ماہ سے ہمارے پاس ہی ہیں۔" جیہ نے بتایا۔

"اچھا، انٹر کیا ہے۔" اصفہان کی امی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

جیہ کا دل چاہا کہہ دے۔ محترمہ پڑھتی گئیں ڈبوتی گئیں۔ مگر شہوار کی صورت دیکھ کر اسے بے ساختہ پیار آ گیا۔ قصور دادی جان کا تھا جیسے انھوں نے ڈھالا ڈھل گئی۔

شہوار مسلسل سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی رہی ساجدہ بیگم بھی چائے کا انتظام کر کے بہو کے ہمراہ اندر آ گئیں۔ اصفہان کے پاس جمیل بھائی اور گڑیا وغیرہ تھے۔

چائے پینے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ اصفہان بہت تڑپا اس کی ایک جھلک دیکھنے کو، جیہ اور گڑیا ہنستی رہیں۔

اصفہان اسے جیہ کی شرارت سمجھا۔ رات کو اس نے جیہ کو فون کر ڈالا۔

"واہ جیہ! خوب دوست ہو۔ میں کیا چنے بھوننے گیا تھا۔ تمہارے یہاں۔"

جیہ پیٹ بھر کر ہنسی پھر بولی۔

ابھی تاروں سے کھیلو، چاند سے اٹھلاؤ
ملے گی اس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ

"سخت بوریت ہوئی۔ تمہیں بہت کچھ کہنے کو دل چاہ رہا ہے وہ تو تمہارے کمشنر صاحب کا کچھ پاس ہے آخر کمشنر صاحب کی ہونے والی بیگم ہو۔ ستر کام پڑیں گے تم سے، بہرحال تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"تم نے امید ہی کیا ہے مطلبی ہو پکے۔ سچی اگر یقین کر سکتے ہو تو کر لو۔ وہ خود ہی نہیں آئی۔ اور اصفہان اب تو وہ لوگوں کے سامنے بھی آ جاتی ہے۔ پہلے تو بھیا اپنے سگے رشتے دار بھائیوں کے سامنے تک نہیں آتی تھی۔ ایمان سے مذاق نہیں۔"

جیہ نے یقین دلایا۔ پھر بولی۔ "یہ بھی میرا معرکہ کہو جو اسے اس دن یونیورسٹی لے گئی تھی۔ ساری زندگی ٹاپتے رہ جاتے۔ اس پری کی ہوا بھی نہ لگتی۔ دیکھو یہی اس کی...... عادات ہیں میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپائی، خوب اچھی طرح سوچ لو۔ غور کر لو اسی لیے میں تمھیں اس کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات بتا چکی ہوں۔ ویسے تم خوش ہونا اس کا ایک اہم پروپوزل آیا ہوا ہے۔ جس کے ووٹ زیادہ ہیں۔"

"ارے بھئی ایسا غضب نہ ہونے دینا۔ کیا سمجھیں بھئی کرو ناں۔ گھر والے تو جب سے آئے ہیں محترمہ کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہیں۔"

"سوچیں گے۔" جیہ نے شرارت سے کہہ کر فون رکھ دیا، اور شہوار کے پاس چلی آئی۔

"کہو انارکلی کیا محسوس کر رہی ہو؟ میں تو تمہارے "سلیم" کی ڈانٹ کھا کر آ رہی ہوں۔"

اس بے وقوف نے شرما کر سر جھکا لیا۔ تب جیہ نے بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"لگتا ہے گھمسان کا رن پڑے گا شہوار!"

"ہوں!"

"اگر سب نے حسان بھائی کے حق میں ووٹ دے دیے تو تو خوش تو رہے گی ناں ان کے ساتھ۔"

شہوار نے بے ساختہ چونک کر بلکہ کچھ متوحش انداز میں جیہ کو دیکھا۔ جیہ تو مضمون "شہوار" میں اسکالر ہو چکی تھی۔ نظر چرا کر بولی۔

"کوئی جواز، کوئی بہانہ، کوئی عذر نہیں۔ پاپا اپنی بہن کو انکار نہیں کر سکتے۔ مجھے اندازہ ہے۔ تو ہاں کر دے گی؟ کیونکہ پاپا تجھ سے ضرور پوچھیں گے خواہ امی کے ذریعے

سہی۔''

''جیہ! چچا جو سوچیں گے میرے حق میں بہتر ہو گا انسان کی تمام تمنائیں تو پوری نہیں ہو جاتیں۔ چچا کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ جیہ ایسے موقعے پر ہی تو ماں باپ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔'' اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''گویا تو احسان فراموشی نہیں کرے گی۔ جانے کیا احسان ہم نے تجھ پر کیا ہے، تایا جی کی زمینوں کا سارا پیسہ تیرا ہے دادی جان پاپا کو الگ دے کر گئیں۔ پگلی۔! گویا احسان کا بدلہ چکائے گی۔ اور سچے کھرے حسان بھائی کو فریب دے گی کیوں؟''

شہوار کا سر جھکا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی سسکیوں سے دیواروں میں شگاف پڑنے لگے۔

''شہوار۔ زندگی۔'' جیہ نے پیار سے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔'' رانی جو تو عمر بھر نہ کہہ پائے گی تیرے آنسو پل میں کہہ جاتے ہیں۔''

''جذبے تو خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ دل کی زمین ویسے ہی وسیع و عریض ہوتی ہے۔ کسی بھی زمین پر، کبھی بھی خیمہ گاڑ سکتے ہیں، خواہ اس زمین میں آگہی کے گلستان کھلے ہوں یا لاعلمی کی جھاڑیاں توانا احساسات کے چشمے بہتے رہیں۔ یہی قیام کی شرط ہے اور بس۔''

''فکر نہ کرو۔ جو بن سکے گا کروں گی تو نے مجھے خرید لیا ہے۔ بے سکون کر دیا ہے رانی۔'' جیہ نے اس کا ماتھا چوما۔

☆☆☆

''اگر آپ انکار کر دیں حسان بھائی تو کوئی پرابلم نہیں۔'' وہ کافی دیر کی پیش بندی کے بعد مطلب پر اتر آئی۔

''اپنی رضا بھی دی اب انکار بھی کر دوں۔ پاگل نہ کہیں گے سب مجھے۔'' تکیے سے حسان بھائی ابل پڑے۔

''اب بہر حال یہ کرنا ہے۔ ہم سب کزن آپس میں بہترین دوست بھی ہیں۔ میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے اب شہوار آپ کی ہو جائے تو کیا آپ اسے وہی اہمیت دیں گے، بخدا اس نے کسی محبت وحبت کا اقرار نہیں کیا۔ کم بخت پرلے درجے کی بزدل ہے۔ بس آپ کو تو وہ شروع ہی سے ناپسند کرتی ہے۔''

اپنی بات وزنی کرنے کی خاطر اسے منہ پھوڑ کر صاف کہنا پڑا۔

یہ کورا جملہ تو کسی کے بھی حواس درست کر سکتا تھا۔ بے حد حساس اور کم گو حسان نے چٹکی سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور پھر کچھ نہیں بولے۔ اور جیہ کھسک آئی چپکے سے۔

ساجدہ بیگم بے حد سلجھی ہوئی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ بیٹی سے ساری رام کہانی سن کر میاں پر دباؤ بھی ڈال رہی تھیں مگر انھوں نے پٹھے پر ہاتھ ہی دھرنے نہیں دیا۔

''نہیں ساجدہ! بچی ہماری دوہری اہمیت کی حقدار ہے ہمیں اس کے متعلق بے حد محتاط ہو کر سوچنا ہے۔ ٹھیک ہے لڑکا پڑھا لکھا ہے اچھے گھر کا ہے مگر برسر روزگار نہیں ہے ایکٹنگ سے اپنا ہی پیٹ بھر لے تو بہت ہے سمجھ میں نہیں آتا تم اتنی مصر کیوں ہو؟''

ساجدہ بیگم کا جی چاہا صاف کہہ دیں لڑکا آپ کی بھتیجی پر سو جان سے مرمٹا ہے۔ اور وہ آپ کی بے زبان بھتیجی اپنی زبان جیہ کے منہ میں ڈال چکی ہیں تب ہی افتخار بول پڑے۔

''ہو سکتا ہے انھیں یہ بھنک پڑ گئی ہو کہ لڑکی وسیع جائیداد کا مالک ہے۔''

''اے ہاں!'' ساجدہ بیگم بھی کچھ ٹھٹکیں۔ اور اپنی مدلل گفتگو کا تھان لپیٹ لیا۔

☆☆☆

جانے کتنے جھگڑے نمٹے، حسان کا انکار، افتخار حسین کا اقرار یہ جان کر کہ

اصفہان قاضی کے والد کا اپنا قالینوں کا بزنس ہے جس میں اصفہان بھی حصہ دار ہے!

بعض لوگوں کو خوشیاں مل تو جاتی ہیں مگر بڑی رکاوٹوں کے بعد بڑے بڑے مرحلے طے ہوئے دسیوں چکر لگے ایک دوسرے کے گھر۔ تب اونٹ کسی کروٹ بیٹھا۔ جیہ کے امتحان گویا اصفہان کے بھی امتحان کے بعد شادی قرار پائی۔

جیہ دن رات واعظ بنی رہتی۔

''اے بھولی! دیکھ تیرے مجنوں کو تو سب پتہ ہے تو کتنے پانی میں ہے۔ مگر خدا کے واسطے فالتو شرم اور بے مہار بوکھلاہٹیں اور ان گنت ہزاروں گرام حماقتوں کی بوریاں پچھلی کھڑکی سے باہر پھینک جانا۔ کیا سمجھی؟ بچ کھائیں گی وگرنہ تیری ساس نندیں۔ اس بے چارے اصفہان کی الگ شامت آئے گی۔ بہت بڑے لوگ ہیں۔ دو دیور ہیں تیرے۔ دیور تو تجھے پتہ ہے کتنے شرارتی ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں تیرا کیا حال کریں گے۔ بہت مشہور لوگ ہیں شہر کی ایک خلقت آئے گی تجھے دیکھنے سے گھبرانا نہیں سب انسان ہی ہوں گے یقین واثق ہے۔'' وہ لاپرواہی سے جگالی کرتے ہوئے جانے کیا کیا بک جاتی۔

وہ بے چاری ہولتی رہتی۔

دو باراتوں کا ہنگامہ تھا۔ دونوں ہی باراتیں اپنی جگہ بے حد اہم تھیں۔

دونوں ایک ہی جگہ مایوں بیٹھی تھیں۔ وہ تو باقاعدہ رو رہی تھی بڑے چر کے کھایا دل تھا۔ البتہ جیہ پر زیادہ اثر نہ ہوا تھا۔ ویسے بھی بے حد قریب ہی بیاہ کر جا رہی تھی لوگ بھی بے حد دیکھے بھالے تھے۔

لڑکیاں ڈھولک میں مصروف ہوتیں تو جیہ کھسر پسر کرنے لگ جاتی۔

''چل شکر ہے دونوں کی شادی ساتھ ساتھ ہو رہی ہے۔ اکیلے میں تو بور ہو جاتی۔ ایک تو ثریا پھوپھو ایسا سخت پردہ کرا رہی ہیں۔ ارے باپ بھائیوں کی نظروں سے بھی چھپو۔ نور نہیں آئے گا۔ اب کون انھیں سمجھائے نور آئے نہ یا آئے۔ کمشنر

صاحب چھتری ہاتھ میں دے کر باہر تو نہ نکال دیں گے۔ ہم تو ویسے ہی بے نور بھاگئے، میں انہیں۔'' تب روتی شہوار بھی بری طرح ہنس پڑتی۔

''توبہ جیہ! نہ ہنساؤ ناں لوگ کیا کہیں گے۔'' وہ ہنسی روک لیتی۔

''کیا کہیں گے؟ دعائیں دیں گے بچیاں کتنی خوش ہیں، اللہ خوش ہی رکھے۔ اور بھئی ہم منافق نہیں ہیں کہ دل میں لڈو پھوٹتے رہیں۔ منہ پر بارہ بجتے رہیں۔ قیامت میرا مطلب ہے شادی نزدیک ہے نیکیاں کر لینی چاہئیں۔'' تب شہوار سب کی طرف سے منہ پھیر لیتی کہ جیہ تو باز آنے والی نہیں۔

''جیہ! وسیم بھائی تو بہت خاموش طبیعت لگتے ہیں کیا کہیں گے تمھیں۔؟''

''ارے چل وہ تو تجھے دیکھ کر مجھے گدگدیاں ہونے لگتی ہیں۔ ورنہ ان کے سامنے تو بڑا رکھ رکھاؤ ہے میرا۔ بڑے رعب میں ہیں میرے۔ تو کیا جانے۔؟''

اور جو دوسرے لوگ اس کی باتیں سن لیتے تو ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے۔

تب جیہ جھینپ جاتی تھی۔

اور پھر ایک خوبصورت گھڑی دونوں جانثار نہیں الگ الگ راستوں پر گامزن ہو گئیں۔ ساجدہ بیگم نے دونوں کے جہیز کی ایک ایک چیز ایک جیسی بنائی تھی۔ پچاس ہزار افتخار حسین کی والدہ انھیں اس کے جہیز کی نیت سے دے گئی تھیں۔ اور پھر بعد کی زمینوں کی آمدنی کچھ انھوں نے خود بھی لگایا۔

بہت اچھے طریقے سے دونوں لڑکیاں وداع ہو گئیں اور پھر عالیہ، حنا، ہما، گڑیا اس دن خوب ٹانگیں پسار کر سوئیں سائرہ بھابی کمرے میں آئیں۔ تو مہاجروں کے کیمپ کی دیکھ کر بے ساختہ ہنس دیں۔

جیہ کی دعوت ولیمہ شادی کے دوسرے دن اور شہوار کی تیسرے روز رکھی گئی تھی۔

دونوں ہی ابھی ابھی سسرال سے آئی تھیں۔ اپنے مخصوص کمرے میں سونے کا

کہہ مہمانوں کو نکال کر باہر کیا۔

دروازہ بولٹ کرتے ہی جیہ نے بھاری دوپٹہ بیڈ پر پھینکا اور قالین پر چت لیٹ گئی۔

"آجاؤ شہوار رانی میرے پاس تم بھی لیٹ جاؤ۔ ایمان سے تم لے لو ذرا جو نیند لی ہو۔ گردن اور کمر دہائی دے رہی ہیں۔ دلہنوں سے خوب چھانٹ کر بھولی بسری غلطیوں کے بدلے لیے جاتے ہیں۔

اب یہی دیکھ لو سوچا تھا سسرال جا کر تھوڑی دیر سو جاؤں گی۔ مگر وہ مہمانوں کے رنگ برنگے بچے اس طرح آ آ کر دیکھ رہے تھے گویا نو ذی الحجہ کو قربانی کا جانور آیا ہو۔ سن رہی ہو شہوار؟" وہ بولتے بولتے چونک پڑی دیکھا تو شہوار خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہیں۔

"اے!" جیہ کو باتیں ضائع جانے پر تاؤ آ گیا۔ اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا ہے جیہ سونے دو۔" وہ کسمسائی۔

"ایسے ہی تھوڑی چلو اٹھو۔ میں اصفہان نہیں جو رعب میں آ جاؤں گی۔ یہ بتا کیا پایا؟"

شہوار نے جھینپ کر انگوٹھی دکھائی۔ جیہ سے اپنی، دو چار باتیں کر کے وہ سو گئیں۔ شام کو دعوت ولیمہ تھی اس لیے جیہ کو جلدی چلے جانا تھا۔ ساجدہ بیگم نے شہوار کو جگانے سے منع کر دیا۔ وہ بھی اس طرح سو رہی تھی گویا پیادہ صحرا کے سفر سے آئی ہو جیہ کے سسرال والے اسے لے گئے۔

اصفہان اور اس کی بہنیں کافی دیر تک اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہیں۔ تب اصفہان اکتا کر کمرے میں چلا آیا۔ جامنی گہرے رنگ کے بنارسی سوٹ میں وہ قطعی بے خبر تھی۔ بالوں میں سنہری چوٹی ڈالی ہوئی تھی۔ جو سینے کی وادیوں میں بل کھا رہی تھی۔ رات تو وہ اس سے ڈھنگ سے مل بھی نہ سکا تھا دوستوں نے تین بجے کہیں اس کی جان

چھوڑی تھی۔ اور اس مختصر عرصے میں اس نے شہوار کی صبر آزما حیا جھیلی تھی اسے اس قابل کیا تھا کہ..... وہ اس کی باتوں کے مختصر جواب دے سکے۔ حتیٰ کہ جب اس نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھی ڈالی تو شہوار پر لرزہ طاری تھا اور یوں اصفہان نے اس کے ساتھ شیشے کا سامان کا سا برتاؤ کیا تھا۔ تب وہ نیچے قالین پر ہی بیٹھ گیا اور اس کی چوٹی اپنی ہتھیلی پر لپیٹ لی۔ اور اسے آہستہ سے جگا دیا۔

"یار! انسان میں بھی ہوں شاید تم سے زیادہ حرکت میں رہا ہوں۔ ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہے تو نیند میں برابر رہو۔" شہوار جاگ کر اسے دیکھ کر بوکھلا گئی اپنے پہلو میں دیکھا۔

"جیہ۔؟"

"ہاں جیہ! میری رقیب روسیاہ جا چکی ہے اب سارا دن جیہ جیہ نہیں چلے گی۔ ایک تسبیح صبح ہی پڑھ لیا کرنا۔ خواہ مخواہ اچھے دوستوں میں دشمنی کراؤ گی۔"

شہوار بے بس تھی اس کی چوٹی اصفہان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اٹھ نہ سکی۔

"آپ باہر جائیں ناں۔ کتنے مہمان ہوں گے باہر۔"

"ہونے دو ہمیں کیا؟" اسے اس قدر بے خودی میں دیکھ کر شہوار کا سانس پھول رہا تھا۔

اس نے اپنی چوٹی چھڑانی چاہی اصفہان نے ہاتھ تھام لیے۔ "تمام انتقامی کارروائی رات پوری ہو گئی تمہاری بھی اور تمہاری دوست نما دشمنوں کی بھی۔ اب میں مطلق العنان ہوں۔ دیکھو تمہاری عنان میرے ہاتھ میں ہے۔" اس نے شہوار کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر وہ بری طرح بے بس ہو گئی۔

☆☆☆

زندگی بڑے خوبصورت ڈھب سے گزرنے لگی۔ شہوار کی ساس کو اس کی حیا اور ہمہ وقتی مصروفیت نے بے حد متاثر کیا تھا وہ سسرال میں بہت کم گفتگو کرتی تھی اسے

احساس کمتری تھا کہ وہ اچھی اردو بولنے سے قاصر ہے۔

شادی کے تین ماہ بعد ہی اصفہان کو ایک فلم میں ہیرو کا رول مل گیا تب وہ لاہور چلا گیا۔

شہوار نے بجھے دل سے اس کا سامان تیار کیا۔ ہینگر سے اس کے کپڑے اتار کر سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔

بلیو جین گلابی چیک کی شرٹ جس میں سنہری بٹن ٹانکے تھے۔ میں ملبوس وہ کلائی کی گھڑی کا ٹائم سیٹ کر رہا تھا۔ خوبصورت بال پیشانی پر جھک آئے تھے۔ شہوار نے چوری سے دیکھا پیٹ بھر دیکھنے کی اسے حسرت ہی رہی تھی۔

جانے نظروں میں کیا کچھ سمو کر وہ اسے دیکھا کرتا تھا شہوار کو اس دم اس سے بے حد حجاب آتا تھا۔ خلوتی حسین لمحات میں اس کی پلکیں رخساروں پر ہی تھرتھراتی رہتی تھیں اور کبھی جو وہ کہتا۔ شہوار ادھر دیکھو میری طرف، وہ پیٹھ موڑ کر بڑی صفائی سے کہہ دیتی۔

''مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔'' (حالانکہ تم اتنے پیارے ہو اگر تاحیات بھی دیکھوں تو نظر میں سیراب نہ ہوں دیکھو تو سہی چیز میری لوگ خوب دیکھیں بس میں ہی نہ دیکھ سکوں پتہ نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے)

''پتہ نہیں وہ بیویاں کیسی ہوتی ہیں جو شوہروں سے بالکل برابر کی بنیاد پر بے تکلف ہوتی ہیں۔ تم اتنی گریزاں کیوں رہتی ہو؟ حالانکہ جیہ تو کہہ رہی تھی تم نے میری خاطر اہم ترین پروپوزل ٹھکرائے ہیں۔ یقین نہیں آتا۔''

''مجھے شرم آتی ہے بس جب آپ کی فلم بن جائے گی ناں تو بڑی اسکرین پر خوب دیکھوں گی۔'' وہ سادگی سے کہتی۔

''یہ تو تم اپنا ارمان پورا کرو گی، میری بھی آرزو ہے کہ تم مجھ سے بے حد بے تکلف ہو کر ملو۔'' وہ شکوہ کرتا۔

کیسے کیسے خوبصورت لمحات روح میں جذب کر کے وہ اسے جدائیوں کا مطلب سمجھانے جا رہا تھا۔

وہ اسے گم صم کافی دیر سے نوٹ کر رہا تھا۔ پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔

''چپ کیوں ہو بھئی؟'' اس نے پرفیوم کی ٹھنڈی پھوار اس کی گردن پر دی وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کپڑے رکھ رہی ہوں آپ کے۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، بات وات کرو کوئی۔ کوئی نصیحت، کوئی تلقین، کسی وعدے کا اعادہ۔''

''میں کوئی آپ سے بڑی ہوں جو نصیحت کروں؟'' وہ سادگی سے بولی۔

''ارے بھئی! بیویوں والی نصیحت کہ دیکھو جی کہیں دل نہ لگا لینا۔ مجھے بھول نہ جانا۔ یہ۔ وہ۔''

''آپ میرے ہیں......بس یہی کافی ہے۔'' اس نے برجستہ کہا۔ اور اصفہان کو سرور آ گیا۔

''ایک بار پھر کہہ دو یہی جملہ۔'' اس نے فرمائش کی وہ محجوب سی ہو کر چپ ہو گئی۔

☆☆☆

اصفہان کو جاتے ہی کئی فلمیں اور مل گئیں۔ وہ بے حد مصروف ہو گیا۔ گھر میں باقاعدگی سے فون کر رہا تھا، تین ماہ میں وہ صرف ایک بار گھر آیا وہ بھی اس طرح کہ رات کو آیا اور دوپہر کو واپس۔ شہوار سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ مل سکا بہن، بھائی اور امی اسے گھیرے رہیں۔ صبح ہی صبح شہوار کو لے کر بینک گیا دو لاکھ روپیہ اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرایا۔ یہ کہہ کر یہ خالص تمہارے میاں کی کمائی ہے۔ اور اسے کیا دو

لاکھ گاؤں سے۔ آتے ہوئے اس کے پرس میں تین ہزار روپے تھے جو شادی تک یونہی پڑے رہے جو جیہ لائی پہن لیا جو چچی نے دیا استعمال کرلیا۔ اور جاتے ہوئے اس نے مژدہ سنا دیا تھا کہ اب اس کی مستقل رہائش لاہور میں ہوگی وہ جلد ہی اسے بلوائے گا کہ وہ تقریباً تمام فلموں کا مستقل ہیرو ہو چکا ہے، گھر میں جس دن اخبار آتا اور اس کی خبر اور تصویریں ہوتیں، سارا دن وہ اخبار میں گردش کرتا یہاں تک کہ ملازمین بھی خوش ہوتے عام زندگی بھی وہ گلیمر بوائے رہا تھا۔

اب تو فلم کا دل دھڑکانے والا ہیرو بن چکا تھا۔

سات ماہ شہوار نے اس کے دور گزارے مگر وہ ساس نندوں کی اتنی چہیتی تھی کہ اسے کبھی کوفت و رنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اور ایک خوبصورت دن میں لاہور چلی آئی۔ جیہ سے نہ مل سکی۔ وہ وسیم کے ساتھ حیدرآباد گئی ہوئی تھی۔ اسے اپنی زندہ دل بہن سے مل کر نہ آنے کا بہت رنج ہوا۔ تھا۔

سسرال میں محتاط رہ کر اور ان کا معیار جانچ کر وہ اس قابل ہو چکی تھی کہ گھر کو پررونق انداز میں سجا سکے۔ اس نے گھر سیٹ کیا۔ یہ فلمی ستاروں کی بستی تھی۔ جہاں کی رونقوں و ویرانیوں کا کوئی دین ایمان نہیں تھا۔ کبھی ہر سو رونق نظر آتی، کبھی سب ہی اسٹوڈیو سدھارتے ہوتے۔ یہاں کے ملازمین کے پو بارہ تھے۔ کام کم کرتے باتیں زیادہ۔ مالکان گھروں سے غائب رہتے۔ اصل مالک ملازم ہی نظر آتے۔

شہوار نے تو خانساماں کے لیے منع کر دیا تھا۔ مگر اصفہان نے بتایا کہ خانساماں رکھنا بھی اسٹیٹس سمبل ہوتا ہے۔ سارے گھر میں قالین بچھے تھے۔ وہ صبح ہی صبح ویکیوم کلینر لے کر کھڑی ہو جاتی۔ اصفہان نے اسے منع کیا۔

"تم بہت بڑے ہیرو کی بیوی ہو۔ یہ نیچ کام تمھیں زیب نہیں دیتے۔" وہ برتن دھوتی تو سمجھاتا۔ "ہاتھ کھردرے ہو جائیں گے۔ بوڑھوں کی طرح۔ تم ہیرو کی بیوی ہو۔ ہیرو کی جوانی بے حد طویل ہوتی ہے تمھیں بھی اس طرح جوان اور توانا نظر آنا

ہوگا۔"

"اور ہاں یہ بھی سن لو ابھی ہمیں بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بچہ ہو گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ میری عمر زیادہ ہے۔" شہوار ہونقوں کی طرح سب سنتی رہتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر سال میرا آغاز اس طرح ہو جیسے میرا فلمی کیریئر ابھی شروع ہوا ہے۔ نفسیاتی طور پر میں تازہ دم رہوں گا۔ تمھیں اسی طرح میرا ساتھ دینا ہے کیا سمجھیں۔"

"خاک سمجھی!" وہ بجھ کر سوچتی۔

وہ فلمی تقریبات میں بہت ہی کم شریک ہوتی تھی۔ اصفہان بھی زیادہ اصرار نہیں کرتا تھا۔

ایک دن گھر کو سجا سنورا دیکھ کر اسے اچانک خیال آیا۔ اصفہان سے بولی۔

"میں کچھ کہہ رہی ہوں سن رہے ہیں۔؟"

"ہوں!"

"اللہ نے گھر دیا ہے خوب سجا بنا لیا ہے۔ پرسوں امی جان بھی آرہی ہیں میلاد اور قرآن خوانی کرا لیتے ہیں۔"

"جیسے مرضی تمہاری مگر آئے گا کون۔؟"

"کیوں دن رات اتنے لوگ جو ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں کیا ان میں سے کسی نے قرآن نہیں پڑھا ہوا؟"

"تم نہیں سمجھتی ہو، کراچی جا کر کرا لینا۔"

"کیوں کرانا تو نئے گھر میں ہے۔"

"اچھا بابا!" وہ جھنجھلا گیا۔ تب وہ سہم گئی اس مردوں کے غصے سے ویسے ہی خوف آتا تھا آج کل ویسے ہی جھلایا رہتا تھا۔ وہ خاموش ہو رہی۔

دن رات کی شوٹنگ، ریہرسل۔ اس نے مردوں کے یہ انداز کب دیکھے تھے، محبت کے نام پر یہ شخص ملا تھا وہ ہمہ وقت محبت ہی مانگتی تھی اور وہ کبھی رات چار بجے کبھی

صبح آتے ہی یہ کہہ کر سو جاتا، جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ دس بجے سے پہلے نہ جگانا۔“

دس بجے اٹھتا تو سیکرٹری تمام دن کا پروگرام بتا دیتا۔

اسے گم صم دیکھ کی تسلی دیتا۔ شروع شروع کا زمانہ ہے ناں۔ ہدایت کار۔ فلم ساز کی نگاہ میں اچھا بننا ہے۔ فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

دادی سیدہ مجاب اختر کی تعلیم تھی کہ مرد کے آگے زبان کھول دو تو تباہی کے در کھل جاتے ہیں۔ جو ہونٹ سیئے گا، خون کے گھونٹ پیئے گا اور جیے گا آخر میں وہی ہنسے گا۔

ایک دن جیہ کے سامنے بات ہوئی تھی۔ اسی طرح تب اس نے تنگ کر کہا تھا۔ ”یہ بڑے فارمولے بنا جاتے ہیں اور ان کے لاگو کرنے کا ٹائم گول کر جاتے ہیں۔ وقت زمانہ گھڑی موقع الگ ہو سکتا ہے، ہر انسان کے لیے فارمولے دینا حماقت ہے۔“

وہ جیہ کی منہ زوری پر خاموش ہو رہی تھی۔ اس کا دل دادی کی تعلیم کو جھٹلانے لگا۔ نہیں بعض اوقات منہ بند رکھنے سے تقدیر کے دروازے پر پچھتاوے کے قفل بھی پڑ جاتے ہیں۔ میں کیوں ہمت نہیں کرتی۔ اس سے کیوں نہیں کہتی مجھے میرا اصفہان چاہیئے۔ کہاں چلا گیا ہے وہ...... مجھے اپنے گھر کا نمائشی سامان بنا کر؟ جو چار بجے، تین بجے اندھیرے آ کر کوٹ ٹائی اتار کر اسے دیتا ہے۔ اور کہتا ہے، لڑنا مت، کل جلدی اور اس قرب کی خاطر جو ہفتوں میں نصیب ہونے لگا تھا پھر اس کی خدمتوں میں لگ جاتی۔

کتنا چالاک ہے، شروع میں کہہ دیتا ہے لڑنا مت، بھلا میں کب لڑ سکتی ہوں، کیوں لڑ سکتی ہوں۔ اخبار پڑھتی تو کانپ جاتی پھر اسے کہہ دیتی۔

”اخبار والے بھی خوب ہیں ایسے ہی جھوٹی سچی باتیں لکھ دیتے ہیں۔ بھلا کنول تو صرف آپ کی ہیروئن ہے“ یہ کہتے ہوئے اس کا دل چینخیں مارتا۔

”کہو اصفہان! تم بھی کہو۔! اخبار والے جھوٹے ہیں، ہیں ناں؟“

محبت کی شادی میں یہی ہوتا ہے۔ ایک فریق کی بے توجہی دوسرے کو ہمہ وقت سولی پر لٹکا دیتی ہے۔ محبت کرنے والے گھٹا باندھ کر آنے والے ظالم سماج سے

محفوظ رہیں اور آسانی سے مل جائیں تو کبھی بات نہیں مگر وہ جو زمانے سے لڑ کر ایک دوسرے کو اپناتے ہیں گویا انگاروں پر پاؤں رکھتے ہیں۔

محبت کی گرم جوشیاں سرد پڑنے لگیں۔ تو زیادہ نقصان مرد کا نہیں عورت کا ہوتا ہے۔ عورت کا ایک مرد کی خاطر زمانے سے لڑنا بجائے خود ایک اہم قدم ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنے دروازوں سے سر نکال نکال کر اسے سمجھاتے ہیں شادی کے بعد اگر وہی ٹھکرا دے جس کی خاطر ہر کھلے دروازے کی پناہ گاہ کو جوتے کی نوک پر رکھا تھا تو لوگ چٹخنیاں چڑھا لیتے ہیں اور نام پوچھ کر دروازہ کھولتے ہیں۔ بند دروازوں کے پیچھے استہزاء وافتخار جاری رکھتے ہیں۔ اپنی دور اندیشی پر نازاں ہوتے ہیں۔ ہم نے نہ کہا تھا؟ کہہ نہ دیا تھا ہم نے؟

محبت کی شادی میں تمام اجزاء اگرچہ وہی ہوتے ہیں جو روایتی شادی میں ہوتے ہیں مگر ایک عورت جو اہم جز ہوتی ہے مضبوط اعصاب کی درکار ہوتی ہے۔ جسے شوہر کی بلند آواز کو قید کرنے کا فن بھی آتا ہو۔ جو صبر وضبط و برداشت میں اپنی مثال ہو۔ کہ اگر امتحان آپڑے تو بات بنائے رکھے۔ امتحان تو ہر شادی میں آتے ہیں۔

مگر محبت کی شادی میں امتحانوں کا زمانہ گویا سکرات کا وقت ہوتا ہے اپنی غمگسار، اپنی ہمراہ عورت خود ہوتی ہے۔

اگر زبان کھولتی ہے ایک ٹھٹھول ہوتا ہے۔ اپنی عقل ثابت کرنے کا سنہری موقع۔ کہا تھا ہم نے سمجھایا تھا ہم نے؟ اس کا جی چاہتا وہ چیخ چیخ کر کہے۔ میرا کوئی نہیں، مجھے محبت دو۔ میرا دکھ سنو۔ مگر ایسا لگتا کہ جیہ کی استہزائیہ ہنسی کا سنسناتا تیر اس کے جگر میں پیوست ہو گیا ہو۔ حسان تالیاں پیٹ رہا ہو، ساجدہ چچی کے ماتھے پر کبھی نہ مٹنے والے بل پڑ گئے ہوں۔ وہ فطرتاً بزدل لڑکی تھی۔ حالات کا ذرا سا دھچکہ اسے فکرات کے طوفان میں دھکیل دیتا۔

دادی یہ بھی کہتی تھیں جو عورت اپنے گھر میں خوش ہوتی ہے اپنے گھر کی ملکہ ہوتی ہے اپنے شوہر کے من کی رانی ہوتی ہے باہر کی دُنیا بھی اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی

ہے۔ وہ عورت بے حد معزز ہو جاتی ہے۔ اس کا دوسروں پر رعب ہوتا ہے۔ ایسے محفلوں میں اس کے حصے کی بھرپور توقیر ملتی ہے۔ اگر لوگوں کو یہ پتہ چل جائے اس کے گھر جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔ جھٹ اخلاق کی کمانیں سمیٹ لیتے ہیں۔ اپنی عنایتوں کی لگا میں پیچھے کھینچ لیتے ہیں۔

اگر وہ خوش نہیں تھی تو کم از کم بھرم رکھنے پر تو قادر تھی، ایسے ہی بھرم کے موسم میں اس نے ایک بیٹی کو جنم دے دیا۔ اصفہان خوش تھا نہ رنجیدہ بلکہ مصروف تھا۔

غسل کے بعد اس نے اصفہان کے ہمراہ ایک ہدایت کار کی بیٹی کی شادی اٹینڈ کی۔ کھانے سے پہلے دونوں میاں بیوی فلمی صحافیوں میں گھرے بیٹھے تھے۔

''مادام! آج تک آپ کا مکمل نام معلوم نہیں ہو سکا؟'' ایک نوجوان صحافی نے دیرینہ آرزو بیان کی۔ ''جی، مجھے مسز درشہوار اصفہان کہتے ہیں۔'' اپنے انداز گفتگو پر شہوار خود ہی چونک گئی۔

''کس قدر پیچ و خم ہیں آپ کے نام میں۔'' اسی صحافی نے برجستہ کہا۔

''زندگی میں تو نہیں۔'' شہوار نے بھی بے ساختہ کہا۔ اور خود ہی حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔ (بھرم رکھنا مجھے بھی آ گیا۔ جھوٹ بولنا مجھے بھی آ گیا۔!)

''اور اصفہان صاحب! آپ کا نام کیا خاص شخصیت نے رکھا ہے؟ سننے میں نہیں آیا۔ ایران کا ایک شہر تو ہے مگر کسی انسان کا؟'' ایک فوکس سیٹ کرتے ہوئے فوٹو گرافر نے بھی سوال کر ڈالا۔

''ہاہاہا۔!'' اصفہان ہنس پڑا تھا۔ ''دراصل جب میرے والد اپنا قالینوں کا کاروبار ایران تک پھیلانے لگے تو اصفہان میں قیام کیا وہیں میں پیدا ہوا۔ اور والدین یہ نام رکھ کر گویا وہاں کی یادگار بنا کر مجھے یہاں لے آئے۔'' سب لوگ ہنس پڑے۔ فوٹو گرافر نے حسین و جمیل جوڑے کی بے تحاشہ تصاویر و ٹرانسپیرنسیاں بنائیں۔

☆☆☆

''بڑی اچھی گفتگو کرنی آئی ہے تمھیں۔ میرا مطلب ہے برمحل۔'' اصفہان نے تعریف کی۔

''سارا دن بے کار جو پڑھی رہتی ہوں۔ کراچی سے آئے فون سنتی رہتی ہوں، یا رسائل پڑھتی رہتی ہوں۔ شاید یہ وجہ ہو اچھی اردو کی۔'' بیٹی کے رونے کی آواز پر وہ جلدی سے باہر آ گئی۔

انسان کو ناک کان سے پکڑ کر تبدیل نہیں کیا جاتا وقت خود ایک بڑا معلم ہے۔ اور وہ تو چٹی ان پڑھ بھی نہیں تھی۔ اور انڈوں سے چوزے نکلنے سے پہلے مرغی کیا جانے چیل کب آئی کب اڑی۔ چوزے نکل آئیں تو مرغی کو بھی پر پھیلانا آ جاتے ہیں۔''

☆☆☆

جیہ نے اخبار میں ان کی تصاویر و گفتگو دیکھی تھی۔ اخبار نے خوبصورت چہرے اور خوبصورت باتیں کی ہیڈ لائن دے کر ان کی گفتگو کی بے تکلفانہ مسکراہٹ جیہ کو حیران کر گئی۔ شکر ہے مالک شکر ہے۔ خدا تمھیں اسی طرح مسکراتا کھلکھلاتا رکھے۔ شہوار سدا خوش رہو، اس کے دل نے محبت بھری دعا دی اور اخبار وسیم صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

''دیکھیں! شہوار تو پہنچانی نہیں جا رہی۔'' انھوں نے بیوی کے ہاتھ سے اخبار لے کر بغور دیکھا۔

''ارے بھئی یہ وہی کنفیوژ سی لڑکی ہے۔'' وہ حیران ہوئے۔

''جی! کچھ میں نے ٹھیک کیا۔ اور کچھ اس کے میاں صاحب نے اف خدایا کس قدر کیوٹ لگ رہی ہے۔'' اس نے دوبارہ اخبار لے کر دیکھا۔

''جب سے اس کی بیٹی کی خبر ملی ہے جی چاہ رہا ہے لاہور ہو آؤں۔ کتنے دن ہو گئے ملے ہوئے۔ ہیرو صاحب کو نہ فرصت ملے گی نہ آئیں گے۔ چلی جاؤں؟'' اس نے شوہر کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

☆☆☆

کتنی بڑی بات تھی اتنے امیر گھر میں پیدا ہونے والی بچی کو حفاظتی ٹیکے نہیں لگے تھے۔ شہوار کا ذاتی طور پر تو کسی سے ملنا ملانا نہیں تھا۔ نہ عورتوں میں بیٹھی تھی کہ ان باتوں کا پتہ لگتا۔ بڑی مشکلوں سے بے حد بوڑھی آیا دستیاب ہوئی تھی۔ وہ بھی لاعلم سی تھی۔

بخار آنے پر اس سے پیٹنٹ دوا دے دی۔ اس روز اس نے تین بجے اصفہان کا انتظار کیا کہ اس سے مشورہ کیے بغیر اس نے کوئی کام نہ کیا تھا۔

اگلے روز بخار اتر گیا۔ تو وہ مطمئن ہو گئی۔ مگر رات بخار نے پھر آ لیا۔ تب وہ رات کو ایک بجے بچی کو اٹھا کر برابر والے ڈاکٹر عباس کے بنگلے پر چلی آئی۔ آیا اپنی کسی بھانجی بھتیجی کی زچگی میں دو دن کی چھٹی پر گئی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بے حد توجہ سے بچی کو دیکھا۔ دوا تجویز کی خدشہ ظاہر کیا کہ شاید خسرہ کی آمد ہے احتیاط کیجیے۔

وہ بری طرح گھبرا گئی۔ ڈاکٹر عباس نے تسلی دی، ''ایسے ہی مجھے شبہ ہے۔ بہرحال احتیاط رکھیں۔''

وہ شکریہ ادا کر گھر آئی تو اصفہان آ چکا تھا۔ اور لابی میں ٹہل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

''یہ راتوں کو کہاں اڑی اڑی پھر رہی تھیں بھئی؟''

شہوار کو اس کا انداز تخاطب بے حد ناگوار گزرا۔

''ربیعہ کو سخت بخار ہے۔ ڈاکٹر عباس کے پاس گئی تھی۔ لے کر۔ بالکل نڈھال ہے۔''

''دن بھر کیا بھٹی پر بیٹھتی ہو؟'' وہ طیش سے بولا ''اتنی رات کو ایک غیر شادی شدہ آدمی کے گھر پر جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ ایسے کمزور کردار کی تو نہ تھی کہ شوہر اعتبار نہ کر سکے۔ اور یہ انداز ولب ولہجہ اصفہان کا تو نہ تھا۔

اصفہان کا پہلے ہی دماغ گھوما ہوا تھا۔ کنول نے اس کی کس قدر توہین کی تھی۔

پر چاہتی اسے تھی منگنی کسی تاجر سے کر لی تھی۔

شہوار کیا جانے اسے تو یہی درس ملا تھا کہ عورت گھر سنبھالتی ہے مرد کما کر لاتا ہے۔ شوہر کی اطاعت کرنا فرض ہے۔

وہ تو اس پر بے حد خوش تھی کہ اس کا شوہر اسے محبت سے بیاہ کر لایا ہے کیا خبر تھی اس بے خبر کو...... بعض لوگ بے حد شوقین ہوتے ہیں انھیں پسندیدہ چیزیں جمع کر کے رکھ چھوڑنے کا جنون ہوتا ہے۔ شوق۔ قیمت وحالات کو ٹھوکروں پر رکھتا ہے۔ یہ لوگ پکا سو کے شاہکار کو خریدنے کے لیے تمام عمر کی پونجی بھاڑ دیتے ہیں۔ اس کا شوہر تو حسین تھا مشہور تھا۔ امیر تھا۔ فلمی چڑیلیں اسے تاک کر بیٹھی ہوئی تھیں وہ اسے اس لیے تو بیاہ کر لایا تھا کہ وہ حسین تھی۔ اگر کوئی اور ادا بھی شامل تھی پسندیدگی میں تو کچھ تو دولت کے ڈھیر اور کچھ چڑیلوں نے بھلا دی تھی۔ سراہا جانا آدمی کی جبلی آرزو ہے۔ دن رات اس کی سماعت سے آوازیں ٹکراتی تھیں۔

''تم سا نہیں دیکھا۔ تم کتنے منفرد ہو! تمہاری بیوی کتنی خوش نصیب ہے۔'' وہ مزید ستائش مانگنے کو بھوکوں کی طرح کہتا۔

''میری بیوی کو تو پروا بھی نہیں ہے۔''

''ہائے ناقدری۔''

''ہائے ناشکری۔''

''مجھے ایسا شوہر ملتا ناں تو دیوانوں کی طرح پوجا کرتی۔ ستر پردوں میں چھپاتی کہ کوئی اور اپنائیت کی نظر نہ ڈال دے۔ کاش میں تمھیں پہلے ملتی۔ تم مجھے مل جاتے۔ کس قدر انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ ہمارے اسٹار بھی ایک ہیں۔ چچ چچ۔'' گویا اس سے کہا جاتا تم نے غلطی کی تم نے جلدی کی۔

اب اس نے بات بات پر برسنا شروع کر دیا تھا۔

اور وہ کانپ کانپ جاتی...... مستقبل کے در پر خطرے کی دستک تو اس کے

اعصاب کو پہلے ہی جگا گئی تھی۔ تب ہی تو اس نے اس شادی کے بارے میں بے حد سوچا تھا۔ تب ہی تو وہ کبھی فون پر جیہ کو بھی نہ کہہ سکی کہ جیہ میں اور میری بیٹی بے حد اکیلے ہیں۔

اف خدایا! یہ شخص کیسی چکا چوند ہے محبت کرتا تھا تو نہیں دیکھ پاتی تھی۔ برستا ہے تو مارے ڈر کے نہیں دیکھ پاتی۔ مجھے تو اس کا چہرہ بھی یاد نہیں ہو پایا۔ کیا کروں۔ کیا کروں۔

وہ لاعلم تھی کہ اس کا شوہر عزت و مرتبے کی انتہائی منزلوں پر آ رہا ہے اسے سب پر فوقیت ملتی ہے۔ ایسے مقام پہ انسان اپنی ذات کے لیے حساس ترین ہو جاتا ہے۔ اس کو ذرا نظر انداز کردو، اس کی بات رد کردو تو اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ ذرا ذرا سی بات کو اپنی انسلٹ تصور کرنے لگتا ہے۔ کنول نے اسے بے وقوف بنا کر گویا دم پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ بے حد حسین طرح دار ہوشیار کنول جیسے مرد کے بل کھولنے کی ترتیب پنگھوڑے سے ملی تھی۔ اسے الو بنا گئی تھی اس کے ساتھ اس کی ہر فلم کامیاب گئی تھی۔ ایسے ایسے رومانی سین پکچرائز کراتی، قطعی بے حجابانہ کہ اسے نشہ آ جاتا۔ ایک اس کی بیوی تھی۔ بہشتی زیور میں دی گئی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس کا کہا تو مان لیتی تھی مگر حیادار اتنی تھی کہ کبھی اس کی آنکھوں سے خصوصی پیغام وصول کر پائی تھی۔ کنول کے اس کھلے فراڈ پر اس کا موڈ سخت خراب ہو رہا تھا۔

☆☆☆

بخار اب ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی مگر جانے کیوں بچی نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا۔ اس نے دودھ پلانا چاہا۔ تو اس نے اگل دیا۔ آپا آ گئی تو وہ اسے ہمراہ لے کر ڈاکٹر عباس کے گھر چلی آئی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کر کے بتایا کہ اسے خناق یعنی کنٹھ روگ ہو گیا ہے ابتدا ہی ہے اس نے چائلڈ اسپیشلسٹ کا ایڈریس دیا کہ وہ ہر صورت میں بہتر ڈاکٹر ہے۔ گیارہ بج

چکے تھے گاڑی اصفہان کے ہمراہ تھی اس نے رکشہ لیا اور چائلڈ اسپیشلسٹ کے کلینک چلی آئی...... وہ ساڑھے گیارہ بجے بند کرتا تھا۔ پندرہ منٹ رہ گئے تھے وہ بے حد حواس باختہ تھی۔ آپا نے بچی کو گود میں لے رکھی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"بی بی! آپ کو بھی دھیان رکھنا چاہئے تھا۔ صبح ہی اگر دکھا دیتیں اللہ خیر کرے۔"

بچی کو انجکشن وغیرہ لگوا کر اس نے ساتھ کے اسٹور سے دوا لی۔ اور گھر آ گئی...... بچی آپا کے سپرد کر کے کمرے میں چلی آئی۔

اب وہ مطمئن تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا صرف دو دن کی دوا سے بچی پہلے جیسی ہو جائے گی۔ خطرے کی کوئی بات نہیں...... کمرے میں آتے ہی بھونچکی رہ گئی۔ اصفہان جوتوں سمیت بیڈ پر تھا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟"

"جی!" وہ بات نہ سمجھ کر بلکہ انداز نہ سمجھ کر سٹپٹائی۔

"کہتے ہیں جب انسان جرم کرتا تب ہی ڈرتا ہے۔ کیا ہو رہا ہے تین دن سے؟ وہ برسا۔

"جی؟ اس کم عقل کی سمجھ میں کچھ بھی تو نہ آیا۔ کہ بعض لوگ پڑھ لکھ کر خود کو نفسیات کا باوا آدم سمجھنے لگتے ہیں۔

"یہ کیا جی جی لگا رکھی ہے۔"

"بچی سخت بیمار ہے۔ اسے۔"

"دن میں کیا پہاڑ کاٹ کر نہریں نکالتی ہو۔"

"یہ سب آوارہ عورتوں کے چلن ہیں دن میں سونا راتوں کو......"

"آوارہ...... آوارہ۔ وہ جہاں پر تھی وہیں گڑ کر رہ گئی۔ صفائی پیش کرنے کے بجائے...... اس کی بچی سامنے لا کر پٹخ دی کہ دیکھ لو اپنی آنکھوں سے رونا

شروع کر دیا۔ رو کر ڈر بھی گئی، جھٹ باہر آ گئی۔ اور آج اصفہان کی من مانیوں کا بھگتان تھا زمین پر چاپ پیدا نہ کرنے والے قدم آواز پیدا کر گئے تھے۔ یعنی ایک جھنجھلاہٹ ایک جھلاہٹ کا تاثر آ گیا تھا۔ اس کی چال میں۔

مہمان خانے میں آ کر اس نے شال بیڈ پر پھینکی اور اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ بھی نہیں سن رہے تھے، اس کے کان صرف آوارہ آوارہ کی بازگشت تھی۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اٹھ کر واصفہان کی لائبریری میں چلی گئی۔ رو رو کر اس قدر نڈھال ہو گئی تھی کہ پھر ریوالونگ چیئر پر گر گئی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا دل کہ طفل سادہ تھا۔ اور طفل تو بڑوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔

دادی سیدہ حجاب اختر کہ جنھوں نے پوتی کو پنگھوڑے سے سسرال کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا ان کی حوروں جیسی پوتی بقول ان کے سیپ سے نکلے موتی سی پوتی۔ جنھوں نے اسے سارے جہاں سے چھپا کر رکھا۔ جن کا بس نہیں چلتا تھا کہ مستورات سے مستور کر کے رکھیں۔ کہ یہ سمجھدار عورتیں ان کی پوتی کی معصومیت کو گہن نہ لگا دیں۔

جنھوں نے اسے بتایا مرد عورت کی پارسائیوں کے بارے بے حد حساس ہوتا ہے۔ کم ملو کم گھلو۔ مرد فوراً طعنے مار دیتا ہے۔ وہ عورت ہی کیا جو اپنے آدمی کی نگاہ سے گر جائے۔ عورت کا اصل اور حقیقی ٹھکانہ اس شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ شوہر کا دل ہوتا ہے، شوہر کی نگاہ ہوتی ہے، ان کا ارمان تھا ان کی پوتی ان تمام خطروں سے دور رہے جو ازواجی زندگی میں عورت کو پیش آ جائیں تو اس کا تحفظ چھین لے جاتے ہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ بن ماں باپ کی ہے اور خود ان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اس صورت میں ان کو پوتی کو ایک پر تحفظ گھر ہمیشہ کے لیے ملنا چاہیے۔ جہاں اس کا شوہر اس سے مطمئن اور آسودہ ہو۔

جہاں وہ آرام وخوشی سے اپنی زندگی گزار دے ہو جاتی ہوں گی میاں بیوی

میں لڑائی کے بعد صلح صفائیاں من جاتی ہوں گی بیویاں۔ گالیاں یا ہاتھ لات کھا کر۔ نہیں ملتی ہو گی انہیں کوئی سیدہ حجاب اختر۔ لو بھلا، دونوں دادی پوتی کی ریاضتوں و اعصابی مشقوں کا یہی صلہ ملنا رہ گیا تھا کہ آوارہ کا خطاب مل گیا تھا۔ جو اتنی محنتیں نہیں کرتی تھیں۔ آج ٹھاٹھ سے شوہروں پر حکمرانی کر رہی تھیں۔ یہاں ایوارڈ تو گیا بھاڑ میں تحفظ خوشحالی گئی چولہے میں۔ ''الٹا؟''

اس نے قلم اٹھایا۔ اور اصفہان کے خاص چھپے ہوئے پیڈ پر چلانے لگی۔

پتھر کے نام آخری تحریر!

آپ نے اچھا کیا، مجھے بہانے سے دھتکار دیا۔! آپ کے منہ سے نکلا لفظ میرا انعام ہے جو میرے اور میری بیٹی کے ہمراہ ہے۔ ہو سکتا ہے اگر جیہ اور آپ میرے رفیق نہ رہے ہوتے تو آج میں قوت ارادی اور قوت فیصلہ سے محروم ہوتی۔ آج وہ در شہوار نہیں ہے جو ڈھائی سال قبل انسانوں کی بستی سے نکل کر آدمیوں کی بستی میں آئی تھی قصور آپ کا ہے نہ کسی اور کا۔ بلکہ صرف میرا ہے۔ میری دادی کا ہے۔ جن کی تربیت درس گاہوں کے درس پر حاوی رہی۔ تعلیم انسان کو معاشرت مطابقت کے اصول سکھاتی ہے۔ میں بیک وقت دو درس گاہوں میں رہی۔ مجھے معاشرے کے لیے نہیں صرف سسرال کے لیے تیار کیا گیا۔ بے شک میں آپ کے قابل نہ تھی میں نے محبت کی جرم میرا ہے۔ آپ نے مجھے جیتا۔ غلطی جیہ کی تھی۔ ہم دونوں لڑکیوں کی غلطی۔ آپ سے غلطی نہیں ہوئی آپ مرد ہیں۔ اس معاشرے کا مرد جہاں اس کی اپنی غلطیاں بھی عورت کے کسی جرم کا رد عمل ہوتی ہیں۔ میں جیہ کی بے حد مشکور ہوں اس نے آگہی کے دروا کیے۔ آپ کی بھی آپ نے تنہائی کی دولت دے کر مجھے تجزیاتی صلاحیتیں عطا کیں۔ کھوٹے کھرے کی پہچان کرنا سکھائی۔ آپ بہت اچھے ہیں مگر؟ بہرحال جو انعام جو صلہ آپ نے دیا ہے میں اس کی متحمل نہیں ہوں۔ میں ماں ہوں۔ اگر اس کی اولاد پر بن رہی ہو تو رات کے پہر اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اگر ڈاکٹر مجھے رات کے

دوسرے پہر یہ کہہ دیتا کہ اس کا علاج فلاں پہاڑ پر اگی جڑی بوٹی ہے تو میں اس سمت دوڑ جاتی۔

آج درشہوار جو اس نگری کو چھوڑ رہی ہے باشعور ہے۔ تھوڑی بہادر ہے کچھ پر اعتماد ہے شاید اس لیے کہ ماں ہے۔ آپ کی بیٹی۔ میری بیٹی خدا کی امانت ہے۔ میں اس کو ایسی تربیت دونگی کہ معاشرے میں مطابقت پیدا کر سکے میں دادی سیدہ حجاب اختر نہ بنوں گی۔

مجھے سیاہ رنگ بہت پسند ہے جیہ کہتی ہے ایسے لوگ ہر چیز کا تاریک پہلو دیکھتے ہیں۔ ناامید ہوتے ہیں لہذا مجھے کوئی خوش فہمی نہیں کہ آپ میرے پیچھے آئیں گے۔ خدا آپ کو خوش رکھے میری عمر آپ کو لگ جائے۔!

گنہگار۔ درشہوار

اس نے تھک کر آنکھیں موندلیں اور غافل ہوگئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ باہر آئی خانساماں سے معلوم ہوا صاحب جا چکے ہیں۔ آیا برآمدے میں ربیعہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے اسے لپیٹ لپاٹ کر گود میں لے لیا۔ اور اس کا رخسار چوم کر بولی۔

''اب کیسی ہے میری بیٹی؟ ہیں آیا؟''

''اب ماشاءاللہ بڑے آرام سے ہے۔ بھلی ہے۔ بڑا قابل ڈاکٹر ہے جی یہ تو۔!''

وہ لان میں آئی تو مالی موجود نہیں تھا البتہ اس کا تیرہ چودہ برس کا بیٹا امرود کے درخت پر چڑھا کچے امرود مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔

''غفور!'' اس نے آواز دی۔

''ہن ای آیا جی'' (ابھی آیا) وہ بوکھلا گیا۔ اور اس کے پاس آ کر گھبرائے ہوئے بولا۔''او جی میں تے اے ویکھدا پیا ہی کہ اے پکن لگ پئے کی نئیں نئیں تے

بعد وچ کیڑے پے جاندے نیں۔''

شہوار نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بیس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولی۔ اے رکھ لے توں اپنے کول چھیتی نال پتہ کر کے آویں کہ ظفر پور کیہڑی گڈی تے کدوں جاؤندی اے۔'' (جلدی سے پتہ کرو کہ ظفر پور کو کونسی گاڑی اور کب جاتی ہے)

''لاڑی اڈے تے بیگم صیبہ؟'' (بس اسٹاپ سے)

''آہو۔ ہور کیہ ہوائی اڈے تے۔'' وہ جھلا کر بولی تو وہ سر پرنکی میلی ٹوپی پر ہاتھ رکھ کر دم دبا کر بھاگ لیا۔ اس کے لیے بھی شہوار کی جھلاہٹ نئی تھی۔

اس نے آپا کو ایک ہفتے کی چھٹی دی، ڈس مس اس لیے نہیں کیا کہ پول جلدی کھل جاتی۔ پھر ایک بڑے چرمی بیگ میں ربیعہ کے اور اپنے کپڑے ڈالے کچھ اور ضروری چیزیں اٹھائیں فیڈر دوائیاں۔ اپنا ہینڈ بیگ اور اپنی پرانی سیاہ چادر آنکھوں پر سیاہ گلاسز لگائے اور بالکل تیار ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد غفور آگیا۔ بس تھوڑی دیر میں جانے والی تھی۔ اس نے بیگ غفور کو تھمایا خود ربیعہ کو اٹھایا کاندھے پر ہینڈ بیگ لٹکایا۔

بس میں بیٹھنے سے پہلے اسے تنبیہہ کی ''کسے نوں وی پتہ نہ لگے ظفر پور دا۔ نئیں تے آ کے فیر۔''

''چنگا جی۔'' (اچھا جی) وہ عاجزی سے بولا۔

''بسم اللہ۔!'' وہ سیٹ پر بیٹھ کر زیر لب بولی اس نے چادر اور آگے کھینچ لی۔ بس میں اجڈ مردوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ربیعہ سو رہی تھی۔ اور وہ بے حد پرسکون تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا لاہور سے ظفر پور کا۔

☆☆☆

افتخار حسین نے ایک محنتی آدمی کو گاؤں میں منتظم مقرر کر رکھا تھا۔ جس کی

موجودگی میں ان کی تینوں بہنوں کی اور شہوار کی زمینیں اچھی حالت میں تھیں۔ حویلی صاف ستھری تھی، بوڑھا ملازم اور اس کی بیوی وہیں تھی۔ شہوار کا تانگہ جیسے ہی گاؤں میں داخل ہوا کھیتوں میں کام کرتی عورتوں کے کام کرتے ہاتھ رک گئے۔ وہ ہاتھوں کے چھجے بنا کر دیکھ رہی تھیں۔ کھیت کھلیان کا علاقہ عبور کر کے تانگہ گھروں کی حدود میں داخل ہوا تو شہوار نے گلاسز اتار دیے۔ فجو مزارعے کی شادی شدہ بیٹی چھمو باہر چبوترے پر بیٹھی پتیلیاں رگڑ رہی تھی وہ اس کی بڑی گہری سہیلی رہی تھی۔ پہلے تو اس نے اس فیشن ایبل لڑکی (اس کے نزدیک تو گاگلز و پرس فیشن کی علامت تھے) کو حیرت سے دیکھا پھر راکھ بھرے ہاتھ بھری بالٹی میں ڈال دیے اور بوکھلا کر بھاگی چلی آئی۔

''شہوار بی بی!''

''ہوں۔ کی حال اے تیرا چھمو۔!'' وہ پرس سے کرایہ نکالتے ہوئے بولی۔

''چنگا اے جی اے تہاڈی کڑی اے؟'' (اچھا ہے جی یہ آپ کی بیٹی ہے)

''ماشاءاللہ۔ وڈی سوہنی اے۔''

چھمو نے اس کا سامان اٹھالیا۔ جب تک وہ حویلی میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک جلوس تیار ہو چکا تھا۔

''تسی کلے آئے او'' (تم اکیلی آئی ہو)

''چودھرانی جی نوں کی ہو گیا سی۔'' چودھرانی جی کو کیا ہو گیا۔

''ویاہ کدوں ہویا؟'' (شادی کب ہوئی؟)

''لاڑا کتھے؟'' (دولہا کہاں ہے)

اتنے ڈھیر سارے سوال پھاٹک سے باہر ہی ہو لیے۔ شہری سہولتوں کی عادی ربیعہ اتنا غل غپاڑا دیکھ کر رونے لگی۔

''ارے بھئی چھمو! شاید میری بیٹی کو پیاس لگی ہے گڑیا دیکھو بیٹا! ہم کہاں آ گئے ہیں؟'' انتہائی شائستہ لہجے میں وہ چھمو اور اپنی بیٹی سے بیک وقت مخاطب ہوئی۔

سب اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔ جدید تراش کے شلوار سوٹ و ڈھیلی ڈھالی سیاہ ریشمی بالوں کی چوٹی میں اپنی بچی سے انتہائی تہذیب و وقار سے بات کر رہی تھی۔

غریب عورتیں اس کا بے نیازی کا انداز دیکھ کر بجھ کر رہ گئیں۔ یہ وہی شہوار تھی جو کھیتوں پر ان کے ہمراہ جایا کرتی تھی۔ دادی سے چھپ کر نہر پر سہیلیوں کے ساتھ ان کے کپڑے دھلواتی تھی۔ کتابیں لے کر پڑھنے کے بہانے ان کے ساتھ کپاس چنتی تھی۔ درختوں پر چڑھ کر شہتوت کھاتی تھی۔

''میں نوں لگدا اے اے دا ویاہ کسی وڈے آدمی نال ہویا اے ایس لئی غرور آ گیا اے (مجھے لگتا ہے اس کی شادی کسی بڑے آدمی کے ساتھ ہوئی ہے اس لیے غرور کر رہی ہے) اس کی بچپن کی دو سہیلیوں نے سرگوشی کی۔ انھیں پتہ نہیں تھا کہ وہ اپنی بیمار بچی کی طرف متوجہ ہے۔

بچی کو سلا کر وہ فرداً فرداً سب سے ملی۔ دادی کے ذکر پر گویا اسے رونے کا بہانہ مل گیا۔ چھمو کے گلے لگ کر پاگلوں کی طرح روئی۔ کیوں روئی؟ اصل بات کوئی نہ سمجھ سکتا تھا۔ مگر اس کا جگر خون خون ہو رہا تھا۔ پونجی لٹنے کا احساس ہو رہا تھا وہ سیدھی سادی عورتیں بھی اس کے ساتھ رونے لگیں۔ اس کے دل میں اپنائیت کا احساس جاگا۔ وہاں کس قدر تنہا تھی یہاں کتنے اپنے ہیں۔ اگرچہ غیر ہیں۔ غریب ہیں۔

☆☆☆

اسے آئے پانچ دن ہو گئے تھے بچی آہستہ آہستہ روبصحت ہو رہی تھی وہ اتنی بڑی ڈھنڈار حویلی میں بڑی کلستی رہتی۔ اعلیٰ ترین معیار زندگی اپنانے کے بعد یہاں کی رہائش جانکسل مرحلہ لگ رہی تھی مگر اس کو سہنا تھا عزت و آبرو کے ہمراہ۔ ربیعہ کے ہمراہ اسے اپنا خوبصورت محل نما گھر یاد آتا۔ مودب ملازم یاد آتے اپنا بے تاج بادشاہ یاد آتا۔ جس پر وہ نفرت سے سر جھٹک دیتی ہیں کوئی گائے بکری تھی جسے چارا پانی اور چھپر

دے رکھا تھا۔ یہی تھا میرے خوبصورت خوابوں و حسین محبت کا انجام۔

لعنت ہے ایسے شہر پر جس نے مجھے ستر روگ دے کر روگی بنا دیا۔

میں اپنی نیک نامی کی چادر کو کیسی کیسی دھول مٹی میں اٹا لائی ہوں۔ تو ذرا بڑی ہو جائے پھر تجھے تیری جیہ خالہ کے پاس شہر چھوڑ دوں گی، خود موت کا انتظار کروں گی۔ قسمت تیرے کھیل نیارے۔'' وہ ربیعہ کو لپٹا لیتی۔

وہ کچن میں بیٹھی دہی کا رائتہ بنا رہی تھی کہ باہر شور سنائی دیا۔ اسٹوو کی سن سن میں آوازیں واضح نہیں تھیں۔ اور پھر اس نے جیہ کی آواز پہچان لی۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے برف ہو گئے۔

او۔ میرے خدا! ساری دنیا سے نمٹنے کی ہمت آ گئی ہے مجھ میں مگر جیہ سے؟ جیہ یہاں کیسے میرا گمان ہے۔ اوہیں۔ مگر پرپل سادہ ساڑھی میں جیہ ہی کھڑی تھی دروازے میں۔ وہ اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔

''یہ کیا طریقہ ہے زندگی؟'' جیہ اپنے مخصوص اسٹائل میں بولی۔ تب وہ آنسو پینے لگی۔

''اے بھگوڑی! میں تجھ سے کہہ رہی ہوں بڑی بھولی بنتی تھی ساری دنیا کو منٹ بھر میں بے وقوف بنا کر رکھ دیا۔''

اس نے اسٹوو بند کر دیا اور اسے بڑے کمرے میں لے آئی۔

''سیدھی طرح میرے ساتھ چلو لاہور۔''

''نہیں جیہ! نہ لاہور نہ کراچی، کہیں نہیں۔ بس اب کہیں نہیں۔''

''پھر کہیں جہنم میں؟''

''وہ تو میں آ گئی ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''واہ کیا خوبصورت جہنم ہے کہ جنتیوں کی رالیں ٹپک پڑیں۔ شداد سے ساز باز کر کے آئی تھی دنیا میں کہ تم جنت بنانا اور میں جہنم۔''

اس نے جیہ کو رشک سے دیکھا ذرا بھی تو نہ بدلی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔

''شہوار! بتا رانی! کیا بات ہے؟'' وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

تب شہوار مدتوں بعد ایک مونس و غمخوار پا کر بکھر گئی۔ ''مجھے بخش دو جیہ! میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ چچا چچی کو بھی نہیں۔ پھوپھو کو بھی نہیں حسان بھائی کو بھی نہیں۔ مجھے مر جانے دو۔ مجھے کسی بات کے لیے مجبور نہ کرنا۔ اگر تمھیں میرا کچھ احساس ہے۔ جیہ تو چچی سے کہہ دینا میں بہت شرمندہ ہوں۔ سب مجھے معاف کر دیں۔'' وہ بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

تمھیں خوش دیکھ کر مطمئن کراچی آئی تھی۔ میں تمھیں فون کرتی رہی تھی۔ تم نے اپنے آپ کو اتنا تنہا کیوں سمجھ لیا تھا۔'' جیہ نے اس کے خوبصورت بال سمیٹے۔

''چل آ، وسیم صاحب بھی آئے ہیں۔ کیا کہیں گے کیسی بد اخلاق میزبان ہے۔'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پہلے کیوں نہ بتایا؟'' وہ باہر نکلنے کو ہی تھی کہ بوڑھے ملازم کے ساتھ وسیم صاحب اندر داخل ہوئے۔ اس نے آداب کہا انھوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ملازم نے دو چھوٹے سوٹ کیس فلاسک کیمرہ وغیرہ رکھ دیا۔

''کار سے آئی ہو کیا؟'' شہوار نے پوچھا۔

''ہاں اصفہان کی بلکہ تمہاری کار میں آئے ہیں۔'' وہ وسیم صاحب کی موجودگی محسوس کر کے بے تاثر رہی۔

البتہ دل ضرور دھڑکا کہ یہ لوگ وہاں سے ہو کر آئے ہیں۔

''میں آپ لوگوں کے کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔''

''ہائیں یہ تم آدم خور کب سے ہو گئیں؟ اور پھر ہمارا قصور؟'' جیہ نے تعجب سے کہا۔ تو وہ مسکرا پڑی۔ ''میں نے کھانے کے ساتھ لوگوں کے'' کہا ہے ''لوگوں کو'' نہیں۔'' ہو باہر نکلتے ہوئے وضاحت کرتی ہوئی بولی۔

جیہ نے خوشگوار حیرت سے اس کی حاضر جوابی نوٹ کی۔ وسیم صاحب بستر پر دراز ہو چکے تھے اس لمبے سفر سے تھک گئے تھے۔

☆☆☆

وہ باہر آئی تو نوکرانیاں کھسر پھسر میں مصروف تھیں، اسے دیکھتے ہی بکھر گئیں۔

اس نے نوکرانی کے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا تھا گاؤں میں بجلی آ چکی تھی۔ اس نے آتے ہی ایک ریفریجریٹر نزدیک کے شہر میں جا کر خریدا تھا۔ آج کچھ گوشت وغیرہ اس میں موجود تھا۔ ایک پالتو مرغا اس نے نوکر سے ذبح کرا لیا تھا۔ یوں ان کے کھانے کا انتظام ہو گیا۔ کھانا لگا کر وہ واپس بڑے کمرے میں آئی اندر سے باتوں کر رہے تھے۔ اس نے دروازہ بجایا۔

"ہوں، کون ہے بھئی آ جاؤ۔" یہ جیہ کی آواز تھی۔ تب وہ چلی آئی۔ مگر اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ لکڑی کی بھاری بھرکم کرسی پر اصفہان بیٹھا تھا۔ شہوار کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں۔ اس نے بدقت کہا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام بھئی۔ کیا حال ہیں؟" ایک عجیب سی کھنک تھی اس کے لہجے میں۔

"اچھی ہوں جی!" اس نے فطری سادگی سے کہا مزید بولی۔ "کھانا کھا لیں آپ لوگ۔" وہ سب اس کے پیچھے ہو لیے۔ وہ انھیں وہاں لے آئی جہاں کھانا لگا تھا۔

وہ بادل نخواستہ ان کے ساتھ شریک رہی ذہن سوچوں کی آماجگاہ بنا تھا۔ کیوں آیا ہے؟ اس کے پاس تو نہ وقت ہے نہ فرصت۔ پھر آج؟ سیاہ پینٹ ولیمن کلر بے حد جدید وضع کی شرٹ میں کھویا کھویا، بے حد شاندار نظر آ رہا تھا۔ جیہ اپنے میاں کی وجہ سے زیادہ نہیں بول رہی تھی۔ اس لیے زیادہ باتیں نہ کر سکی وہ شہوار سے کہ اگر بات۔ کرتی تو کوئی بے لگام جملہ خود بخود پھسل جاتا۔ البتہ وسیم صاحب اور اصفہان گاہے گاہے کوئی بات

کر لیتے تھے۔

انہوں نے کھانا ختم کیا۔ خادمہ نے برتن سمیٹے وہ بھی ربیعہ کے دودھ کی وجہ سے اٹھ آئی۔ الجھی الجھی پریشان۔ وہ بالکل سپاٹ انداز میں مشین کی طرح مصروف تھی، اوپر کے دو کمرے ان کے سونے کے لیے کھلوا دیے۔ کھانا کھا کر وہ لوگ چہل قدمی کے لیے نکل گئے تو وہ ربیعہ کو سلانے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

ربیعہ کو سینے سے لگا کر اس نے تھپکیاں دینا شروع کیں۔ میرے بیٹے اب ہم کسی دھوکے کسی فریب میں نہیں آئیں گے۔ کسی پر اعتبار نہ کریں گے۔" اس کی آنکھیں اپنی سوچوں پر بھیگ گئیں۔ اور جیہ کیسی گھنی ہے کہ کچھ بھی تو نہیں بول رہی کہ کیوں آیا ہے۔ بتا رہی تھی کہ پرسوں آئی تھی گھر۔ تو یقیناً وہی اصفہان کو گھسیٹ کر لائی ہو گی۔ وہ سوچتی رہی وہ غنودگی میں تھی کہ کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔

"کون ہے؟" وہ ڈر گئی۔

تب آنے والا پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ اٹھنے لگی تو آنے والے نے اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی تھی پر سمجھنا نہیں چاہ رہی تھی۔

وہ محبت سے بولا۔

"تمہارے لیے تو گھر بنایا تھا۔ چھوڑ کے کیوں آ گئیں۔؟"

اف چوری وسینہ زوری کی حد تھی۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

"میں کیا لگتی تھی آپ کی۔" اس نے بے حد آہستگی سے آنسو پی کر کہا۔

"ارے بھئی، یہ ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہی ہو؟ کیا لگتی ہوں آپ کی کہو۔"

"نہیں، میں آپ کی کچھ نہیں ہوں۔ آپ نے مجھے ایسی گھٹیا گالی دی ہے کہ......" وہ ہچکیوں سے رو پڑی۔

"ایک تو یار میں تو تمہارے رونے سے بڑا تنگ ہوں، غصے میں تو آدمی کیا

کیا بک جاتا ہے۔ یہی ہوتا ہے محبت کی شادی میں۔ شادی سے پہلے باندھی گئی توقعات میں شادی کے بعد کوئی کسر آ جائے تو معمولی سی بات بھی پہاڑ جتنی لگتی ہے۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''شہوار! بلاشبہ یہ درست ہے کہ فلمی دُنیا کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہے۔ وہاں حسن مٹی کے بھاؤ بکتا ہے۔ ہر طرف روشنیاں۔ دولت حسن نظر آتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ واقعی کنول کے ساتھ میرا ذکر اخباروں میں حقیقت پر مبنی تھا۔ میں اس کے بس میں کیسے آ گیا تھا۔ آج بھی حیران ہوں۔ حالانکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ جو عورت باہر کی ہوا کھا کر قناعت سے پھر گئی ہو۔ قطعی سچی و پاکیزہ محبت کی حقدار نہیں ہوتی۔ سچی و پاکیزہ محبت کی حقدار صرف وہی عورت ہوتی ہے جو اپنی ایک ایک چیز اپنی ذات کا ذرہ ذرہ اپنے شوہر کی عظیم امانت سمجھ کر انتہائی احتیاط و حفاظت سے رکھتی ہے۔ شوہر موجود ہو نہ ہو اپنے گرد ہمیشہ حفاظت کی خود ساختہ فصلیں کھڑی رکھتی ہے۔ اس نے ایسے ایسے کرتب دکھائے میں انتقام کی آگ میں اندھا ہو گیا۔ میں بھول گیا کہ میرے گھر میں ایک محبت کرنے والی بیوی اور چاند سی بیٹی ہے۔ وہی میرا سب کچھ ہیں مجھے ان عورتوں ان گھما گھمیوں سے کیا لینا۔ میں نے محنت کرنا ہے معاوضہ لینا ہے۔ اپنے پرسکون گھر جا کر زندگی کا احساس لینا ہے۔ اپنی باحیا بیوی کی سہی سمٹی محبتیں لینا ہیں۔ اپنی بچی کی قلقاریوں سے کھیلنا ہے۔ میں گمراہ ہو گیا تھا شہوار۔ میں نے کنول سے انتقام لینے کی خاطر آج کی مشہور ڈانسر سے محبت کا دم بھرا۔ ان دنوں میں بے حد پریشان رہتا تھا۔ اپنے جاننے والوں سے ازراہ دوستی لیٹرز پر فلموں کا معاہدہ کیا تھا۔ وہ لوگ ادائیگی کے سلسلے میں بہت پریشان کر رہے تھے۔ انھیں پریشانیوں میں تم پر کئی مرتبہ برس پڑا۔ میں یہ بھی بھول گیا میری سادہ بیوی ابھی تک بیوی نہیں بن پائی بلکہ ابھی بھی ایک محبوبہ ہے۔ بیوی بن کر بحرانوں سے نمٹنا نہیں آیا اسے۔ اور پھر جس روز تم یہاں آئیں اس روز صبح کو میں یہی سمجھا کہ شاید تم بازار وغیرہ گئی ہو۔ مگر اس روز تاریخ ساز واقعہ پیش آیا۔

میں شوٹنگ کے بعد ستارہ ڈانسر کے پاس اس کے گھر گیا ہمارا پروگرام یہ تھا کہ ہم پہلے شادی کا جھوٹا اعلان کریں گے۔ کنول کا ردعمل دیکھیں گے۔ پھر میں اپنی بیوی سے نمٹوں گا۔ آگے جو تقدیر۔''

(شہوار کا دل لرز گیا۔ اچھا تو یہ تک ہو جاتا۔)

اصفہان نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ کیوں کہ ربیعہ کسمسانے لگی تھی۔ پھر دوبارہ سر جھکا کر گویا ہوا۔

''پھر میں اس کے گھر گیا۔ اس کے نوکر نے بتایا کہ مالکن اندر کمرے میں ہے، میں اس سے بہت بے تکلف تھا سو اندر چلا آیا۔ وہاں جو میں نے دیکھا شہوار میرے اعصاب ہل کر رہ گئے۔ اس نے مجھے بتایا تھا باپ کے مرنے کے بعد وہ اپنے گھر کی کفیل ہے اس نے دنیا کے بڑے بڑے مظالم سہے ہیں کیونکہ ہر کوئی اسے حسین ہونے کی سزا دینا چاہتا تھا۔ مجھے دیکھ کر گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا ساتھی مجھے خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنی سچی دوستی کا یقین دلاتی رہی تھی۔ خود کو مظلوم ثابت کرتی رہی تھی۔ میں وہیں زمین پر تھوک کر چلا آیا اور شہوار۔'' وہ رکا۔

''تب مجھے احساس ہوا کہ باعصمت عورت کیا ہوتی ہے؟ مجھے افتخار کا احساس ہوا کہ میری بیوی گھر میں ہے تو باوفا باہر جاتی ہے تو اپنی محافظ آپ، ایک یہ ہے اپنے گھر میں غیر محفوظ گھر آیا تو تم غائب یقین کرو میں چکرا کر رہ گیا۔ آیا سن چکی تھی جب تم غفور سے ظفر پور کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا تم اپنے آبائی گاؤں گئی ہو، پھر اپنے بیڈ روم میں آیا تو تمہارے تحریر کردہ خط سے بھی تصدیق ہو گئی۔ تم میری پریشانی کا اندازہ نہیں کر سکتیں سوچتا تھا افتخار صاحب اور جیہ تو بعد کی بات اپنے گھر والوں کا کیوں کر سامنا کروں گا۔ اور قسمت سے جیہ اور وسیم صاحب بھی لاہور آ گئے۔ تب میں نے جیہ کو تمام باتیں بتا دیں۔ شاید تم حیران ہو گئی، جیہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ سے ترش روئی سے پیش آئی۔ اور بہت روئی کہ جانے تمہارا کیا حال ہے، جانے تم کیسی ہو؟ اور یہ کہ اگر تمھیں

کچھ ہو گیا تو وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی خدا کا شکر ہے تم اچھی ہو۔ وگرنہ جیہ نے نپٹنا، مجھے اگر دنیا میں خدا کے بعد کسی سے ڈر لگتا ہے تو جیہ سے اور اب تو تم سے بھی لگنے لگا ہے! اپنی ذات میں تم بھی زبردست چیز ہو گئی ہو۔

اور تم نے اپنی دادی جان محترمہ مرحومہ کو مورد الزام ٹھہرایا۔ کہ ان کی محدود تربیت نے تمھیں۔ لیکن جان! حسن میرے لیے اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ دادی جان محترمہ نے تو تمھیں ایسا تراشا ہوا ہیرا بنا دیا ہے جو بے مثال ہے تمہاری تربیت تمہاری جیت ہے۔ باہر کسی عورت سے سرکشی سے یا ادا سے میری بات رد کی تو مجھے تمہاری اطاعت یاد آئی۔ کسی دوست نے برابری کی بنیاد پر بلند آواز سے اُلجھنے کی کوشش کی تو مجھے تمہارا احترام یاد آیا۔ کسی عورت نے مجھ سے زیادہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کی تو مجھے تمہاری حیا یاد آئی۔ دادی جان محترمہ نے تو تمھیں ایسا آئینہ بنا دیا ہے کہ ہر عورت اپنی شکل خواہ وہ اچھی ہو یا بری دیکھ کر اپنی ذات کا تعین کر سکتی ہے۔"

"اور محترم و معزز بہنوئی صاحب! بندی کو بھی یاد رکھیے جو آپ کے آئینے کی وقتاً فوقتاً گرد جھاڑنے کا فریضہ انجام دیتی رہی ہے!"

جیہ نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ اصفہان، شہوار کے پاس سے ہٹ گیا۔ بیوی کی شوخی پر پیچھے آتے وسیم صاحب بھی مسکرا دیے۔

"بات یہ ہے شہوار بیگم! تمھیں معلوم نہیں کہ تمہارے نصف بہتر فلمی دنیا چھوڑ کر کراچی میں گلاس فیکٹری لگا رہے ہیں۔ اور اب یہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر آئینے، شیشے کی باتیں کریں گے۔"

جیہ اور اصفہان کے بلند قہقہوں میں وسیم صاحب کا چھوٹا سا قہقہہ اور شہوار کے مسکراہٹ شامل تھی۔

☆☆☆

یہ راندہ لوگ

"باجی!...... باہر ایک لڑکے کو کوکب آنٹی نے مرغا بنایا ہوا ہے۔"

میں نہ جانے کیا کر رہی تھی کہ ایک دم چونک پڑی...... غیاث ہنس رہا تھا......

اس کی عمر کے مطابق یہ ایک ایڈونچر تھا...... مگر میرا ذہن بہت کچھ سوچنے لگا......

ہمارے برابر والا مکان...... مکان نمبر ۱۷......

اس مکان سے میری زندگی کے بہت سے واقعات منسوب ہیں۔

یہی وہ مکان ہے...... جہاں گرمیوں کی لمبی دوپہریں میں نے خالدہ کے ہمراہ "گڑیا گھر" یا "آپا آپا" کھیلتے گزاری تھیں۔

پھر ایک ساتھ پڑھتے ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے کافی وقت گزرا۔

میری زندگی کی معصوم اور حسین ترین عیدیں اس مکان کے اولین مکینوں سے وابستہ ہیں۔

مگر ۱۹۷۶ء میں، میں نے اپنی زندگی کا یادگار دُکھ اٹھایا۔

جب خالدہ نے یہ گھر بیچ کر دوسری جگہ رہائش اختیار کر لی۔

خالدہ کی سنگت چھوٹنے کا جو دکھ مجھے لاحق ہوا تھا، اس سے نجات مجھے آج بھی نہیں ملی۔

اس مکان کے نئے مالک نے مکان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کرائے پر اُٹھا دیا۔ اس دن سے گزشتہ سالوں تک کرائے دار آتے اور جاتے رہے۔

۱۹۸۵ء میں اس گھر میں آخری کرائے دار آئے۔ یعنی پھر اس مکان کے مالک نے پورے گھر کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ اور کرائے پر اٹھانے کا سلسلہ ختم کر دیا۔

یہ جو کہانی میں نے آغاز کی ہے یہ انھی آخری کرائے داروں کی ہے۔ جس وقت ان لوگوں نے مکان میں قدم رکھے۔ مجھے یہ لوگ عجیب پُراسرار سے دکھائی دیے۔ صبح کے وقت اس گھر میں مکمل تالا ہوتا تھا۔ یوں بھی میری طبعیت ایسی ہے کہ میں تعلقات میں شاذ ہی پہل کرتی ہوں اور نہ ہی مجھے دھیان آتا ہے کہ مجھے نئے لوگوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔

باہر بارات گزر رہی ہو یا تعزیہ۔ میں کبھی گیٹ کی طرف نہیں بھاگتی اور نہ ہی کسی اور جگہ سے دیکھنے کو بے چین ہوتی ہوں، جس کام میں مصروف ہوتی ہوں، بس اسی میں مشغول رہتی ہوں، مگر یہ لوگ مجھے شروع ہی میں چونکانے میں کامیاب ہو گئے۔

ایک خوبصورت سا بچہ گھر میں داخل ہوا۔ بڑا خود اعتماد اور ایکٹو سا...... بلا کا پُرکشش...... میں نے اس سے بات چیت شروع کی......

''آپ کا نام؟''

''عمیر......''

''پڑھتے ہیں؟''

''جی نہیں...... ویسے ہم اسکول میں داخل ہونا چاہتے ہیں پہلے ہم پڑھتے تھے جب ہم ابو کے پاس ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے نا تو پھر وہیں اسکول میں ایڈمیشن لے لیں گے۔'' انتہائی بے پروائی سے جواب ملا

''آپ کے ابو کیا، باہر ہیں؟''

''ہا...... ہا......ہا......'' بڑی پیاری کھلکھلاہٹ تھی۔ ''باہر...... ملک سے باہر......؟ جی نہیں وہ تو حسن اسکوائر میں رہتے ہیں۔''

''اور آپ کی امی؟''

''وہ یہیں رہتی ہیں۔''

میں کچھ کچھ سمجھنے لگی۔

''یہاں گھر میں کون کون رہتا ہے؟'' اب میں نے سن لینے کے لیے حق ہمسائیگی ادا کیا۔

''امی رہتی ہیں......عمیر بھائی، سمیر بھائی......اور اظفر بھائی۔''

''یہ تینوں آپ سے بڑے ہیں؟'' گویا میں نے جیسے سب کچھ جان لینے کا اصرار کیا۔

''عمیر بھائی اور سمیر بھائی ہمارے بھائی ہیں......لیکن وہ جو اظفر بھائی ہیں نا......وہ ہمارے بھائی نہیں ہیں۔''

''اچھا، وہ کیسے؟'' میں کچھ الجھی۔

''وہ ہماری امی کے ساتھ رہتے ہیں اس لیے ہم انھیں اظفر بھائی کہتے ہیں۔''

اب میں معاملہ سمجھ گئی۔

''اچھا چھوڑیں...... یہ بتائیں، آپ حسن اسکوائر کب جا رہے ہیں؟ اب تو آپ کو باقاعدہ اسکول جانا چاہیے خاصے بڑے ہیں آپ تو۔'' ''آپ ہمیں پڑھا دیا کریں نا......آپ پڑھاتی ہیں نا......؟'' وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

”مگر میں آپ کو حسن اسکوائر پڑھانے تو نہیں جا سکتی آپ اگر یہاں رہتے تو میں آپ کو ضرور پڑھاتی۔“

”اچھا، ہم ابو سے کہیں گے کہ ہمیں امی کے پاس رہنے دیں۔“ وہ عجیب سی یاسیت سے گویا ہوا اور میرا جی چاہا کہ میں اتنے معصوم قلب سے اداسی کا سایہ تک مٹا دوں۔

☆☆☆

”سر...... چھاپا پڑ گیا ہے۔“

”کئی آدمی پکڑ لیے گئے ہیں۔“

”تم...... نکمے...... حرام خور......“

”کٹ۔“ غیاث کی آواز آئی۔

میں کمرے سے باہر آئی تو سر پیٹ کر رہ گئی۔ غیاث آج پھر محلے کے لڑکوں (بچوں) کو جمع کیے فلم بندی میں مصروف تھا۔

فلم میں کام کرنے اور ہیرو بننے کی تمنا کرنے والے لڑکوں کے بارے میں تو بہت کچھ سن دیکھ رکھا تھا۔ مگر میرے اس نو عمر بھائی کو فلمی رائٹر بننے اور فلمیں پروڈیوس کرنے کا شوق خدا معلوم کہاں سے ورثے میں ملا تھا۔

امی نے شادی کے بعد بہ مشکل دو تین فلمیں دیکھی ہوں گی۔ والد صاحب کا یہ حال کہ بقول ان کے جب وہ حیدر آباد میں تھے تو فلم ”وعدہ“ جانے کتنی بار دیکھنے گئے تھے کیونکہ ہر مرتبہ انھیں سینما میں سوتے سے اٹھایا گیا۔ (یہ میری پیدائش بلکہ والد صاحب کی شادی سے پہلے کی بات ہے)۔

ہر بار سوچ کر جاتے کہ آج فلم پوری دیکھیں گے اور ہر بار سو جاتے۔ غیاث کے خمیر میں پوری کی پوری فلم انڈسٹری نہ جانے کیسے گندھ گئی تھی جبکہ ماں باپ کا یہ حال رہا۔

ہماری تو سات پشتوں میں کوئی فلم میکر نہیں ہوا

کیا ہو رہا ہے بھئی، کیوں گھر میں ہنگامہ کر کے رکھتے ہو؟“ بلاوجہ بچوں کا اژدہام دیکھ کر مجھے الجھن سے سی محسوس ہوئی۔ اچانک میری نگاہ سامنے پڑی۔ ایک سانولا سلونا سا بے حد پرکشش بچہ عمر تقریباً دس بارہ سال ہو گی۔ مجھے سب بچوں میں نیا دکھائی دیا۔

یہی وہ بچہ تھا جو غیاث کی زیر ہدایت ایکٹنگ کر رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ میں نے بچے کی سمت اشارہ کیا۔

تمام بچے کچھ شرما کر کچھ سہم کر ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔

”یہ...... عبیر کا بھائی ہے، کوکب آنٹی کا بیٹا...... آپ نے کوکب آنٹی کو دیکھا ہے باجی؟“ غیاث نے تعارف کے ساتھ سوال بھی داغا۔

”نہیں بھائی۔“ میں نے بچے کی سمت دیکھ کر بے پروائی سے کہا۔ ”اس کا کیا رول ہے تمہاری فلم میں؟“ میں نے اپنے کام کی طرف پلٹتے ہوئے پوچھا۔

”یہ اسمگلروں کا سرغنہ ہے۔“ غیاث نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

اس سہمے سہمے سے کم اعتماد سے بچے کی سمت دیکھ کر مجھے اس کے رول پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس طرح ہمسائی کے دوسرے بیٹے سے میری ملاقات ہوء۔

پھر بھی میری فطرت میں تبدیلی نہ آئی یعنی مجھے قطعی کوئی شوق نہیں تھا کہ میں جا کر اس سے ملاقات کروں، سوچا نہیں تھا کہ میں جا کر اس سے ملاقات کروں، سوچا جب رہیں گی...... تو ملاقات بھی ہو جائے گی۔

ایک روز شام کو (ماہِ رمضان آ چکا تھا) میں مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر باہر کی سمت آئی تو تیز خوشبوؤں کے جھونکے ہوا کے ساتھ آئے۔ جیسے کوئی گیٹ کے اس پار سڑک پر گزر رہا ہو...... چوڑیوں کی کھن کھن ہوئی۔

پھر ساتھ والے گھر میں کھڑ پڑ ہوئی۔ غالباً ہمسائے کہیں سے آئے تھے۔ اتنی

تیز خوشبوؤں نے ہمسایوں کی طبیعت و انداز مجھ پر منکشف کیے۔

تھوڑا سا جو دل بھی چاہا تھا کہ ان سے ملوں، یہ آرزو بھی معدوم ہوگئی۔ (اللہ معاف کرے)

میرے ذہن میں کوئی خوبصورت امیج نہیں بنا تھا۔

پھر عبیر کی گفتگو سے بھی اس کی ماں کے بارے میں کچھ اچھے احساسات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ میں برآمدے میں کسی کام کے سلسلے میں آئی تو ایک انتہائی کراری آواز سنائی دی۔

''اس سے کہنا...... وہ حرا کی گرد بھی نہیں پا سکتا۔ ایسی تیسی کر دوں گی...... کی۔'' قدرے خاموشی کے بعد آواز پھر بلند ہوئی۔ اس سے کہنا، اس کی حیثیت کیا ہے، منڈی میں بیچوں تو کوئی مفت نہ لے۔''

یا الٰہی، کیا آفت ہے...... ایسی گھن گرج...... میں نے شکر منایا کہ ان لوگوں سے ہمارے تعلقات نہیں ہیں۔

''ٹانگیں توڑ دوں گی...... کی۔''

لگتا تھا، خاتون بات بات میں گالی بکنے کی عادی تھیں۔

اب تو میں بضد ہوگئی کہ کسی قیمت پر بھی ان ہمسایوں سے مڈبھیڑ نہ ہو۔

خدا کی پناہ، عورت ہے یا......

پتا چلا کہ عبیر کی سب سے بڑی بہن ہے جس کا نام حرا ہے۔ اسی کے حوالے سے یہ گھن گرج تھی اور وہ جو شروع میں کسی لڑکے کے مرغا بننے کا ذکر ہے، ان کا قصہ یہ ہے کہ موصوف بنی ٹھنی ماں بیٹی کے پیچھے چاکلیٹی ہیرو بنے آ رہے تھے۔ اور پیچھا کرتے ہوئے گھر تک آ گئے تھے تو عبیر کی ماں نے اپنی دہلیز پر مرغا بھی بنایا اور پٹائی بھی کی۔

ان ماں بیٹی کے اطوار دیکھ کر تو مجھے وہ لڑکا بے قصور ہی نظر آیا۔ جب من پسند

مٹھائی پلیٹ میں کھلی پڑی ہو تو کس کا دل کھانے کو نہیں چاہے گا؟

☆☆☆

''باجی!''

''ہوں؟''

''کوکب آنٹی کی بیٹی حرا اغوا ہوگئی۔ باہر پولیس وین کھڑی ہے۔''

''یا اللہ!'' میری تو ٹانگیں کانپ گئیں۔'' یہ کیا تماشا ہونے لگا ہے یہاں آئے دن...... اور یہ تم کیسی خبریں لاتے رہتے ہو...... آرام سے نہیں بیٹھا جاتا تم سے؟'' میں غیاث پر خفا ہوگئی۔

''میں ان کے گھر تھوڑی گیا تھا۔ میں آ رہا تھا، پولیس وین دیکھ کر میں نے جب پوچھا تو یہ بات معلوم ہوئی۔''

''اچھا، تم گھر میں بیٹھو۔ خبردار جو پرائیویٹ جاسوس بننے کی کوشش کی۔''

سچی بات یہ تھی کہ میں اس خبر پر اُلجھ گئی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ ہمسایوں کے ہاں اظہارِ تاسف کے لیے چلی جاؤں اور پھر یہ سوچتی کہ نا بابا، اچھے خاصے خطرناک لوگ معلوم ہوتے ہیں۔

گھر میں میری خالہ زاد بہنیں آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے خاصا اشتیاق ظاہر کیا، باہر کی کارروائی کے بارے میں۔ میں نے انہیں بھی تاک جھانک سے باز رکھا۔ حد درجہ احتیاط پسند ہونے کی وجہ سے کہ بھائی ہم تو ہمسائے ہیں۔ خدا معلوم ہم ہی بلاوجہ لپیٹ میں آ جائیں۔

ایک دو دن کے وقفے کے بعد پتا چلا کہ کوکب آنٹی کی صاحبزادی اغوا نہیں ہوئیں بلکہ فرار ہوئی ہیں اور انہوں نے نکاح کر لیا ہے، جس سے وہ چاہتی تھیں۔

ظاہر ہے، ایسے مواقع پر اس قسم کی خبروں کے کیا تاثرات ہو سکتے ہیں۔ میں نے غیاث کو سختی سے منع کیا کہ وہ برابر والوں کے ہاں نہ جایا کرے، پھر مجھے کسی اور کے

ذریعے پتا چلا کہ کوکب آنٹی کے شوہر یعنی انور بھائی گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ (یہ خیال رہے، میں نے ابھی کوکب آنٹی کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔)

ایک روز عصر کے وقت میں مشین میں کپڑے ڈالنے میں مصروف تھی کہ غیاث ایک مہر شدہ سخت سا کاغذ لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔

”باجی، یہ عمیر نے دیا ہے۔ کہہ رہا ہے، آج ڈاک سے آیا ہے۔ اس کی امی کہہ رہی ہیں ذرا پڑھ دیں، یہ کیا چیز ہے۔“ (گویا کوکب آنٹی زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔)

میں نے گیلے ہاتھوں سے ہی وہ کاغذ تھام لیا۔ یہ ایک عدالتی اطلاع نامہ تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ فلاں دن، فلاں سن، فلاں تاریخ کو کوکب کی شادی اظفر سے انجام پائی اور آج یعنی فلاح تاریخ کو اظفر، کوکب کو طلاق دے رہا تھا۔

خاصی ثقیل انگریزی میں متن درج تھا اور طلاق کا لفظ تین بار دہرایا گیا تھا اور اس پر وکیل......اور اظفر کے دستخط موجود تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار اس قسم کی کوئی تحریر پڑھی تھی۔ سچی بات ہے، میرا تو دل ہی دھک سے رہ گیا۔

میں نے غیاث کو عام سے انداز میں بتایا کہ یہ طلاق نامہ ہے۔ اظفر کی طرف سے کوکب کے لیے۔

غیاث باہر چلا گیا۔ چند منٹ بعد اُفتاں وخیزاں بھاگا ہوا واپس آیا۔

”باجی، جلدی سے چلیں......کوکب آنٹی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔“

ایک لڑکی ہونے کے ناتے کوکب آنٹی کے لیے میرے دل میں ترحم آمیز جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ ایک عورت دوسری بار ٹھکرائی گئی تھی۔ مجھے حقیقتاً اس بات سے دکھ پہنچا تھا۔ میں دوپٹا اٹھا کر غیاث کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

میں جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ میری نگاہ نے دیکھا کہ بڑا بیٹا عمیر انتہائی

دھان پان سی عورت کو بازوؤں میں اُٹھائے بستر کی طرف آ رہا تھا۔ یہ میرا اور کوکب آنٹی کا پہلا آمنا سامنا تھا۔

”کیا ہوا عمیر! تمہاری امی کو؟“

”باجی، وہ جو آپ نے پڑھا ہے نا......، میں نے امی کو وہی آ کر بتایا تھا۔ امی سنتے ہی گر گئیں۔“

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اطلاع نامہ پڑھ کر میں نے کوئی جرم کیا ہو۔ وہ کم عمر سا بچہ مردانہ وار حالات کی سنگینی سے نمٹ رہا تھا۔ بالکل بھی گھبراہٹ اس کے چہرے پر نہیں تھی۔

”میں یہاں بیٹھی ہوں۔ تم غیاث کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو لے آؤ؟“

دونوں لڑکے ڈاکٹر کو لینے چلے گئے...... میں کوکب انٹی کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ ان کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

انتہائی نکیلے کٹیلے نقوش تھے۔ رنگ بھی صاف تھا۔ البتہ دبلی پتلی بے انتہا تھیں۔

مکان مالکن بھی آ گئیں......اور دو چار گھروں میں اطلاع پہنچی تو وہ خواتین بھی آ گئیں ض۔ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کیا ہو گیا۔

جواباً میں نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا اور ان کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

بمشکل انھیں ہوش آیا۔ ایک سسکاری بھری...... انتہائی کرب ناک انداز میں آہ کھینچی......پھر سینے پر دو ہتڑ مار کر کراہیں۔

”ہائے......اظفر۔“

اور پھر بے ہوش ہو گئیں۔ انتہائی جدوجہد کے بعد انھیں پھر ہوش میں لایا گیا۔

میں ان کے بہت قریب بیٹھی تھی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر میری سمت چند ثانیے تک دیکھا...... پھر ایک دم میرا ہاتھ تھام لیا۔

''تم حرا ہونا......؟ شکر ہے تم آ گئیں۔''

''امی، یہ غیاث بھائی کی باجی ہیں...... ان کا نام رفعت ہے۔'' سمیر نے روئی روئی آواز میں ماں کی اصلاح کی۔

''نہیں...... جھوٹ بکتے ہو تم...... یہ تمہاری باجی حرا ہے...... حرا...... چندا چندا اب تم مجھے چھوڑ کر نہ جانا...... میں مر جاؤں گی تمھارے بغیر...... بیٹے، میرا ہے کون اب تمھارے سوا؟''

''امی...... آپ خاموش ہو جائیں آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں اب...... میری حرا آ گئی ہے نا......'' کوکب آنٹی نے میرا ہاتھ چوم لیا۔

میں عجیب اُلجھن میں پھنس گئی کہ یا اللہ اب کیا کروں۔ کوکب آنٹی کی ذہنی حالت اُنتہائی پریشان کن ہو گئی تھی۔

''آپ ان کو ایک کپ گرم دودھ پلائیں۔'' ڈاکٹر مجھ سے مخاطب تھا۔

''عمیر، دودھ ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''نہیں باجی، ہم لوگ ابھی ابھی تو آئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے نہیں پوچھا کہ کہاں سے۔ پھر میں نے غیاث سے کہا کہ کافی مگ میں گرم دودھ گھر سے لے آؤ۔

''حرا...... میری جان...... اب تو نہیں جاؤ گی مجھے چھوڑ کر؟'' آنٹی پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

میں خاموشی سے، سر جھکا کر رہ گئی۔

غیاث دودھ لے آیا تو میں نے انھیں دودھ پلایا۔

ان کا بیٹا سمیر قریبی تعلق داروں کو بلا کر لے آیا تھا جو ان کے رشتے دار تھے غالباً۔ سب کے سب مرد تھے صرف ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔

سب خواتین اُٹھ کر جا چکی تھیں۔ مردوں کا ازدحام دیکھ کر میں بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کون ہیں؟'' ایک صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''یہیں رہتی ہوں۔ ان کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے چلی آئی تھی۔''

''تو پھر تشریف رکھیے۔'' وہ خاصے رنگیلے سے نظر آئے تھے۔

میرا جی اس قدر وحشت زدہ ہوا۔ جی چاہا، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاؤں۔

''آپ اپنی مریضہ کی دیکھ بھال کیجیے۔'' میں انھیں تقریباً ڈانٹ کر چلی آئی تھی۔ میرے دو گھنٹے وہاں صرف ہوئے تھے۔

گھر آئی تو والد صاحب موجود تھے۔ میں نے اے ٹو زیڈ ان کو تمام واقعہ سنایا۔ انھوں نے مجھے تنبیہ کی کہ آئندہ میں اس قسم کے حالات میں کسی کے گھر جانے کی غلطی نہ کروں کہ بعض اوقات ایسی ہمدردی گلے بھی پڑ جاتی ہے۔

☆☆☆

غیاث ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ کوکب آنٹی کی حالت انتہائی خراب ہے۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں برابر اپنے شوہر کا نام لے رہی ہیں اور ان کے رشتے دار ان کے شوہر کو تلاش کر رہے ہیں۔

میں نے دل میں سوچا کہ طلاق کے بعد ان کا رشتہ ہی کیا رہ گیا ہے جو اُن کو تلاش کیا جا رہا ہے؟

اُدھر بچوں پر دباؤ بڑھ رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلے جائیں۔ بچوں کا باپ کسی قیمت پر بھی اپنے بیٹوں کو سابقہ بیوی کے پاس ٹھہرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔

بچے ان حالات میں انتہائی پریشان تھے۔ ایک طرف جان بہ لب ماں تھی، دوسری طرف حقیقی باپ کا دباؤ۔

مجھے بچوں کی حالت زار پر بے حد دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ شام کو مجھے اطلاع ملی کہ کوکب آنٹی کے دوسرے سابقہ شوہر آ گئے ہیں۔ کوکب آنٹی کی جان بچانے کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔

میری طبیعت کو یہ بات سخت شاق گزری کہ طلاق دینے کے بعد شوہر اسی پہلی حیثیت سے پھر واپس آ گیا تھا۔ اور کوکب آنٹی کی حالت سنبھل گئی تھی۔

ان کی مکان مالکن کے ذریعے مجھ پر ایک اور حیرت انگیز بات کا انکشاف ہوا کہ کوکب آنٹی کی بیٹی نے اپنے سوتیلے باپ کے حقیقی چھوٹے بھائی سے نکاح کیا تھا۔ گویا اب وہ دونوں حقیقی ماں بیٹی بھی تھیں اور دیورانی جٹھانی بھی تھیں۔ مزید یہ کہ کوکب آنٹی اور ان کے دوسرے شوہر کے درمیان اختلاف کی وجہ یہی شادی تھی جو حرا اور سوتیلے باپ کے بھائی کے مابین انجام پائی تھی۔

دو چار دن گزرے، میں گھر کے کام کاج میں مصروف تھی۔ اچانک کوکب آنٹی کو آتے دیکھا۔

''السلام علیکم!'' میں کھڑی ہو گئی۔

''وعلیکم، اسلام، کیسی ہو؟''

''میں تو اچھی ہوں۔ آپ سنایئے اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اب تو ٹھیک ہوں۔ تمھارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ میرے بچوں نے بتایا کہ غیاث بھائی کی باجی نے ہمارا بہت خیال رکھا...... اس اکیلے پن میں تم نے جس طرح......''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں نے شرمندہ ہو کر ان کی بات کاٹ دی۔

ہمسائے کی حیثیت سے یہ ہمارا فرض تھا۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کچھ کرتا۔''

''سنا ہے، تم لکھتی لکھاتی ہو؟'' وہ مجھ سے گویا ہوئیں۔

''جی بس ایسے ہی شوق ہے۔''

''تو پھر میری کہانی ضرور لکھو۔'' وہ مصر ہوئیں۔

''جی ضرور...... آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں گی تو ضرور لکھوں گی۔'' میں نے ہامی بھر لی۔

وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں...... پھر گویا ہوئیں۔

''یہ تو تم جانتی ہو کہ میری دو شادیاں ہوئیں۔ سارا زمانہ کہتا ہے کہ دوسری شادی میری لو میرج ہے۔''

''اور آپ کیا کہتی ہیں؟'' میرا اشتیاق بڑھا۔

''زمانہ غلط کہتا ہے۔'' وہ نظریں جھکا کر بولیں۔ ''اظفر سے دوسری شادی میں نے ضد میں آ کر کی...... پھر اظفر میری مجبوری بن گئے۔ اظفر میرے پہلے شوہر کے دوست تھے۔ ہمارے گھر آزادانہ آتے جاتے تھے۔ میرے پہلے شوہر نے ان کی آمد و رفت کو غلط معنی پہنائے اور میرے ہاتھ میں طلاق نامہ پکڑا دیا۔ وہ شک کے مریض تھے جو وقت میں نے ان کے ساتھ گزارا، وہ قید با مشقت تھی۔ میں کھڑکی یا دروازے پر کھڑی ہو جاتی تو ان کو شک گزرتا کہ میں کسی کو تاک رہی ہوں۔

شادی کے شروع دنوں میں آفس سے اچانک بے وقت آ جاتے۔ میں اس وقت کچھ سمجھتی نہیں تھی۔ عمر بھی کم تھی اور اس قسم کی باتوں کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ ان اچانک چھاپوں سے ان کے ہاتھ کبھی کچھ نہیں لگا۔ مگر وہ ثابت کرنے کو بے چین رہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ مخلص نہیں ہوں۔ دو دو سال کے وقفے سے میرے ہاں چار بچے ہوئے سب سے بڑی حرا...... اور تین بیٹے۔ جس وقت مجھے حرا کے پپا نے طلاق دی

عبیر گود میں تھا۔

"میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ میری ماں اور میرے بھائیوں سے میرے سابقہ شوہر نے نہ جانے کیا کہا کہ انھوں نے مجھ سے قطع تعلق کر دیا اور طلاق یافتہ ہو جانے پر اپنے گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ اس ناسازگار وقت میں اظفر نے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ وہ احساسِ جرم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کی وجہ سے میں برباد ہوئی۔ میرا دوسری شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر میں نے انتقام کے طور پر اظفر سے شادی کی۔ میرے ملنے والوں نے مجھے کہا بھی کہ اس طرح تو تم پر لگائے گئے الزامات سچ ثابت ہو جائیں گے...... رفعت! میں نے یہ پندرہ سال اس شقی القلب کے ساتھ صبر سے گزارے تھے اور اس نے میری ساری ریاضتوں کا صلہ یہ دیا کہ میرے ہاتھ میں طلاق نامہ پکڑا دیا۔ اظفر نے مجھ سے کہا کہ اگر انھیں بھنک بھی پڑ جاتی کہ ان کا دوست اس قسم کا ہے اور اپنی بیوی پر شک کرتا ہے تو وہ کبھی اس کے گھر نہ جاتے۔ سچ رفعت، اظفر واقعی ایسے آدمی نہیں تھے کہ کسی کا گھر برباد کرتے۔

حرا کا باپ ایک فنکار قسم کا آدمی تھا۔ بیرونی دنیا اسے بے حد مہذب اور شائستہ انسان کے طور پر جانتی ہے۔ مگر جس عذاب میں اس نے مجھے پندرہ برس مبتلا رکھا، وہ میں ہی جانتی ہوں۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ "اس نے مجھے تنہا کر دیا تھا۔ ذلتوں کے راستے پر لا پھینکا تھا...... میں نے اظفر سے شادی کر کے اس کے پندرہ برس کے تمام قرضے چکا دیے۔ اگر میں تنہا رہتی یا کسی اور سے شادی کرتی تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ بدنامی تو میرا نصیب ہو ہی چکی تھی...... پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس شخص کو ہمیشہ کی اذیت دوں گی۔ جس طرح اس نے مجھے ہمیشہ کی بدنامی دی۔" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ "میں تمھیں پندرہ سال کے ایک ایک لمحے کی کہانی سناؤں گی لیکن ابھی نہیں، پھر کبھی فرصت سے تمہارے پاس آؤں گی۔"

وہ چلی گئی تھیں میرے ذہن کو الجھا کر۔

فرصت کی وہ گھڑی پھر کبھی نہیں آئی۔ میں نے کوکب آنٹی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ بتانے والے نے بتایا کہ وہ اظفر کے بغیر پاگل سی ہو رہی تھیں...... اور اظفر نہ جانے کس طرح اپنے ضمیر کو ہمیشہ کی نیند سلا کر ان کے پاس آ گئے تھے...... ڈاکٹر کے مطابق، اظفر کی جدائی ان کی موت تھی۔ وہ اس علاقے سے اسی لیے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھیں کہ یہاں سب جانتے تھے کہ وہ غیر قانونی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔

میں ایک عورت کا سفر سوچ رہی ہوں، جو پندرہ برس ایک مرد کے ساتھ رہی، اس کے چار بچوں کی ماں بنی۔ وہ مرد جو محض ایک مفروضے پر لیور رکھ کر کھڑا ہوا ایک عورت کی پوری دنیا تلپٹ کر دی۔

چار بچے...... بے رہنما...... راندہ...... نظروں سے گرے ہوئے......
دھتکارے ہوئے......

حرا کے بہکے ہوئے اقدام کا نقطۂ آغاز......

اس کے باپ کی بہکی ہوئی ذہنی رو......

درماندہ، منقسم بچوں کی غیر یقینی مستقبل......

ایک فردِ واحد کا قدم......

پانچ زندگیوں کا تماشا......

بدنامی و ذلت کی اتھاہ میں اُترتی ایک عورت......

ناآسودہ......

غیر مطمئن......

کرب و اضطراب کا زینہ...... لمحہ لمحہ طے ہوتا ہوا...... مگر کبھی طے نہ ہونے والا......

ادھوری عورت......

ادھوری کہانی......

میں پھر پیچھے پلٹ کر دیکھ رہی ہوں......

کبھی معصوم سا عبیر اسکول جانے کا تمنائی......

کبھی......وہ مرغا بنا ہوا......ناکام ہیرو......

میرے ہاتھ میں پھڑکتا ہوا، لرزتا ہوا......کوکب آنٹی کا طلاق نامہ......

رمضان کے دنوں میں......

مغرب سے کچھ دیر بعد گزرتے خوشبوؤں کے بھبوکے......

میں اگر منصف کی کرسی پر بیٹھوں......

تو فیصلہ کیسے لکھوں......

ابھی تو بیان ایک طرفہ ہے......

مگر مجھے......اس خبر کے بعد ایک ملال ہنوز لاحق ہے۔ اظفر اور کوکب آنٹی کا طلاق کے بعد پھر اسی حیثیت سے ایک ساتھ رہنا، اس عورت کی آخرت...... عاقبت، دونوں خراب کرنے کا ذمے دار کسے ٹھہرایا جائے۔

شوہر کا اقدام......

بیٹی کی سرکشی......

کیسے......اس عورت کو عذاب ثواب کی دنیا سے کہیں بہت دور لے گئے......

کاش، مجھے دوسری طرف کا بیان سننے کا بھی موقع ملتا۔

مگر میں اس عورت کے چہرے پر پھیلی سچائی اور تلخی......کو بھی سوچ رہی ہوں......جس کے پاس نہ اولاد ہے، نہ آنے والے سکھ کی کوئی خوبصورت سی امید......

ہاں بس...... بہت ساری انگلیاں ہیں۔ جو اس راندہ عورت کی سمت اشارہ کر رہی ہیں۔

بہت سارے لب ہیں جو استہزائیہ انداز میں مسکرا رہے ہیں......

وجہ......؟

وجہ...... جاننے کی زحمت...... زمانہ کبھی گوارا نہیں کرتا۔

مگر میرے دل میں ایک خلش ہے کہ کاش میں عبیر کے باپ کے بارے میں کچھ جانتی......

مقدمہ......ادھورا ہے......کہ بیان یک طرف ہے۔

شاید اس مقدمے کی سماعت روزِ حشر تک ملتوی ہو چکی ہے......

"عدالت برخواست ہوتی ہے۔"

☆☆☆

نولکھا ہار

شہر سے بہت پرے ایک ساحلی علاقے میں یہ مچھروں کی بستی ہے اس بستی میں بچہ پیٹ ہی سے مچھلی کی باس سے آشنا پیدا ہوتا ہے۔ یہاں رسائی بسائی کا ساز و سامان ہے۔ بچے ہیں، جانور ہیں، پرندے ہیں، اور نزدیک ہی فیشن ایبل علاقے کے صاف ستھرے گھروں کی غلاظت کے ڈھیر بھی، یہ وہ ٹھکانا ہے جہاں کارپوریشن کی خالی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے لیے یہ ''علاقہ غیر'' ہے جس کا اخباری مراسلوں تک میں بھی ذکر نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود بستی کا ہر شخص بے فکر اور خوش باش ہے، ''لاعلمی ایک نعمت کے مصداق''

کارپوریشن کی مہربانوں نے مصنوعی کوہساروں کی شکل میں اُونچے لوگوں اور مچھیروں کے درمیان ایک حد قائم کر دی ہے۔ ''کوڑا کوہسار'' کے اس پار مچھیروں کی جھونپڑیوں کی صرف چھتیں نظر آتی ہیں۔ ہر جھونپڑی میں ٹاٹ کے پردوں کی مدد سے پارٹیشن بنے ہیں گویا ''آل ان ون'' کا معاملہ ہے۔

نہ جانے کیسے، ادھر بھی ترقی کے ولولے اٹھ کھڑے ہوئے پانچ سات

لڑکے عسرت میں اٹے چہروں کے ساتھ کتابیں اٹھائے کسی سرکاری اسکول میں جاتے دکھائی دینے لگے۔

ستر سوراخوں سے مرصع پردوں کے اس جھونپڑے میں صرف ''گیارہ'' ارکان ہیں ان گیارہ میں سے ایک نے علم کا بیڑا اٹھایا ہے نو برس کا دین محمد اس سال دوسری چڑھا تھا۔ ذہانت کسی کی میراث نہیں، پڑھنے میں بہت تیز ہے۔ وہ کلاس فیلوز سے کہانیاں لاتا اور اپنے بہن بھائیوں میں ''کانا راجہ'' بن کر سنایا کرتا ہے مگر کہانیاں سناتے وقت باقاعدہ اداکاری بھی کرتا جاتا ہے۔ آج بھی جب شام ڈھلنے والی تھی، ماں روٹیاں پکا رہی تھی۔ بڑی بہن چمپا بکریوں کے آگے سبزی کے چھلکے ڈال رہی تھی تو دین محمد چھوٹے بہن بھائیوں کو کوئی کہانی سنا رہا تھا۔

''شہزادی حسن بانو کا نولکھا ہار کھو گیا، بادشاہ نے چور کا پتا چلانے والے شخص کے لیے بڑے انعام کا اعلان کیا اور ہار میں نو قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ جو بے حد خوبصورت اور نایاب تھے......''

''دینو، نایاب کسے بولیں؟'' چھوٹے بھائی فتح محمد نے استفسار کیا۔

''ابے بول لے یا سن لے۔'' دینو جھلایا، ایسی جھلاہٹ جو کسی کمزوری کا پردہ ہوتی ہے اب اتنا بھی لائق نہیں تھا کہ وہ نایاب کے معنی جانتا۔

بکری کی زنجیر درخت میں کستے ہوئے چمپا نے وہیں کھڑے پوچھا

''دینو ہار کی فوٹو بھی آئی ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''چمپا زنجیر چھوڑ لپک کر آئی ''دکھائیو میرے کو۔''

دین محمد نے اکتا کر کتاب کا رنگین سرورق آگے کر دیا۔

''ہائے مولا...... کیسا اچھا ہے یہ ہار......'' کھوٹے زیوروں کو ترسنے والی آنکھوں سے رشک و حسرت صاف جھلکنے لگی ''ہائے سجادیاں (شہزادیاں) کیسے

نصیبوں والی ہوویں، ایسے ہار پہنیں'' اس نے مارے رشک کے تصویر پر ہاتھ پھیرا۔

''اچھا چھوڑو۔'' دینو نے کتاب چھین لی۔

چمپا وہیں پٹی سے ٹک کر کہانی سننے لگی تو اس کی ماں دہاڑی ''ارے اب ہار کے سپنوں میں بیٹھی روے گی؟ باوا آن والا ہو رہا، کھاٹ بچھا دے اس کی۔''

ماں کی جھاڑ پر وہ اٹھ تو گئی مگر کھوئی کھوئی سی۔

اللہ نے مجھے ساتویں برس بیٹا دیا تھا جب خون پانی ہو چلا تھا اور جان سوکھا پتا میں خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی...... جٹھانی کی دو بیٹیوں پر میرا ایک بیٹا بھاری تھا۔ میرے سسرال کا پہلا پوتا، اور یہ جو بیاہ کے بعد میں نے سات برس گزارے تھے۔ درس عبرت ہیں ان کنواریوں کے لیے جو شادی کو خوشیوں کا زینہ سمجھتی ہیں۔ میرے سسرال کا شجرہ نسب نوابوں سے ملتا ہے، آج بھی میرے سسرالیوں میں نوابوں کی خوبو باقی ہے میرا میکہ بھی اپنا ایک معیار رکھتا ہے۔ میں جہیز میں وہ سب کچھ لائی تھی جس کی آرزو کی جاتی ہے۔ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے صرف سرد مہریاں اور کٹیلی مسکراہٹیں سہی تھیں، زبان کے گھاؤ سے پور پور بچ رہی تھی اس کی وجہ غالباً میرا لمبا جوڑا جہیز ہی ہوسکتا ہے۔ یا میرا معزز خاندانی پس منظر یا پھر میری خاموشی، اطاعت گزاری اور ہر دم مصروف رہنے کی عادت، بہر حال اب خوشیاں مجھ پر ٹوٹ کر برسی تھیں میرے شوہر اسد نے مجھے فیروزے کا بہت خوبصورت سیٹ دیا تھا ساس نے پوتے کی پہلی سالگرہ پر اس کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی ڈالی، جٹھانی نے نقرئی کام کی شیروانی ٹوپی کے ساتھ پہنائی، میرا بیٹا اس قدر حسین لگ رہا تھا کہ مجھے دیکھتے ہوئے خوف آ رہا تھا، مبادا نظر لگ جائے۔

سالگرہ کا جشن ختم ہوا، نوکروں کے ساتھ سمیٹا سمٹائی کے بعد جب میں اپنے بیٹے اطہر کے کپڑے بدلنے لگی تو اس کا جسم گرم محسوس ہوا میں پریشان ہوگئی،

اور ڈریسنگ روم سے نکلتے اسد کو دیکھ کر تشویش سے کہا ''شاید اسے حرارت ہوگئی ہے۔''

دوسری صبح اسے اچھا خاصا بخار ہوگیا تھا۔ میں اپنے ہنستے دمکتے بچے کو بستر پر چپ دیکھ کر آبدیدہ سی ہوگئی۔ امی جان اور بھائی جان مجھے دلاسہ دینے لگیں۔
دلہن دکھ بیماری بھی جان کے ساتھ ہیں گھبرایا نہیں کرتے۔''

پولیو وغیرہ کے ٹیکے تو میں نے شروع میں لگوا لیے تھے۔ اس لیے اس طرف سے کوئی فکر نہ تھی مگر میرا اتنا ہنستا کھیلتا شرارتی سا بچہ کیسا نیم جان سے نظر آنے لگا تھا اسد مجھے تسلیاں دیتے رہتے۔

ہمارا فیملی ڈاکٹر دوا پر دوا بدلنے لگا تو میں دہل کر رہ گئی مگر اس نے مجھے تسلی دی۔ بچے کو میں اپنا دودھ پلاتی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے پرہیزی فوڈ چارٹ بنا کر دیا۔ میں اطہر کے اس مستقل بخار سے سخت ہراساں تھی۔ دس پرہیز ڈاکٹر نے بتائے تو دس میں نے خود کر لیے ''دکھیا دیوانہ'' کے مصداق اب تو اسد بھی متفکر نظر آنے لگے تھے اور امی جان بھی۔

ڈاکٹر نے ڈبے کا دودھ تجویز کیا مگر اس سے تو اطہر سال سے اس قدر بے حال ہوا کہ میں نے روتے ہوئے ڈبا کھڑکی سے باہر اچھال دیا اور رات کو اسد سے بہت لڑی۔

''بس یہی ڈاکٹر رہ گیا ہے میرے بچے کے لیے، اور بھی تو ہیں بس انہیں پر تکیہ کیے رہیں۔''

وہ میری سخت گفتاری کا برا مانے بغیر مجھے اپنے کندھے سے ٹکا کر سمجھانے لگے کہ میں اپنے حواس نہ کھوؤں وہ کل ہی کسی دوسرے مستند معالج سے رجوع کریں گے۔

اگلے روز اسد کے ہمراہ ایک نامی گرامی چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس چلی

آئی، اس نے معدے میں گڑ بڑ بتائی اور ڈھیروں نسخے حوالے کیے۔ مجھے اپنا دودھ پلانے کی تلقین کی اور صرف سبزیاں استعمال کرنے کی ہدایت بھی کی، میں نئے ولولے سے گھر آئی کچھ افاقہ محسوس ہوا اور اسہال کی شکایت رفع ہوئی تو میں نئے دم خم سے تیمارداری میں جت گئی۔

رات بہت عرصے کے بعد مجھے کچھ سکون کی نیند آئی، بھابی کی بچیاں تو آیا کی نگرانی میں ہوئی تھیں۔ مگر مجھے اپنا بچہ آیا کی گود میں دینا گوارا نہ تھا۔ وہ ماں ہی کیا ہوئی جس نے اپنے بچہ کی ہنسی کلکاری اپنی گود میں نہ دیکھی سنی ہو، روتے سسکیاں بھرتے بچے کو سینے سے لگا کر چپ نہ کرایا ہو یہی وہ روحانی رابطے ہیں جو ماں اور بچے کے درمیان خاموشی سے قائم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ درمیان شب میری آنکھ کھلی۔ میں نے ڈبل بیڈ سے کافی فاصلے پر ایک اور بیڈ ڈلوالیا تھا تاکہ ہم دونوں ماں بیٹے کی وجہ سے اسد ڈسٹرب نہ ہوں، میں نے ایک نظر بیٹے پر ڈالنا ضروری سمجھا۔ اس کے منہ سے ہلکا سبز لعاب بہہ رہا تھا اور تنفس بہت تیز تھا۔ میں چیخ پڑی ''اسد...... میرا بچہ......''

اسد ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے اور پریشانی سے اطہر کو دیکھنے لگے۔ نئے ڈاکٹر کے تجویز کردہ چند ڈراپس اطہر کے حلق میں ٹپکائے مگر سانس کا عالم وہی رہا امی جان تہجد کے لیے اٹھی ہوں گی، میری چیخ سن کر چلی آئیں اور میں انہیں دیکھ کر رو پڑی ''امی جان...... میرا بچہ اگر اسے کچھ ہوگیا، امی تو، میرا کیا ہوگا......؟ میں کہاں جاؤں؟''

اسد میری سمت پلٹے ''اپنے آپ کو سنبھالو زیب، اس طرح ہاتھ پاؤں چھوڑنے سے کیا ہوگا؟''

''اے میرے مولا اسے صحت دے، کتنی دوائیاں کھلائیں کتنی نظریں اتاریں ہیں۔'' امی جان بھی آبدیدہ ہوگئیں۔

تمام رات سولی پر لٹکتے گزر گئی صبح ہوتے ہی ڈاکٹر کی سمت دوڑے اس نے مشینوں کے ذریعے چیک اپ کیا۔ بھاری فیس لی اور مجھے تسلی دی، روپے پیسے کی تو مجھے ذرا پرواہ نہیں تھی۔ میری تو بس ایک ہی آرزو تھی کہ میرا بچہ پہلے کی طرح ہنسنے کھلکھلانے لگے۔ میں تو بچے کے ساتھ خود بھی بیمار ہو چلی تھی۔ اسد، امی جان، میرے جیٹھ فہد بھابی جان، میرے دونوں دیور سعد اور احمد مجھے دلاسہ دیتے رہے مگر میں اپنے بچے کو اس قدر ناتواں دیکھ کر بے حد بے قرار تھی۔

ہماری نئی نوکرانی کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ مجھے روتا دیکھ کر بولی ''بی بی ایک بات کہوں، برا نہ منانا، آپ بڑے لوگ ہیں۔''

''ارے نہیں کہو کیا بات ہے؟'' میں جلدی سے اس کی سمت متوجہ ہو کر بولی۔

''بی بی، ہماری طرف ایک حکیم جی ہیں، میں پہلے جس گھر میں کام کرتی تھی، ان کی لڑکی بھی اطہر میاں کی عمر کی تھی۔ اسے بھی معلوم نہیں کیا ہوگیا تھا۔ انہوں نے بہت علاج پرہیز کیے مگر وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ ایک دن میری اماں انہیں حکیم جی کے پاس لے گئیں، اللہ قسم اب تو ایسی چنگی بھلی ہے ان کی لڑکی کہ کیا بتاؤں، اب تو وہ کویت چلے گئے ہیں۔ آپ کہو تو لے چلو بی بی؟''

میں تو یہ سب سنتے ہی جذباتی ہوگئی ''ہاں آمنہ کب چلیں؟''

''ابھی چلیں جی۔''

''اس وقت دوپہر کے گیارہ بج رہے ہیں تین بجے چلیں گے اور دیکھو گھر میں تذکرہ نہ کرنا۔'' میں نے اسے تنبیہ کی، مبادا گھر کے لوگ کہیں کہ کس کی باتوں میں آرہی ہو۔

آمنہ نے سر ہلا کر گویا حلف وفاداری اٹھایا۔

تین بجے ڈاکٹر کے ہاں کا کہہ کر میں آمنہ کے ساتھ حکیم کے پاس چلی

آئی، گھٹا گھٹا نیم تاریک سا ماحول، لکڑی کا بے حد قدیم فرنیچر، وہاں بیٹھی مقامی مریض عورتوں نے مجھے بنظر غائر دیکھا میری انگلیوں میں پڑی ہیرے، فیروزے، پکھراج کی انگھوٹیوں کو، میرے غیر ملکی کپڑے کے لباس کو اور میرے پریشان چہرے، میرے خشک ہونٹوں کو، میں وہیں ان کے بیچ بیٹھ گئی۔ وہ ادھر ادھر سرک گئیں۔ وہ شاید مجھے یہاں دیکھ کر حیران تھیں اور بے حد مرعوب بھی، مگر مجھے تو اپنی باری کا انتظار کرنا تھا ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ سات آٹھ عورتوں کے بعد میرا نمبر آیا۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف بڑھی جدھر دوسری عورتیں جا رہی تھیں۔ سامنے حکیم صاحب تھے، سفید ریش، سفید بھنویں بھنچے ہوئے لب، چہرے پر تھوڑی سی سختی لیے، مجھے وہ نوے سالہ ''سنیاسی باوا'' نظر آئے۔ میں نے اطہر ان کے آگے کر دیا۔ اور احوال بتاتے بتاتے روہانسی ہوگئی'' میں نے جی بہت اچھے اچھے ڈاکٹروں سے علاج کرایا ہے'' میں نے معلومات فراہم کیں۔

''بی بی رپورٹیں ہیں تمہارے پاس ڈاکٹروں کی؟ اور نسخے؟

''جی ہاں۔'' میں نے جلدی سے ہینڈ بیگ کھولا۔

انہوں نے بہت ماہرانہ انداز میں نسخے اور رپورٹیں ملاحظہ کیں اور پھر ہلایا اور بولے۔

''بی بی اسے بکری کا دودھ پلاؤ اور یہ خمیرہ موتیوں کا کشتہ خرید سکتی ہو؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اچھا تو پھر میں اس دکان کا نام لکھے دیتا ہوں جہاں سے کشتہ مل جائے تینوں چیزیں باقاعدگی سے استعمال کراؤ، بچہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' بلا کا اعتماد اور بے نیازی تھی ان کے لہجے میں'' اس بچہ کو جگر کی تکلیف ہے اور کچھ نہیں۔''

میں سخت حیران ہو رہی تھی کہ اتنی طویل بیماری کا اتنا مختصر سا علاج! مجھے ان کی حکمت پر شبہ ہونے لگا۔ تھوڑا غصہ آمنہ پر اور زیادہ اپنی عجلت پر آیا۔ امی

جان اور اسد سے مشورہ کر کے ہی مجھے یہاں آنا چاہیے تھا مگر دل کہہ رہا تھا، یہ علاج آزمانے میں ہرج ہی کیا ہے، لیکن بکری کا دودھ......؟ گھر والے تو شاید اس دقیانوسی علاج پر ہی برہم ہوں کجا گھر میں بکری باندھ چھوڑیں، میری نظر میں ایک دم زرد کانٹا سے اطہر کی سمت اٹھ گئی۔ ہونہہ، ستر بکریاں لے آؤں گی۔ دیکھوں کون منع کرتا ہے۔ میں نے ایک دم اٹل ارادہ کرلیا اگر اسے کچھ ہوگیا خدانخواستہ تو لادیں گے یہ لوگ مجھے ایسا چاند سا بیٹا میں نے حکیم صاحب کی فیس پوچھی فرمایا'' دو روپے''

میں سخت حیرانی کے عالم میں اٹھ آئی، پندرہ دنوں میں خرچ کیے گئے ہزاروں روپے کہاں اور کہاں صرف دو روپے۔

شام کو گھر والوں سے بات کی سب نے میری توقع کے عین مطابق ڈھکے چھپے انداز میں ایک جاہل عورت کی باتوں میں آنے کو میری بے وقوفی کہا کہ جب اتنے مستند معالج بغور علاج میں مصروف ہیں تو ان حکیم صاحب کی اہمیت کیا؟ مگر جب میں نے رونا شروع کر دیا تو سب بے بس ہوگئے اسد بولے'' اچھا بھئی بکری بھی آجائے گی مگر دودھ کون نکالے گا؟''

''ہوجائے گا اس کا انتظام بھی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

معاملے طے ہوا میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ میں مغرب کی نماز پڑھنے چھت پر آگئی، نماز پڑھ کر جائے نماز تہہ کر رہی تھی کہ میری نظر بکریوں کے ریوڑ پر پڑی جو دور نظر آنے والے جھونپڑوں کی طرف بڑھ رہا تھا میں کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ مچھیروں کی بستی میں داخل ہوگیا۔ میں نے سوچا، بکری خرید کر نگہداشت کے جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس بستی سے ہی منگوالیا کروں گی میں اپنے ملازم عبدالرحیم کو لے کر فوراً دودھ کی بات کرنے بستی گئی، یہ دیکھنا بھی مقصود تھا کہ صفائی ستھرائی کا کیسا انتظام ہے۔

پہلے سے تیسرے جھونپڑے میں جو باہر سے نسبتاً صاف نظر آرہا تھا دروازہ بجا کر میں اندر داخل ہوگئی گھر کے جتنے افراد تھے مجھے دیکھ کر بوکھلا گئے۔ بانس کے ستون سے لٹکتی لالٹین کی مدھم روشنی چولہے سے ابلتا لکڑی کا دھواں، ہر شے دھندلائی لگتی تھی۔ بکریوں کی بو اور مچھلی کی باس سے میرا دم الٹنے لگا۔ میں دروازے پر کھڑے رہ گئی، ایک عورت جو غالباً خاتون خانہ تھی۔ میری طرف بڑھی اور بولی''جی میم صیب کا بات ہے؟''

''وہ بھئی تمہاری بکری دودھ دے رہی ہے کیا؟'' میں نے بات شروع کی۔

''ہاں جی تینوں دے رہی ہیں ماسے اللہ (ماشاء اللہ)

''دراصل مجھے کچھ عرصے کے لیے بکری کا دودھ چاہیے اپنے بچے کے لیے۔'' میں نے جھونپڑے پر نظر دوڑا کر کہا۔ تیرہ چودہ سال کی ایک لڑکی بڑی پھرتی سے روٹیاں پکا پکا کر ڈھیر لگا رہی تھی۔ اتنی سی لڑکی کا یہ ماہرانہ انداز مجھے چونکا گیا گھر کے سارے افراد میری جانب متوجہ تھے۔عبدالرحیم باہر ہی کھڑا تھا۔

''کتنا دودھ لوگی میم صیب؟''

میں نے یہ جان کر لٹر وٹر جانے ان کی بلا کیا''آدھا سیر صبح، آدھا سیر شام کس حساب سے دوگی؟''

''تین روپے سیر جی، میرے لڑکے کو گھر کا راستہ دکھا دو یہ لے جایا کرے گا۔''

''اف خدایا، کس قدر رستا علاج تھا۔ دل ہی نہیں مانتا تھا کہ شفا ہوگی۔''

''دیکھو میں تمہیں پانچ روپے سیر کے حساب سے دوں گی، یہ ایک ہفتے کے رکھ لو اگر میرے بچے کو فائدہ ہوا تو مہینے کا حساب ہوا کرے گا۔ ٹھیک؟'' میں نے دو روپے کا اضافہ اپنی خدا ترسی کی عادت سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ اس قدر افلاس

دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جھونپڑوں کو دیکھ کر میرے اندر نخوت و غرور سر نہیں ابھارتے۔ رب کریم کا احسان یاد آجاتا ہے۔ جس نے دنیا کے ہر عیش و آرام سے مجھے نوازا، وہ مجھے بھی کسی جھونپڑے میں پیدا کرنے پر قادر تھا لوگوں کو عسرت کی آگ میں دیکھ کر میرا اپنا وجود سلگ اٹھتا ہے۔

''میں صبح آؤں گی اپنا برتن لے کر اپنے سامنے دودھ نکلواؤں گی۔'' بات ان لوگوں سے گھن کھانے کی نہیں تھی۔ معاملہ نازک بچے کا تھا۔ صحت و صفائی کا خاص خیال رکھنا تھا میں پھر گھر آگئی۔

صبح نوکر کے ہمراہ ایک چھوٹی سٹیل کی بالٹی میں پانی اور لیا اور ایک منہ بند دودھ کا برتن اور ایک نیل کٹر لے کر میں بستی چلی آئی۔ صبح کا سحر انگیز وقت تھا۔ جھونپڑیوں کے پس منظر میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا مچھیرے سمندر کی جانب رواں دواں تھے ہر گھر میں شور، زندگی کی علامت بن کر گونج رہا تھا۔ مچھیرن نے بتایا دودھ اس کی لڑکی چمپا نکالتی ہے۔ میں نے تیرہ چودہ برس کی چمپا کے ہاتھ دیکھے اس کے ناخن بڑھے ہوئے تھے میں نے نرمی سے اس کے ہاتھ تھام کر ناخن کاٹ ڈالے۔ وہ کچھ نہیں بولی، بس خاموشی سے مجھے دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ دھلوائے پھر اسے نیپکن دیا کہ ہاتھ اور بکری کے تھن اچھی طرح پونچھ لے، تب اس نے دودھ نکالا اور میں سکون سے دودھ لے کر چلی آئی، بعدالرحیم نے کہا کہ وہ روزانہ یہی عمل دہرا کر دودھ لے جایا کرے۔ البتہ ناخن کا دھیان رکھنے کو براہ راست چمپا سے کہا اور نیل کٹر اسے دے دیا۔ وہ ایک تابعدار قسم کی لڑکی نظر آئی جو میرے سامنے خجل سی ہو رہی تھی۔

پھر سب کی حیرانی دیدنی ہوگئی جب اطہر کے رخسار کھل اٹھے ایک ماہ میں میرا بیٹا ایسا ہوگیا مانو کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ وہ بچہ جو کھڑا ہونا بھول گیا تھا بھاگنے کی کوشش کرتا میں نے اور میری ساس نے ڈھیروں نفل شکرانے کے ادا کیے یتیم خانے

میں کھانا بھجوایا چمپا کے اور اس کے گھر والوں کے لیے کپڑے بنائے کہ عید بھی قریب تھی۔ نوکروں کو بہت کچھ دیا۔ اور میرا سسرال فراغ دل بہت ہے اور کچھ خدا کا بھی بے حد کرم ہے۔

انہیں دنوں بھابی کے ہاں آمد آمد تھی۔ امی جان تو اپنے نوابی مزاج کے عین مطابق ہل کر پانی پینا بھی کسر شان سمجھتی تھیں۔ گھر میں کل تین نوکر تھے آیا کے علاوہ ایک عبد الرحیم آمنہ اور لاڈو، ہمیں تو یہ تین بھی نعمت ہی لگتے تھے۔ چوکیدار صرف گیٹ سے متعلق تھا۔ لاڈو کی زچگی بھی انہی دنوں ہوئی، وہ چھٹی پر تھی مجھے ہر وقت مصروف رہنا پڑتا۔ ادھر اطہر کو صرف میری عادت تھی۔ ورنہ بری طرح رونے لگتا پھر گھر صرف نوکروں ہی سے نہیں چلا کرتے اپنی مرضی کا کام لینے کے ساتھ ساتھ دیکھنا پڑتا ہے ویسے بھی مجھے کاہل الوجود عورتوں کی طرح بغل میں بچہ داب، رونے کا بہانہ کر کے آرام کی عادت نہ تھی۔ احمد میرا بڑا دیور یونیورسٹی پڑھتا تھا اور چھوٹا کالج میں، بھابی کو اپنے بچیوں کے کام بہت ہوتے تھے۔ ان کی بچیوں کی آیا شادی رچا کر دادو جا چکی تھی۔ ان کی تو اپنی جان عذابوں میں تھی اٹھتیں تو ہائے کرتیں، بیٹھتیں تو ہائے کرتیں۔ پیروں پر ورم، چہرے پر ورم، بچیاں بھی باقاعدگی سے پٹنے لگی تھیں۔ میرے جیٹھ نے شاید کبھی ایسا ''کرائسس پیریڈ'' نہیں دیکھا تھا۔ فوراً اخبار میں آیا کے لیے اشتہار دے دیا تھا اب بھابی ''ہر بیل'' پر خود، ہائے میرے مولا'' کہہ کر اپنی ٹنوں وزنی جان لے کر اٹھا کر کہ کوئی شاید آ گئی'' ہو پھر روہانسی ہو کر کہتیں ''ہائے زیب'' تم کیسے اطہر کو سنبھال لیتی ہو؟'' شاید بھابی کی نظر لگ گئی۔ اطہر گھر کے کاموں میں مجھے سخت پریشان کرنے لگا پہلے پہل تو ساس نے بچوں کو بھلانا چاہا پھر ایک دن بے زاری سے کہنے لگیں ''تم لوگوں نے بچوں کو بہت سر چڑھا لیا ہے ایک ہمارے بچے تھے پتا ہی نہیں چلا کب بڑے ہو گئے ہماری مغلانی بی آرام سے پان چبایا کرتی تھیں۔ اور مفت کا ماہانہ لیتی تھیں۔''

آخر ایک روز میں چمپا کو لے آئی۔ آئی اس کی ماں کی سو منتیں خوشامدیں کر کے اور اسے اطہر کی نگہداشت پر مامور کر دیا۔ جتنا بڑا گھر ہوتا ہے، اتنے ہی بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اطہر روتا تو میں اسے سنبھال لیتی اور چمپا سے دوسرے کام لے لیتی، چمپا سے مجھے بہت آرام ہو گیا بس ایک مرتبہ کافی ہوتا تھا صبح آٹھ بجے آتی تھی اور شام پانچ بجے واپس چلی جاتی تھی۔ جاتے ہوئے میں اسے کھانا اور پھل وغیرہ دے دیا کرتی تھی لائی تو میں اسے اطہر کے لیے تھی مگر بھابی بھی آواز دے لیا کرتیں، کبھی امی جان پکارتیں ''اے چمپا چمیلی (چنبیلی) ذرا میرے سر میں تیل ڈال دو'' انہیں ''اکہرا'' نام لینے کی عادت نہ تھی وہ خود چمن آرا تھیں۔ میاں مرحوم عبد الصمد خان، بیٹے اسد خان، فلاں خان فلاں خان، بہوئیں چھوٹی دلہن بیگم، بڑی دلہن زرتاج اور اب چمپا چمیلی۔

بہر حال چمپا کو یہاں کوئی روک ٹوک نہ تھی ہنستی کھیلتی پھرتی تھی، جی جان سے کام کرتی تھی پانچ بجے تک اس کے پاؤں میں چکر رہتا۔ اچھا کھانے کو ملا تو ٹھلاتا لڑکپن، دوڑتی بھاگتی، جوانی میں بدل گیا۔ آج تک مجھے ان غریب گھروں کی لڑکیوں کی چیختی چلاتی جوانی سمجھ میں نہ آئی امیر گھروں کی اکثر بانس کی مانند سفید چرخ لڑکیاں جو میرے اڑد گرد تھیں ان کے پھوٹنے اور پھٹنے کا پتا ہی نہ لگتا تھا۔

☆☆☆

اطہر سو رہا تھا، میں بھی آرام کرنا چاہ رہی تھی۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے امی جان یعنی میری ساس اپنی بہن سے ملنے کوئٹہ گئی ہوئی تھیں۔ بھابی اور بچیاں بھی آرام کر رہی تھیں اسد اور میرے جیٹھ اپنے اپنے کاموں سے حسب معمول باہر تھے۔ چھوٹا دیور کالج سے نہ لوٹا تھا احمد کی چھٹیاں تھیں کئی روز سے، چمپا میرے کمرے میں آ کر قالین پر سو جانا، آرام کر لو تم بھی اب کوئی کام باقی نہیں ہے۔''

بولی ''بیگم جی میں ادھر برآمدے ہی میں سو جاؤں گی۔''

"اچھا۔" میں نے برآمدے کا پنکھا چلا دیا اور خود اپنے ٹھنڈے نیم تاریک کمرے میں آ گئی، میں آنکھوں پر بازو رکھ لیٹی تھی کہ اطہر جاگ پڑا میں نے چمپا کو آواز دی۔

"چمپا......"

"چمپا......"

آخر مجھے خود ہی اٹھنا پڑا، شاید سوگئی ہے میں فرج سے سیب کا جوس لینے خود اٹھ کھڑی ہوئی، باہر آئی تو دیکھا چمپا برآمدے میں نہیں تھی۔ میں سمجھی باتھ روم میں ہوگی میں کھانے کے کمرے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ مجھے امی جان کے کمرے سے کھسر پھسر کی آواز آئی۔ میں ٹھٹھک گئی۔ اڑتے پردے کے پیچھے میں نے دیکھا۔ چمپا امی جان کے کمرے کی وارڈ روب کے پاس کھڑی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا، میں اندر بڑھنے کو ہی تھی کہ احمد کی آواز نے میرے قدم زمین میں گاڑ دیئے وہ کہہ رہا تھا "دیکھو چمپا......"

"ہاں جی کیسے خوبصورت ہیں یہ بندے۔"

"ہائے اللہ، یہ ہار کیسا ہے، بالکل نو لکھے ہار جیسا۔" اس کی آواز خوشی سے تھرا گئی۔

"نو لکھے ہار جیسا۔" احمد کی کی آواز میں تعجب تھا۔

"ہاں جی میرا بھائی ایک کہانی لایا تھا ہمیں سنان واسطے۔"

اس پر بالکل ایسے ہار کی فوٹو بنا تھا بچی بالکل ایسا" چمپا کا الہڑ مشتاق سا لہجہ۔"

"یہ نولکھا ہار ہی ہے چمپا پہنے گی؟"

"ناں جی، اپنی ایسی قسمت کہاں۔" آواز میں مایوسی وافسردگی چھا گئی۔

"نہیں تو پہن کر تو دیکھ۔"

"نہیں......نہیں......جی......" آواز کانپ رہی تھی۔

"میں دونگا بالکل ایسا ہار بنوا کر۔" احمد کا پرچانے والا لہجہ۔

میں سن کھڑی رہ گئی بے تکلفی بتا رہی تھی کہ اس سے قبل بھی باتیں ہوتی رہی ہیں۔ میری تو اس خیال سے روح کانپ گئی، خدایا کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو اس کی ماں کو کیا جواب دوں گی؟ احمد یقیناً امی جان کا لاکر کھولے کھڑا تھا، میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے پاس چابی کہاں سے آئی؟ مگر اس وقت مسئلہ چابی کا نہ تھا، میں بے دھڑک اندر گھس گئی۔ رنگے ہاتھوں پکڑنے کے خیال سے مجھے دیکھ کر دونوں کی روح فنا ہوگئی چمپا تو لپک جھپک باہر بھاگ گئی، اور احمد خود کو میری نظروں سے بچاتا ہوا بولا "بھابی بیگم" یہ کیسی لڑکی لے آئیں ہیں آپ؟ امی جان کی وارڈ روب کھولے کھڑی تھی۔ جانے کس نیت سے وہ تو شکر ہے کہ میں آ گیا۔ میں اسے ڈانٹ ہی رہا تھا کہ آپ آ گئیں۔"

انسانوں کی ڈھیروں اقسام میں سے ایک قسم خاصی "مطلبی" کی بھی ہے مطلبی، بزدل بھی ہوتا ہے اور بزدل اپنے بچاؤ کی خاطر اپنی مصنوعی عزت کی خاطر بڑے سے بڑا بہتان باندھ سکتا ہے، پاگلوں پر چھری پھروا سکتا ہے۔ مجھے احمد سے سخت گھن محسوس ہوئی، ایک غریب مسکین پر کس ڈھٹائی سے الزام تراشی کر رہا تھا۔

وہ وارڈ روب کے پٹ بند کر چکا تھا، میں کھولتی ہوئی جوس لے کر واپس اپنے بیڈ روم میں پہنچی تو چمپا اطہر کو تھپک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا جسم لرزنے لگا۔ چودہ برس کی لڑکی جو اپنی عمر سے تین سال بڑی نظر آتی تھی۔ ماں کہتی ہے چودہ کی ہے وہ خود کو پندرہ برس کی بتاتی مگر اس کا ظاہر ان دونوں عمروں کو مسترد کرتا تھا۔

"کیا کر رہی تھیں تم وہاں؟" میں نے سخت غصیلی نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی وہ میں برآمدے میں لیٹی تھی، احمد صاحب نے مجھے کھڑکی میں سے

بلایا تھا میں سمجھی کوئی کام ہوگا۔"

"کیا کہتا ہے وہ؟"

وہ چپ رہی۔

"کیا پوچھ رہی ہوں میں؟"

"وہی چپ۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنکا دیا۔

"کم بخت سنتی نہیں ہو کیا؟"

"کچھ نہیں جی۔" اس کا وجود لرزنے لگا۔

"دیکھ میں نے سب کچھ سن لیا ہے، سب سے پہلے کہاں بات کی تھی اس نے؟"

چپ...... مستقل چپ......

"دیکھ چمپا مار مار کر درگت بنا دوں گی صحیح بات بتا مجھے، تیری ماں سے الگ تیرا کچومر بنواؤں گی۔" میں بھڑک اٹھی "کہاں بات کی تھی پہلے اس نے؟"

"بیگم جی میرے کو غلط نہ سمجھو۔"

"جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو صرف۔"

"جی پرسوں شام کو جب میں چھت پر کپڑے اتارنے گئی تو احمد صاحب اوپر تھے۔ انہوں نے جی میرے گلے پر چٹکی کاٹ لی تھی۔ میں تو ڈر گئی تھی کہنے لگے تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

"ہوں تو کون سا اپنے قابو میں ہے بہت خوش ہوئی ہوگی، ورنہ اس کے بلانے پر یوں جاتی؟ مجھ سے شکایت نہ کرتی؟"

"احمد صاحب کہہ رہے تھے بہت ضروری کام ہے اور جب اندر گئی تو وہ بہت سارے نوٹ نکال کر گننے لگے۔ پھر انہوں نے الماری میں سے بہت زیور

نکالے اور ڈبے کھول کر مجھے دکھانے لگے......"

"اور پہنا کر بھی دیکھنے لگے۔" میں نے بھبھک کر بات کاٹی۔

"نہیں جی......" وہ میری سمت خوف زدہ ہرنی کی طرف دیکھ کر بولی۔ "پھر انہوں نے ایک بڑا سا ہار نکالا......"

"اچھا بس بس، سب سن لیا تھا میں نے۔"

وہ گردن ڈال کر بیٹھ گئی، سہمی...... سہمی...... میرا جی نہ چاہا کہ اسے "مکڑی کی پڑیا" کہوں "تجھے کیسے لگتے ہیں احمد صاحب؟ تیرا بیاہ کرا دوں ان کے ساتھ؟" میں نے کوئی سزا مقرر کرنے سے پہلے ایک نفسیاتی حربہ آزما کر اس کے جی بھید لینا چاہا تو وہ کانپ کر فرش سے اٹھ گئی۔

"بیگم جی میرے کو معاف کر دیو اب مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوے گی، قسم اٹھا لوں آپ بولو تو۔" وہ جھرجھری رو پڑی۔

مجھے اس پر ترس آ گیا "اچھا چل اٹھ کھڑی ہو، رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے اچھا چل اطہر کو یہ جوس پلا اور خبردار جو آئندہ احمد کے بلانے پر گئی، کمینی، مردوں کی باتوں پر آ کر لڑکیاں کہیں کی نہیں رہتیں۔"

اس دن کے بعد وہ بہت محتاط ہو گئی میری نظریں ہر دم اس کا احاطہ کیے رہتیں وہ کچن میں ہوتیں تو احمد بہانے بہانے کچن میں جاتا اور اطہر اور بھابی کی گڑیا کے ہمراہ لان میں جاتی تو وہ کتاب اٹھائے وہیں چلا جاتا مجھے سخت تعجب ہوتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے یونیورسٹی میں پڑھتا ہے ایک سے ایک طرح وار لڑکی ہوتی ہے وہاں، اگر وہ کسی اچھے گھر کی لڑکی پسند کر لے تو یقیناً گھر میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ خود احمد میں بھی مردانہ حسن کی کمی نہیں خوبصورت قد و قامت، سنہرے خوب صورت ہیر اسٹائل کے ساتھ اس قدر جاذب نظر لگتا تھا کہ یقیناً لڑکیاں اس کی طرف ضرور متوجہ ہوتی ہوں گی ایک یہ چمپا، دلفریب اور کچے بوری سی، مہک دیتی جوانی کے

علاوہ ہر طرف سے بالکل کنگال، پھر مزاج میں بے حد بچپنا تھا، بس ہر وقت گہراتی ہلکورے لیتی پھرا کرتی، نامراد کی شاید یہی ادا بھا گئی ہو گی چمپا جسے پہننے اوڑھنے کی تمیز نہ چلنے پھرنے کی، غریب مچھیرے کی عسرت کی ریت پر تڑپتی بے مایا مچھلی، کئی بار جی میں آئی اسد یا اپنی ساس سے احمد کو سمجھانے کو کہوں، مگر ثبوت؟ وہ تو جھٹ کہہ دے گا۔ کچن، لان، چھت گھر سے خارج ہیں کیا؟ یا ادھر میرے جانے پر پابندی ہے؟ پھر میں کیا جواب دوں گی؟ الٹا خود کو نظروں سے گراؤں گی اس چمپا کو ہی چمپت کرائے دیتی ہوں۔ پر اس کا نعم البدل کہاں سے لاؤں؟ بھابی اور ساس کو کیا جواز پیش کروں؟ وہ دونوں تو اس قدر اس کی عادی ہوگئیں ہیں کہ اس کے غیر حاضر ہونے پر اس کے جھونپڑے تک پہنچ جائیں گی، وجہ پوچھیں گی اس کم بخت چمپا ہی کو کہوں کہ کوئی بہانہ کر کے دفعہ ہو جا۔

مگر وہ بے وقوف تو سن کر ہی رونے لگی ''بیگم جی'' میری ماں کہیں اور نوکری نہ کرنے دے گی۔ آپ کے گھر کام کر کے میرے گھر والوں کو آرام مل جاتا ہے۔ غریبوں کی دُعائیں لیں جی، اب میں کہاں جاؤں؟''

''اچھا چل فالتو باتیں نہ بنا فارغ وقت میں کاپی پنسل لے کر بیٹھا کر، کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لے۔ کام آتا ہے، میں اس کے رونے دھونے سے متاثر ہوگئی تھی۔''

اس دن کے بعد سے وہ روزانہ ظہر کے بعد کاپی پنسل لے کر بیٹھ جاتی۔ میں نے اسے حروف اور ہندسوں کی پہچان کرائی آہستہ آہستہ اسے اردو لکھنا آنے لگی۔

سو تک گنتی بھی لکھنے لگی۔ اس پر امی جان نے کہا تھا ''چھوٹی دلہن بیگم، اب کیا سکول بھی داخل کراؤ گی اسے لوٹھا کو۔''

نہیں امی جان اتنا تو ہر انسان کو لکھنا پڑھنا آنا چاہیے کہ خط وغیرہ پڑھ

لے۔''

پھر سنا کہ اس کی ماں مرگئی وہ کئی دن تک نہ آئی میں ذرا دیر کو تعزیت کے لیے گئی، احمد نے مجھ سے تو نہیں البتہ ماں سے پوچھا ''امی جان وہ نوکرانی چلی گئی ہے کیا؟''

کسی لڑکی کے لیے مرد کا یہ دہرا پن صاف بتاتا ہے کہ وہ اس کے لیے پاکیزہ محبت جیسے لطیف جذبات نہیں رکھتا بلکہ اس سے فقط کوئی ''خاص مطلب'' رکھتا ہے گھر والوں کے سامنے اسے حقارت سے نوکرانی کہنا اور آنکھ بچا کر سینے سے لگانے کے بہانے بھی ڈھونڈنا۔ چمپا کو بھی شاید اس گھر کی لت لگ گئی تھی۔ دو مہینے بعد پھر آ گئی ہمارا کیا جاتا تھا۔ آرام ہی ملتا تھا، لوگ تو ایسے پھرتیلی ملازماؤں کی آرزو کرتے ہیں جو پھرتیلی بھی ہوں اور مرضی کے مطابق کام بھی کریں بس اب یہ تھا کہ اس نے کام کے اوقات میں تخفیف کر دی تھی۔ یعنی ایک گھنٹہ پہلے چلی جاتی تھی۔

سعد کی بی ایس سی میں اپنے کالج کی پہلی پوزیشن آئی تھی۔ سعد میرا چھوٹا دیور تھا پڑھنے کا انتہائی شوقین گھڑی دیکھ کر کام کرنے کا عادی، انتہائی منظم مزاج کا مالک سب کو بہت عزیز تھا۔ اسد نے خوش ہو کر اس کے اساتذہ دوستوں اور دیگر ملنے جلنے والوں کے لیے پارٹی کا انتظام کر ڈالا سعد ایف ایس سی میں چند نمبروں کی کمی کی وجہ سے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلے سے رہ گیا تھا۔ اب اس نے بہت محنت کی تھی۔ سب کو امید تھی کچھ نہ کچھ ضرور بن جائے گا میں بھی بہت خوش تھی۔

گرمی کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام چھت پر کیا تھا۔ اس لیے وہاں کی تیاری بہت پہلے کر لی تھی۔ میں یہ دیکھنے کے لیے کوئی کمی نہ ہو، اوپر آئی تو دھک رہ گئی اُوپر بنے ہوئے دو کمروں کی شیڈ کے نیچے چمپا احمد کے بازوؤں میں تھی۔ وہ اس کے مضبوط بازوؤں کا گھیرا توڑنے کی مقدور بھر کوشش تو ضرور کر رہی تھی مگر اس

کوشش میں بے زاری، نفرت یا اکتاہٹ نہیں تھی۔ حرافہ! کوئی گل کھلا کر ہی رہے گی۔ کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ اس کمینی پر، کیسے میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہے۔ اس بار میں نے چمپا کو نہیں، احمد کو آواز دی ''احمد......''

احمد نے بری طرح بوکھلا کر چمپا کو چھوڑ دیا۔ مجھے دیکھ کر بے اندازہ خجل ہو رہا تھا، میں طنطنے سے اس کے سر پر پہنچ گئی۔

''احمد، تمہیں شرم نہیں آئی یہ نیچ حرکت کرتے ہوئے کم سے کم اپنی حیثیت کا اندازہ کرلیا ہوتا اتنی رزالت کی توقع کسی کو بھی نہیں ہوگی تم سے اور تو......'' میں نے چمپا کے بال پکڑ کر بے دریغ دو طمانچے رسید کر دیئے۔'' کمینی شکل پر بارہ بجائے رکھتی ہے اور کام یہ دکھاتی ہے، ابھی سے تیرا یہ حال ہے، جوانی ڈھنگ سے چڑھ آئی تو خدا جانے کیا کیا نہ کر چھوڑے گی۔ مکر کی پڑیا بے غیرت میں نے غریب مسکین سمجھ کر تیری مدد کرنا چاہی اس کا تو نے یہ صلہ دیا۔'' احمد وہاں سے فوراً کھسک گیا تھا چمپا نے اس کی سمت مدد کو دیکھا تھا۔

''نیچے چل، میں امی جان کو اپنی کمرے میں بلاتی ہوں تو اپنے منہ سے احمد کی شکایت کرے گی ان سے سمجھی۔''

''نہیں...... جی نہیں آپ مجھے گھر سے نکال دیں مگر میں یہ نہیں کروں گی وہ تھرا کر روتی ہوئی بولی۔''

''نکاح پھوالیا ہے کیا، جو اتنی پردہ واری کر رہی ہے؟'' اس کی ڈھٹائی سے میرا بھیجا ہی الٹ گیا۔ چل نیچے امی جان کے پاس۔''

''نہیں، جی نہیں آپ میرے کو جتنی مرضی مار لو۔''

اف خدایا، وہ ایک دم میرے لیے سانپ کی چھچھوندر بن گئی تھی نہ اگلتے بن رہی تھی نہ نگلتے میں نے چٹیا سے پکڑ کر نیچے کی جانب دھکا دیا ''دفعان ہو جا اور آئندہ اپنی منحوس صورت لے کر اس گھر میں کبھی داخل نہ ہونا۔''

احمد کو میں جانتی تھی۔ بے حد بگڑا ہوا اور بدلحاظ تھا اور میں بغیر ثبوت کے امی جان سے بات کرتے ڈرتی تھی اور اسد سے بھی وہ تو فوراً مجھے جھٹلا دے گا۔ میں بری بن جاؤں گی یا پھر یہ لوگ سارا قصور چمپا ہی کا ٹھہرائیں گے۔ امی جان کی نظر میں تو بیٹے بالکل ہی ''ننھے'' تھے گویا کل ہی بوتل چھٹی ہو، اب اپنا بھرم قائم ہے تو اس کلموہی کی خاطر وہ بھی گنوا دوں؟ نامراد کو کس قدر سمجھایا۔ ٹھیک ہے بھرے گی خود ہی۔

اس دن کے بعد چمپا نظر نہ آئی، ساس نے اور بھابی نے دریافت کیا تو میں نے کہہ دیا ''اب ماں نہیں ہے اس کی، نہیں آنے دیتا اس کا باپ جوان لڑکی کو۔''

اس واقعے کے ساتھ آٹھ ماہ بعد میں ایک مہینے کے لیے اپنے میکے حیدر آباد آئی تھی اپنی ایک پرانی سکھی سے ملنے بھی جانا تھا ٹھنڈی سڑک پر موٹر دوڑاتے ہوئے (جو میرے بڑے بھائی کی تھی) مجھے یاد آیا کہ اطہر کے سیرپ وغیرہ بھی ختم ہوگئے ہیں تب میں نے گاڑی نزدیکی بازار کی سمت موڑ لی مگر جھٹکے سے رک جانا پڑا۔ سامنے کسی موٹر سائیکل سوار کو ایک ٹرک نے لقمہ اجل بنا دیا تھا پورا ٹریفک جام تھا اُف خدایا خدا معلوم کب یہ اندھا دھند ریسنگ ختم ہوگی، میں نے طویل معاملہ جان کر انجن بند کر دیا اور اسٹیرنگ پر بازو رکھ کر ٹریفک کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ بالوں کو اڑنے سے بچانے کے لیے میں نے نماز پڑھنے کے اسٹائل میں دوپٹہ منڈھ رکھا تھا اور بڑے بڑے ڈبل شیڈڈ گلاسز میری آنکھوں پر تھے لوگ گاڑیوں سے اتر رہے تھے۔ حادثے سے زیادہ میری جانب متوجہ تھے۔ عورت بدشکل بھی نہ ہو اور پر اعتماد بھی ہو، پھر شاندار موٹر بھی چلا رہی ہو تو جانے کیا بن جاتی ہے۔ مجھے اپنی پریشانی تھی کہ میرا بچہ پریشان ہو رہا ہوگا کہیں اسد کا فون نہ آیا ہو۔

''بی بی، اللہ بھلا کرے گا تیرے بچے سکھی رہیں ایک مانوس آواز پر میں

نے چونک کر سر اٹھایا اور آنکھوں سے گلاسز اتار دیئے۔ لیرم لیر سندھی اجرک میں چھپا کھڑی تھی۔''

''ارے تو یہاں کہاں؟'' میں ہکلا کر رہ گئی۔

وہ جواب دینے لگی تو اس کی آواز بھرا گئی ''بیگم جی بیگم جی میں کراچی سے بھاگ آئی ہوں۔

''کس کی خاطر؟ پھر کوئی نو لکھے ہار والا مل گیا تھا؟'' میں طنزیہ بولی۔

''بیگم جی، احمد صاحب نے مجھ سے بیاہ کرنے کی قسم کھائی تھی اور کہا تھا وہ مجھے بہت نو لکھے ہار بری میں چڑھائیں گے۔ مگر وہ بے ایمان نکلے آپ ٹھیک کہتی تھیں وہ بہت ظالم ہیں میں گھر سے بھاگ آئی ہوں، مرنے کے ڈر سے نہیں، اپنی وجہ سے اپنے باپ کو کیوں پھانسی پر چڑھاؤں؟ مرنا تو اب میری تمنا ہے جی، مگر میں احمد میاں کو کبھی معاف نہ کروں گی۔''

ہونہہ وہ تو تیری معافی کے انتظار میں بوڑھے برگد میں جھول رہا ہے جیسے۔

''میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' اس نے اجرک سے آنسو صاف کرنا چاہیے اور میرے کلیجے میں ایک میخ سی گڑ گئی، تو تو تباہ ہوگئی ہے بدنصیب، اس کی اجرک ڈھلکنے سے گویا میں کشف القبور کا عمل تمام کرلیا۔ تب ہی تو کہوں کہ اسے ایک دم اتنی باتیں کرنا کیسی آ گئیں مگر میرا احساس دل تڑپ اٹھا اسے تباہ کرنے والا میرے اپنے گھر کا فرد تھا۔ اگر تو میرا ساتھ دے دیتی احمق لڑکی، تیری ایک شکایت، میری ایک گواہی احمد کے سر میں جادو کی کیل بن کر گڑ جاتی اور پھر اس کی مجال نہیں تھی اس کی اصلیت ظاہر ہو جاتی مگر بد بخت اس میں تیرا بھی قصور ہے چلی تھی عشق کرنے۔ ادھر میں یہ سوچ رہی تھی اور ادھر سڑک کب کی کھل گئی تھی لوگ میری گاڑی آگے نہ بڑھنے کی وجہ اس فقیرنی کو سمجھ رہے تھے اور اسے مغلظات بک رہے

تھے۔ ہارن دے رہے تھے۔ میں نے جلدی سے چابی گھما کر ایکسلیٹر دبا دیا وہ پرے ہٹ گئی میرے کان سنتے رہ گئے ''انہیں میری آہ لگے گی، وہ پھونک دے گی انہیں'' میں گم صم ہو کر رہ گئی، اور بہت جلد سسرال واپس آ گئی۔

میرے ذہن میں چمپا چٹ کر رہ گئی میرا احساس رو پڑتا، جب اس کے گھر کا دھیان آتا کئی مرتبہ تو اس قدر جذباتی ہوگئی کہ اسد سے کہنے لگی مگر عقل نے ٹھوکا مار دیا کیا کرنے لگی ہو اس کے ذہن میں تو وہ بہت ''ننھا'' ہے بالفرض محال ان کے ذہن نے تسلیم بھی کرلیا تو وہ اظہار کر کے اپنی خاندانی عزت و جاہ کو مٹی میں ملا دیں گے۔

صبح ہی صبح گھر میں کھلبلی مچ گئی سب چوکیدار کے پیچھے پڑے تھے اور وہ گھبرا کر قسمیں کھا رہا تھا ''خدا کسم سچ بولتا، ام اور کسی کو آتا نہیں دیکا۔''

''بھلا تمہارا کیا کام جب کوئی اس قدر آسانی سے گیٹ تک آ جائے بھابی برہمی سے بولیں احمد یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا وہ ٹائی باندھتا ہوا وہیں چلا آیا۔ مگر پیوندی گونڈری میں ہلتی زی روح کو دیکھ کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ ننھی روح زور سے چیخنے لگی۔ بوڑھے چوکیدار نے گود میں اٹھا کر ہلانا شروع کر دیا۔ تب چار چھ کالی چوڑیوں سے بندھا ایک کاغذ نیچے گرا پڑا سب اس کی سمت لپکے مگر اسد نے اٹھا لیا میں ان کے پیچھے کھڑی تھی، انہوں نے کھولا ٹوٹی پھوٹی تحریر میں لکھا ''احمد کے گلے کے لیے نولکھا ہار'' جس، جس نے پڑھا اس کی نگاہ احمد کی جانب بے ساختہ اٹھ گئی وہ بری طرح بوکھلا گیا گڑ بڑا کر بولا۔

''خدا معلوم کس نے بے ہودہ مذاق کیا ہے؟'' اس کی جھلاہٹ میں خوف حیرت اور کشمکش تھی جسے صرف میں ہی محسوس کر سکتی تھی۔

آس پاس کے بنگلوں سے بھی لوگ آئے جن میں ملازمین کی تعداد زیادہ تھی کسی نے پولیس کو خبر کر دی تھی۔ اور اب پولیس آ چکی تھی چوکیدار سے بیان لیا جا

رہا تھا اس نے بتایا وہ گیٹ کے نزدیک ہی رہا ہے فجر کے وقت اس نے دیکھا، یہ جان پڑی کسی کی جان کو رو رہی تھی۔

''اور کچھ نہیں تھا اس بچے کے ساتھ؟'' تھانیدار نے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' اسد نے بے حد عجلت میں جواب دیا میں نے ان کی سمت دیکھا۔ وہ نگاہ چرا گئے چوکیدار بچے کو چپ کرانے میں مصروف تھا اس نے کاغذ کا پرزہ نہیں دیکھا تھا اور شاید یہ اس گھر کے لیے غنیمت تھا۔

''اوئے اخلاق، اسے اٹھا لو اس کے وارثوں کی تلاش ہوگی، نہ ملے تو یتیم خانے بھجوا دیں گے۔ اوئے اخلاق، اوئے اخلاق اسلم'' تھانیدار کی آواز گونج رہی تھی۔

میں نے احمد کی سمت دیکھا۔ وہ مجھے دیکھتا پا کر زرد سا ہو گیا اور اندر بڑھ گیا۔ ہونہہ اب نوابوں کا پوتا یتیم خانوں میں پلے گا۔ حالانکہ یہ نولکھا ہار تو احمد کے گلے کے لیے آیا تھا یتیم خانے کے گلے کے لیے نہیں۔

جب ہم سب اندر لوٹ رہے تھے تو ہر ایک کی چال اس کی ذہنی کشمکش کا پتا دے رہی تھی۔ سب اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوال کا جواب جان کر بھی نہیں جاننا چاہتے تھے۔

میں نے پلٹ کر گیٹ کی طرف دیکھا چھپا کا نولکھا ہار، پولیس یتیم خانے کے خزانے میں جمع کرانے جا رہی تھی۔ کہ ورثاء تو ملنے سے رہے اور ایسے نولکھا ہار یتیم خانوں کے لاکر ہی میں محفوظ ہوتے ہیں، یا ''ڈبا پیکنگ'' میں گندے نالوں کی تہہ میں اُتر جاتے ہیں۔

☆☆☆

رائیگاں تو ہے

''آج وہ آ رہا ہے۔'' آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے اس نے سہم کر سوچا۔

''کیا پھر آنکھ مچولی چلے گی؟'' وہ ہنسی...... ''مگر اب آنکھ مچولی کے دن کہاں...... جانے کتنے بچے ہوں گے اس کے...... آہ!''...... تب کتنے ہی سفاک لمحے...... خاموش سرد مہر لمحے اس کا کلیجہ چھیدتے گزر گئے...... چند قطرے رخساروں پر لڑھک آئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آئینے میں نظر ڈالی...... چہرے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے وہ گردن سے نیچے تک ہاتھ لے آئی جہاں پسینے کے مسکین قطرے اس سے پہلے پہنچ چکے تھے۔

اُبھری اُبھری ہڈیاں نمایاں ہیں۔ پسینے کے چند قطرے بھی جانے کتنے نشیب و فراز سہہ کر راستہ چلنے لگے تھے۔ ایک وہ بھی وقت تھا جسم کے اس حصے میں پور دھنس جاتی تھی...... قمیص کا گلا چپک کر جسم کا ہی حصہ بن جاتا تھا۔

''سب کچھ ضائع ہو گیا......؟ کہ تم نے ضائع کر دیا...... مگر وہ اپنے آپ کو

خوش باش ظاہر کرے گی...... اس کی بیوی سے محبت سے ملے گی...... ذرا ملول نہ ہوگی...... پھر وہ...... بال سمجھانے میں مصروف ہوگئی۔''

کان کے قریب سرگوشی ابھری ''آپ پر تو دو چوٹیاں بہت سجتی ہیں بالکل چھوٹی سی بچی لگتی ہیں۔'' اور اس نے...... غیر ارادی طور پر بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔ مگر چمکتے ہوئے چاندی کے تار مسکرا دیئے تو وہ جھینپ گئی۔

''اب بھلا دو چوٹیوں کی عمر کہاں......؟''

پھر اسے جانے کیا ہوا اس نے برش آئینے پر دے مارا...... ''تم نے میری زندگی برباد کردی ہے...... تم نے مجھے ضائع کردیا ہے...... خاک کردیا ہے مجھے...... میں دیکھوں گی تم کس طرح خوش رہو گے ضائع میں تمہاری بیوی کو بتاؤں گی۔ اس کے دل میں کسی کی پختہ محبت نہیں، یہ شخص ہرجائی ہے...... کھلاڑی ہے......''

وہ زمین پر بیٹھ کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

☆☆☆

''ارے دماغ تو صحیح ہے تمہارا......'' وہ اپنی ماموں زاد پر بھڑک کر بولی۔

''میرا دماغ بالکل صحیح ہے...... تم نے ساتھ دینا ہے تو دو ورنہ وہ تو کہہ رہا ہے ہم کورٹ میرج کرلیں گے۔''

''کورٹ میرج...... اس کے چھکے چھوٹ گئے۔''

''رر...... رضیہ......! میری بہن...... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں...... اس میں کسی کا بھی بھلا نہیں...... تمہارا بھی نہیں......''

''بلا سے...... اس کی محبت میں مجھے اپنا آپ مٹانا بھی منظور ہے۔'' اور وہ رضیہ کی منہ زوری پر خوفزدہ سی دیکھنے لگی۔

''ما...... ماموں جان تجھے جان سے مار ڈالیں گے......''

''تو...... مار ڈالیں۔''

''دیکھو رضیہ! یہ شریف لڑکیوں کے طریقے نہیں۔''

''تو مت کہو مجھے شریف لڑکی۔''

وہ گنگ سی رہ گئی...... پھر نہایت برا مان کر بولی ''محض ایک خاکی انسان کی خاطر اپنے آپ کو ذلیل کہلوانا بھی پسند کررہی ہے۔''

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے...... محترمہ سجیلا عباس صاحبہ! زندگی خاکی انسانوں کے ساتھ ہی گزاری جاتی ہے۔ خاکی انسان ہی باہم مل کر ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ غالباً آپ...... پری زاد یا کسی جن بھوت سے نکاح پڑھوائیں گی'' اس مرتبہ رضیہ بھی تھوڑی برہم ہوگئی۔

''رضیہ! وہ دو بچوں کا باپ ہے...... اس کی بیوی کا خیال نہیں تو اس کے بچوں پر ہی رحم کرو......'' وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

''محبت ہی کرنی تھی تو کسی کنوارے سے کرلیتیں...... کمی تو نہیں یہاں۔''

''سجو! محبت کی نہیں جاتی ہوجاتی ہے۔ بائرن کہتا ہے'' اپنے لہجے جذبات میں عورت اپنے چاہنے والے کو چاہتی ہے اس کے بعد اسے محبت ہوجاتی ہے۔ سجو تجھے کیا معلوم! اس نے مجھے کس قدر ٹوٹ کر چاہا ہے اتنی شدتوں سے کہ ایسی شدتیں ہر لڑکی کا حق نہیں ہوتیں۔ تو کیا سمجھتی ہے...... میں پکے پھل کی طرح اس کی پہلی نظر میں...... سجو میں نے اسے ہر زاویئے سے ٹٹولا ہے۔ وہ میرا خالہ زاد ہے ظاہر ہے آزادی سے گھر میں آتا جاتا ہے۔ جب اس نے پہلی مرتبہ مجھ پر اپنے جذبے کا خاموش اظہار کیا تھا تو میں بری طرح بھڑک گئی تھی...... میں نے سخت لعن طعن کیا تھا۔ سجو! میں نے اسے اس قدر ذلیل کیا تھا کہ بیوی کی موجودگی میں وہ...... مگر اس پر ذرا اثر نہ ہوا...... وہ ہر موقع پر بالکل خاموش ہو رہا...... اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنی اس قدر توہین پر میرا منہ نوچ لیتا۔

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ برا بھلا کہا...... تب پتا ہے اس نے کہا تھا......''

مجھے بھی یہ اچھا لگتا ہے......'' اس کی شدتوں نے مجھے ہرا دیا تھا......سجو تونے تو دیکھا ہے ناں......کتنی شاندار شخصیت ہے...... باطنی طور پر بھی وہ نہایت پاکیزہ ہے۔''

''پاکیزہ......!'' سجو استہزائیہ مسکرائی۔

''پہلے کون سا تم آسمان پر رہتی تھیں۔ اسے شادی سے پہلے ہوش نہیں آیا تھا، آخر کو تمہارا خالہ زاد ہے کوئی دشواری بھی نہیں تھی۔ ارے، یہ مرد بڑے چالباز ہوتے ہیں......سجو......'' جب رحمٰن کی شادی ہوئی میں تیرہ سال کی تھی تم لوگ تو اس وقت تک کراچی نہیں آئے تھے۔ اس لیے مجھے معلوم نہیں پورے تین سال سے وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ان کی بیوی پر بھی سب عیاں ہے جب ہی تو میں وہاں نہیں جاتی...... اور اب تو یہ معاملہ سب پر کھل چکا ہے وہ بھی نہیں آتے انہوں نے مجھے کئی بار باہر ملنے کو کہا، مگر مجھے یہ پسند نہیں کہ شادی سے پہلے مرد کے الٹے سیدھے مطالبات مانو......! اس طرح عورت کا اسرار بھی ختم ہوتا ہے۔ وہ میرے انکار پر ناراض ہوگیا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے وہ ایک جنرل اسٹور پر ٹکرا گیا تھا مجھے دیکھ کر اس نے فوراً ایک چٹ پر لکھا اور میری طرف کھسکا کر باہر نکل گیا...... یہ دیکھ......''

رضیہ نے تکیئے کے نیچے سے ایک پرزہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے اپنا ہم خیال بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔

تب اس نے تحریر کردہ سطور پر نظر دوڑائی۔

Your heart is not piece flesh, you are callous.

(تمہارا دل گوشت کا ٹکڑا نہیں، تم پتھر دل ہو)

''اب تو ہی کہہ یہ دل ٹوٹنے والی باتیں نہیں ہیں......؟ کون سی عورت ہے جو اس کی دیوانگی پر خود پاگل نہ ہوگی...... سجو...... کہہ دے امی سے...... میرا وہی فیصلہ ہے میں صرف رحمٰن کی ہوں......'' وہ چٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''رضیہ تو پاگل ہوگئی ہے...... بے کار کی ڈرامے بازی کر رہے ہیں رحمٰن

بھائی...... سب کی عزتیں خاک میں مل جائیں گی...... ممانی جان اپنی بہن سے ہمیشہ کے لیے کٹ جائیں گی۔

''اس نے تو شرافت سے رشتہ مانگا ہے مسئلہ تو گھر والے خود بنا رہے ہیں تو ہم کیا کریں، یہ راستہ تو گھر والے خود دکھا رہے ہیں۔ اولاد کی خوشیوں کی انہیں ذرا پرواہ نہیں بس لوگوں کی فکر ہے۔''

''سب درست کہہ رہے ہیں، واقعی یہ غلط قدم ہے۔ اور مجھے یہ غلطی بہت پسند ہے چلو اٹھو باہر لان میں بیٹھتے ہیں، کچھ تیرے دماغ کی گرمی بھی کم ہوگی......'' رضیہ ہمیشہ کی طرح خوش باش تھی اور پورا گھر بکھر رہا تھا۔

وہ کھڑی ہی ہوئی تھی کہ چند لڑکے لڑکیاں شور کرتے اندر آگئے۔

''آنٹی نے ٹھیک کہا تھا کہ رضیہ اپنے کمرے میں ہوگی۔'' ان میں سے ایک لڑکی بولی، پھر سب نے سجیلہ کی سمت سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ میری سب سے بڑی پھوپھو کی صاحب زادی ہیں۔ ہمارے پھوپھا ریٹائر ہوگئے ہیں اور اب پنڈی سے کراچی آگئے ہیں اور یہیں کاروبار کر رہے ہیں۔ آسیہ باجی آپ کے برابر والا گھر ہماری پھوپھو کا ہی تو ہے۔'' رضیہ ایک تسلسل سے بولی۔

سب کافی بے تکلف اور خوش باش تھے۔ رضیہ کے گھر بہت آنا جانا تھا رضیہ نے ان سب کا تعارف کرایا۔

''یہ ہارون بھائی ہیں۔'' اس نے مسکراتے لبوں والے پروقار سے مرد کی جانب اشارہ کیا۔

''ان سے چھوٹی یہ آسیہ باجی ہیں، یہ نازیہ اس سے چھوٹی سعدیہ اور مسخرا مامون ہے۔ ہم لوگ بالکل ایک فیملی کی طرح رہتے ہیں۔''

''ارے بھئی رضیہ! تم نے یہ نہیں پوچھا کہ بیک وقت ہم پانچوں کا نزول

کیوں ہوا ہے۔"

"کوئی نئی بات...... یہ نزول تو سارا سال ہی جاری و ساری رہتا ہے آج کی کیا بات......" رضیہ ہنسی۔

"دراصل آج ہارون بھائی کی چھٹی تھی۔ تو ہم نے سوچا آج ایسے ذرا چکر لگا آئیں...... کون وغیرہ کا بھی پروگرام ہے سوچا تمہیں اور نازیہ کو بھی لے چلیں...... اور اب تو آپ بھی چلیے لطف رہے گا۔" سعدیہ بات کرتے کرتے اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

"شکریہ! آپ لوگ جائیں مجھے چند ضروری کام تمام کرنے ہیں۔"

"اچھا رضیہ صبح ضرور آنا آپ لوگ بھی آیئے گا......" اس نے اخلاقاً دعوت دی۔

اس کے وہاں سے جلد اٹھ آنے کی وجہ اس شخص کی نگاہیں بھی تھیں جسے ہارون بھائی کہہ رہے تھے۔

اس شخص کو آج سے پہلے بھی اس نے آصف بھائی کے ساتھ شطرنج کی بساط بچھائے ڈرائنگ روم میں بیٹھے دیکھا تھا۔

رضیہ کے ہاں ان کا بہت آنا جانا تھا۔ رضیہ انہیں ایک دو مرتبہ جمیلہ کے ہاں لائی مگر وہ کبھی ان کے گھر نہیں گئی۔ وہ جلد گھلنے ملنے والی طبیعت نہیں رکھتی تھی۔ ایک دم کسی سے بے تکلف ہو جانا اسے پسند نہیں تھا۔

آج کل وہ رضیہ کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی۔ کہ خدا معلوم کب اس کے ذہن میں خناس سا جائے۔ ممانی جان رضیہ سے سخت خفا تھیں۔ مگر اس کا احساس بھی چند قریبی لوگوں کو تھا۔ انہوں نے رضیہ سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ اور اس شخص نے الگ ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تھا جب اس کی آنکھیں پیغام رسا بنیں تو اس نے وہاں جانا بہت کم کر دیا ان مردوں کو کوئی کام نہیں تانکنے جھانکنے کے سوا۔

رضیہ کی وجہ سے اس کا نزلہ آج کل تمام مردوں پر گر رہا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے بڑوں کی روایات کا احترام کرنے والی مشرقی لڑکی تھی۔ اور یہ شخص تو جیسے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔

آصف بھائی کے ایک سالہ بیٹے کی سالگرہ تھی گھر گھر کے تھے۔ بس چھوٹی سی تقریب تھی۔ تالیوں کی گونج میں جگنو نے کیک کاٹا۔ تقریب کے بعد لڑکے لڑکیوں میں بیت بازی کا مقابلہ شروع ہوا وہ اور آصف اس میں شامل نہیں تھے۔ وہ تو یہ کہتے ہوئے دور جا بیٹھے۔

"شادی سے پہلے سینکڑوں شعر یاد تھے، انہوں نے بھابھی کی طرف دیکھ کر ایک آہ سرد کھینچی، اب اگر کوئی یاد بھی ہے تو وہ بھی بے وزن، بھابھی ایک خوش مزاج عورت تھیں۔ شوہر کی بات پر مسکرا دیں۔"

"ہارون بھائی......! پہلے آپ شروع کریں۔" نازیہ بولی۔

ہارون نے کشن کہنی کے نیچے رکھا اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔

میں حرف حرف حقیقت ورق ورق سچا
مگر یہ شرط ہے مجھے غور سے پڑھو جاناں

نون کا شعر...... چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا۔

"آ گیا......" ماموں نے اعلان کیا پھر نہایت سنجیدگی سے گویا ہوا۔

نکالا مجھ کو جنت سے فریب زندگی دے کر
دیا پھر شوق جنت کا، یہ حیرانی نہیں جاتی

سب بے ساختہ ہنس پڑے بلاشبہ کا درد تھا ماموں کے لیے لہجے میں

پھر ایک دم راضیہ بولی "سنیے صاحب......!"

یا رب میرے نصیب کا کچھ فیصلہ تو کر
میں یونہی ڈوب جاؤں یا ساحل بھی آئے گا

اس نے راضیہ کی طرف دیکھا تو وہ نگاہ چرا گئی۔

معاً ہارون کی آواز اُبھری ''توجہ چاہتا ہوں۔''

ارے ہارون بھائی! آپ تو اس طرح سنا رہے ہیں جیسے اپنے تخلیق کردہ ہوں......'' ماموں نے کہا تو ہارون بولے۔

''سب میری سوچ کے ترجمان ہیں کوئی مجھ سے پہلے کہہ گیا تو کیا کروں......'' سب ہنس دیئے الف کا شعر......

ایک تیری تمنا نے کچھ ایسا نوازا ہے
مانگی ہی نہیں جاتی اب کوئی دعا ہم سے

انہوں نے نہایت گہرے انداز میں اسے دیکھا تو نروس سی ہوگئی، وہ تب اس کی نظر پہلو میں بیٹھی مہکتی راضیہ کے پاؤں پر پڑی۔ اسے یاد آیا کہ وہ تقریباً دو ماہ سے ناصح کا کردار بخوبی نبھا رہی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ پُراعتمادسی ہو کر بیٹھ گئی۔

اور پھر اس نے ایک حرکت کی جیسے ہی ہارون نے شعر پڑھنا چاہا وہ اس شعر کی تفسیر بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

مغرور تھا کمال سخن پر بہت حفیظ
ہم نے بھی واہ واہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

سب نے بہت روکا مگر وہ امی کو زبردستی لے کر گھر آ گئی۔ سونے سے بیشتر اس نے راضیہ کے متعلق سوچا......'' خدا اس لڑکی کو عقل دے رحمٰن بھائی کی بیوی کا خدا معلوم کیا حال ہوگا پتا نہیں آخر رحمٰن بھائی نے کس طریقے سے ان سے دوسری شادی کی اجازت لی ہے......؟''

☆☆☆

دونوں بہنوں کے ذہن ماؤف ہو چکے تھے ایک طرف بیٹا نہایت گستاخی سے ماں سے خطاب کر رہا تھا۔

''جب صالحہ نے اجازت دے دی ہے تو آپ کو کیا تکلیف ہے؟''

دوسری طرف بیٹی ماں سے کہہ رہی تھی کہ وہ کچھ کھا کر سو رہے گی۔

''تو مر جاؤ......'' ماں نے نہایت سنگدلی سے کہا۔ ''قصور تمہارا ہی ہے وہ اپنی بیوی کے ساتھ ابھی تک ٹھیک ٹھاک رہ رہا تھا......''

''امی......!'' راضیہ سسک پڑی...... '' سچ امی! میں نے انہیں نہیں بھٹکایا۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں......''

''ضرورت بھی نہیں مجھے یقین دلانے کی، سب تمہاری حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔'' بجیلا کی ماں نے سمجھایا مگر وہاں ایک ہی گردان تھی۔

''نہیں پھوپھو۔''

تب ماموں جان بھڑک اٹھے ''میں اسے گولی مار دوں گا۔'' راضیہ پر کوئی اثر نہ ہوا، بجیلہ بیسویں صدی کا عشق دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

سب باتیں...... دلائل...... دھمکیاں...... خوشامدیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

انہوں نے کورٹ میرج کر لی تھی۔ جب مغرب کے وقت رضیہ نے فون پر اطلاع دی تو اسے غش سا آ گیا۔ ایک لفظ منہ سے نہ نکل سکا۔ ممانی جان نند سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ ان کی سگی بہن نے انہیں کیا کچھ نہ کہا تھا۔ امی نے بھاوج کے سامنے دل کو قابو میں رکھا۔ مگر گھر آ کر پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ آج جس شخص کی عزت خاک میں مل گئی تھی وہ ان کا ماں جایا تھا۔

ان دنوں بجیلہ سے چھوٹا فراز بھی ٹیکسلا سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ اس نے سر جھکا کر اتنا کہہ دیا'' راضیہ باجی نے یہ اچھا نہیں کیا۔

ایک روز راضیہ نے اسے فون کیا کہ وہ رحمٰن کے ساتھ سعودی عرب جا رہی ہے تو اگر وہ ملنا چاہے تو اسے پتے پر مل لے۔ تب اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا

''میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی، آئندہ مجھے فون مت کرنا''

وہ شاپنگ کے لیے فراز کے ہمراہ بوہری بازار آئی تھی۔ فراز اس سے تین سال چھوٹا تھا مگر قد میں تین ہاتھ اونچا ہو گیا تھا۔

''وہ کپڑا پسند کر رہے تھے۔ کہ معاً فراز اٹھ کر کھڑا ہوا۔''

''السلام علیکم ہارون بھائی!''

''وعلیکم اسلام بھئی...... کیا لے رہو ہو......؟''

اس نے مطلق توجہ نہ دی اور ایک پینٹ پیس اٹھا کر اسے اپنا ہم پسند بنانے کے لئے دلائل دینے لگی۔ مگر وہ بھی ایک ہی تھا۔ اسے دوسرا پیس پسند آ گیا تھا مگر اس نے دیکھا وہی پینٹ پیس ہارون پیک کروا رہا تھا۔ وہ ادائیگی کے بعد سرد چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہارون فراز سے باتوں میں مصروف تھا۔ محبوب کے قرابت داروں سے تعلق بڑھانا بھی محبت کے اصولوں میں شامل ہے۔ اور ہارون اس اصول پر نہایت سنجیدگی سے عمل پیرا تھا۔ اور وہ بھی سخت کوفت محسوس کر رہی تھی۔

''بھئی آخر ہم آپ کے پڑوسی ہیں، اور آپ کی اپیا ہیں کہ سلام تک کرنا پسند نہیں کرتیں۔''

غالباً اس کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا وہ اب اس کی ذات پر آ گیا تھا۔ یہ بات انہی جذبوں میں لپٹ کر پہنچی جن جذبوں میں سمو کر کہی گئی تھی۔ وہ سب کچھ محسوس کرتی تھی کہ عورت تھی جو مرد کی نظر پہچاننے میں دھوکہ نہیں کھاتی۔ اور اس معاملے میں نہایت حساس واقع ہوئی ہے۔

''آؤ، اب گھر ہی تو جانا ہے ناں؟''

''ابھی کہاں ہارون بھائی! ابھی تو اپیا کی جانے کتنی شاپنگ باقی ہے۔ ویسے ہمارے پاس اپنا گھوڑا ہے۔'' فراز نے اپنی ہنڈا کی سمت اشارہ کیا۔

راضیہ کے اس اقدام سے تمام ماحول پر ایک تکلف دہ تاثر چھا گیا تھا۔ ہر شے پر جمود طاری تھا۔ آسیہ باجی وغیرہ نہایت مخلص اور آئیڈیل پڑوسی تھے۔ ایسے انسان

جو دوسروں کو اپنے سامنے شرمندہ ہوتا دیکھ کر خود کو زمین گڑتا محسوس کرتے ہیں۔ اپنے دُکھ کی طرح دوسروں کے معاملے میں بھی اتنے ہی حساس ہوتے ہیں۔

اس روز دوپہر کا کھانا کھا کر وہ ماموں کی طرف چلی آئی جیسے ہمیشہ آ جاتی تھی۔ دوپٹہ اٹھا کر۔

بھابھی میکے گئی ہوئی تھی ممانی جان اپنے کمرے میں تھیں راضیہ سے چھوٹی تیرہ سالہ نازیہ کھولتے پانی سے کچن کا سنک صاف کر رہی تھی۔

''ارے نازو! دوپہر میں صفائی ہو رہی ہے؟''

''بس اپیا...... چکنائی جم گئی تھی۔ سوچا ساتھ ساتھ صاف کر لوں...... تاکہ مزے سے سوؤں آپ کو پتا ہے میں دوپہر میں سونے کی کس قدر شوقین ہوں، سب کام ہو جائیں تو نیند اچھی آتی ہے......''

''اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا تھوڑی دیر باتیں کریں گے پھر سو جائیں گے، چلو تم جب تک سنک صاف کرو میں کوئی کتاب دیکھ لیتی ہوں۔''

ذرا دیر باتیں ہوئیں منٹوں بعد ہی دونوں صوفوں پر بے سدھ ہو چکی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں ہی۔

شام پانچ بجے اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی نازو پہلے اٹھ چکی تھی۔ وہ موجود نہیں تھی۔

''اف توبہ! کتنی دیر ہو گئی امی بھی کہہ رہی ہوں گی یہاں آ کر یہیں کی ہو جاتی ہوں۔'' وہ سوئے سوئے انداز میں دروازے کی سمت بڑھی۔ اسی دم کوئی پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے۔

اس نے نیند سے بوجھل ہر تاثر سے خالی آنکھیں اٹھائیں۔ ہارون اپنی بے ساختہ مسکراہٹ سے موجود تھا۔

''راستہ دیں پلیز!'' جذبات سے عاری لہجے میں اس نے گویا درخواست کی

تھی۔

''میں کیا راستہ دوں؟ راستے تو ہیں ہی آپ کے ہمت کیجیے۔'' وہ اس کے سرد انداز پر بھی گویا فدا ہو کر بولا۔

وہی دھیما لہجہ جس لہجے میں اس نے کئی بار اڑتے اڑتے بول پھینکے تھے۔

اس کا خمار ایک دم اتر گیا۔

''ڈائیلاگ اچھے بول لیتے ہیں آپ۔'' وہ تنک کر بولی تھی۔

''آپ کو پسند آئے زہے نصیب۔''

''ارے بھئی! تم دروازے میں کیوں تک گئے...... مزہ تو آج ہے کھیل کا آج کل ویسے بھی تم ہار رہے ہو......'' اس کی پشت سے آصف بھائی کی آواز آئی۔

''ٹھیک کہا یار تم نے'' وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے بغور دیکھ کر بولا۔

ساتھ ہی وہ بھی ایک طرف ہٹ گئی۔ آصف بھائی کو راستہ دینے کے خیال سے جو بساط اور مہروں کا ڈبہ اٹھائے کھڑے تھے۔

''آداب......!''

''خوش رہو...... سو رہی تھیں......؟''

''جی......! اس نے جیسے گناہ کا اقرار کیا اور باہر نکل آئی دیوانہ...... سمجھتا ہے میں بے وقوف لڑکیوں کی طرح اس کی باتوں میں آ جاؤں گی۔ ان مزدوں کا ہارون کی لوفرانہ باتیں یاد کر کے دماغ میں کوفت سی بھر گئی۔''

☆☆☆

''اپیا...... اپیا......!'' نازو جانے کہاں سے آوازیں دے رہی تھی۔ ''ارے آپ یہاں ہیں...... میں نیچے تلاش کر رہی تھی! یہ ہارون بھائی نے کیسٹ دی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے آپ نے غزلوں کی کیسٹ کے لیے کہا تھا۔''

''ہم...... میں...... نے...... اوہ...... ہاں اچھا......! لاؤ......'' اس نے اس

کے ہاتھ سے کیسٹ جھپٹ لی۔''

''تم آج سکول نہیں گئیں؟''

''نہیں......!''

''کیوں......؟''

''ایسے ہی......''

''بھئی ریگولر جایا کرو۔''

''پتا ہے اپیا رات کو پاپا کے دوست آ گئے تھے۔ دیر سے سوئی تھی ناں پاپا کے دوستوں کے کام بھی میرے ذمہ ہیں۔ ہر دو منٹ بعد چائے کافی، باجی کے سارے کام اب مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں۔'' نازو بہن کا ذکر کرتے ہوئے بے تحاشہ اداس ہو گئی تھی۔

''بھابھی آ گئیں؟''

''نہیں کل آئیں گی۔''

''اپیا...... امی کہہ رہی تھیں آپ کی کام والی آئے، تو ہماری طرف بھیج دیجیے گا...... ہماری کام والی پتا نہیں کیوں نہیں آ رہی۔''

یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔

''عجیب احمق آدمی ہے...... نازو نویں جماعت میں پڑھتی ہے کوئی ذرا سی بچی تو نہیں جانے کس چیز کی ہے کیسٹ؟ اس نے دروازہ بند کر کے کیسٹ لگائی۔''

تھوڑی خاموشی کے بعد رفیع کی لچکتی آواز ابھری۔

اے کاش کہ ہوتی خبر تو نے ٹھکرایا ہے
شیشہ نہیں ساغر نہیں مندر سا اک دل ڈھایا ہے

بار بار اسی شعر کی گردان تھی۔ یہی دو مصرعے بار بار دہرائے گئے تھے۔ بڑا خوبصورت تسلسل لگ رہا تھا۔ اس نے کیسٹ پلٹ کر لگائی۔ ہارون کی اپنی آواز تھی۔

''صرف ایک بار اعتبار کر کے دیکھو سجیلا عباس......! عورت تو قدرت کی بڑی نازک کاوش ہے۔ یہ اتنی کٹھور کیوں ہوتی ہے۔ سنو یہ مذاق نہیں، کیا واقعی تم اتنی بے حس ہو۔ تمہیں اعتبار دلانے کی کیا قیمت ہے میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔ کچھ خوف خدا کرو۔ وہ نظر پیدا کرو جو پرکھ کی کسوٹی ہوتی ہے۔''

تب اس نے کیسٹ نکال لی۔ کچھ دیر غصے سے تھرتھراتی رہی۔

''اف اتنی جرأت......؟ اس قدر ہمت؟'' دل چاہتا ہے موصوف کی والدہ کے پاس لے جاؤں اور کہوں سنبھالیں موصوف کو۔ بڑے پر نکل رہے ہیں۔ غضب خدا کا...... بظاہر اتنا ڈیسنٹ انسان حرکتیں کاؤ بوائے جیسی...... دماغ ٹھکانے لگا دوں گی...... میاں مجنوں کا موقع ملتے ہی اس کے منہ پر دے ماروں گی۔ دن میں دو مرتبہ تو اس کے گھر کے سامنے سے گزر ہوتا ہے۔

شام کو وہ امی کو کہہ کر کہ وہ ماموں کے ہاں جا رہی ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد آ جائے گی۔ باہر آئی تو دیکھا، ہارون اپنے گھر کے لان میں کھڑا ٹیوب سے پانی پودوں میں ڈال رہا تھا۔ وہ دوبارہ اندر گئی۔ کیسٹ کی ریل جو اس نے نوچ کر ایک لفافے میں بھر دی تھی لے کر دوبارہ آئی، اس نے سبز باڑ سے باہر ہی کھڑے ہو کر کہا۔

''مسٹر ہارون۔''

ہارون نے بے تحاشا چونک کر اپنا جھکا سر اٹھایا۔

اسے دیکھ کر ایک سیراب ہی مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی، مگر قدم بڑھاتے ہی کوئی چیز اڑ کر اس کے قدموں میں آ رہی۔ اس نے جھک کر لفافہ اٹھایا۔ اس کے اندر جھانک کر دیکھا۔ چہرے پر سایہ لہرا گیا۔ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ ٹیوب گھاس پر پھینک کر سینے پر ہاتھ لپیٹ کر سامنے دیکھنے لگا۔ جہاں سانس بھرتا پتھر جا رہا تھا۔

''سجیلہ عباس...... میں نے تمہاری آرزو کی ہے...... تمہیں اپنے دل میں

بہت اُونچا مقام دیا ہے...... یہ کام مجھ سے روز تو نہ ہوں گے...... تم اور صرف تم...... مجھے یقین ہے میرے جذبے تمہیں ہرا دیں گے۔ مگر میں تمہیں کبھی شرمندہ نہیں کروں گا۔'' اس نے خوش امیدی کے ساتھ نئے سرے سے اپنی ہمت بندھائی۔

امی کی عادت ویسے ہی جلد گھل جانے والی تھی بہت ملنسار عادت تھی۔ اور اب تو یہاں آباد ہوئے بھی سال بھر سے زائد ہو گیا تھا۔ ہارون کی امی سے ان کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ ہارون کی بہنیں اکثر آ جاتی تھیں مگر اس کی دوستی خاص طور پر نمبر تین یعنی سعدیہ سے تھی۔ اس کی بہت بنتی تھی۔ سعدیہ حد سے زیادہ لاپرواہ و سادہ تھی سجیلا کو اس کا لاابالی پن بہت پسند تھا۔

کبھی کبھی وہ ضد کر کے گھر لے آتی تھی۔ اور اسے دیکھ کر ہارون کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ اس کی فقرہ بازی پر وہ نروس سی ہو جاتی تھی۔ اسے متوجہ کرنے کو اس کا شوخی سے کھنکارنا اسے ہراساں کر دیتا تھا۔

''اف! اس شخص کو تو ذرا بھی کسی کی پرواہ نہیں، اب یہ سب لوگ آنکھ کان سے تو بٹ ہیں نہیں۔ یہ شخص تو مجھے رسوا کر کے چھوڑے گا...... خدا معلوم یہ مشرقی مرد کیا ہوتے جا رہے ہیں...... فلمی ہیرو کی طرح...... ہاں۔'' چاہتے ہیں بطور مشغلہ دوستی چاہتے ہیں...... ہاں چاہتے ہیں...... اقرار چاہتے ہیں...... ان کے جذبے سچے نہیں ہوتے کہ انہیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا...... تم جسے چاہتے ہو مشرقی دستور کے مطابق اسے پانے کی کوشش کرو، یہ کیا کہ ایک اقرار کی خاطر مرے جا رہے ہیں مٹے جا رہے ہیں۔ جیسے ان مردوں کی رتی بھر شخصی پہچان نہیں۔

''سجیلا بڑی ایماندار لڑکی ہے...... سنو دیوانے اگر وہ ایک بار تمہارے سامنے بکھر گئی ناں...... تو بہت برا ہوگا کہ تمہاری نہ ہو سکی تو حیات تیاگ دے گی، لیکن کسی دوسرے سے منافقت نہ کر پائے گی...... سجیلہ میں دہرے پن کا حوصلہ کہاں۔''

''یہ ہو سکتا ہے کہ ایک بار انکار ہو...... انسان تو کئی بار کمر باندھ کر سکتا ہے......

ہے ناں...... جو ایک بار میں ہمت ہار دیتے ہیں وہ...... ریا کار ہوتے ہیں...... یہ محبتوں کے عارضی کھیل......اب اتنی بھی بے قیمت نہیں سجیلا......!''

اس نے کروٹ بدلی تو خوف کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ وہ بری طرح سہم گئی، آج سجیلا خود پر عیاں ہو گئی تھی۔ خود سے منہ چھپا کر کہاں جاتی؟ وہ سسک پڑی۔

''اگر تم سچے ہو تو وقت تمہارا ساتھی اور سجیلا قدر دان ہو گی۔ وقت تمہیں معتبر کر دے گا تو سجیلا بھی خود کو ہار دے گی۔ مگر اس وقت جب زمانے کی نگاہ میں وہ تمہاری ہو رہی ہو گی۔'' اس نے پہلو بدلا تو خود اپنی نگاہ میں رسوا ہو کر سوچنے لگی۔

''بس سجیلا یہی تھا تمہارا کردار...... اب ہارنے کو رہ ہی کیا گیا ہے...... کل یہ دل کیا کہتا تھا آج کیا کہہ رہا ہے؟ کیا کسی اور کے لیے بھی یہ دل یہی کہہ سکے گا...... نہیں......نہیں...... اللہ توبہ...... کبھی بھی نہیں کون کہتا ہے...... مرد پر عورت کا جادو چلتا ہے...... جادوگر تو یہ لوگ ہوتے ہیں راضیہ! تو نے جانے کب یہ کہا تھا جانے کس بڑے آدمی کی بات کہی تھی عورت اپنے پہلے جذبے میں اپنے چاہنے والے کو چاہتی ہے...... مگر راضیہ...... واقعی میں ٹھوس کردار کی لڑکی ہوں۔ مجھے اپنے فرائض کا احساس ہے، لڑکی اپنا بر خود ڈھونڈھے یہ بات آج بھی ہمارے خاندان میں معیوب نہ سہی ناپسند ضرور سمجھی جاتی ہے۔ اور پھر چادر جتنی اجلی ہوتی ہے داغ اتنا ہی نمایاں ہوتا ہے...... مگر نہیں یہ بھی درست ہے واقعی میرا ماضی...... اجلا کورا ہے...... سنو مہربان...... اپنے لیے سوچنا صرف اپنے مفاد کے لیے سوچنا خود غرضی ہے۔ سجیلا خود غرض نہیں مجھے اپنوں کے سر جھکانا منظور نہیں، وہ بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ اس کا بہت کچھ کھو گیا تھا اور اس میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ اتنا بڑا نقصان برداشت کر سکتی۔''

آج سعدیہ اسے زبردستی لے آئی تھی۔ آسیہ باجی کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں۔ نازیہ یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔

''میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ سوچا آپ کو لے آؤں کیرم کھیلیں گے۔''

''اچھا پہلے میں کچھ پینے کے لیے لے آؤں......بس ابھی آئی۔''

اور وہ بے ساختہ سامنے تپائی کی جانب بڑھ گئی۔ جس پر منیر نیازی کی دو کتابیں (مجموعہ) ''ماہ منیر'' اور ''اس بے وفا کا شہر'' رکھی تھیں۔

سعدیہ واپس آئی تو وہ وفور شوق سے بولی ''ارے سعدیہ'' یہ منیر نیازی کون پڑھتا ہے؟

''ہارون بھائی اور آسیہ باجی کو کریز ہے شعری کا اور ہارون بھائی تو منیر نیازی کے دیوانے ہیں۔ منیر کی کوئی کتاب بازار میں آئے اور ہمارے گھر نہ آ جائے فوراً ایسا کبھی نہیں ہوا...... بھئی مجھے تو کوئی دلچسپی نہیں اس شعر و شاعری سے...... ویسے ہارون بھائی دو شاعروں کو خاص طور پر پڑھتے ہیں۔ ایک تو منیر نیازی دوسرے ساغر صدیقی اور آسیہ باجی کشور ناہید اور فراز کو۔''

''آپ پڑھتی ہیں تو لے جائیے گا۔'' سعدیہ نے اس کی جانب گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ارے اپیا...... آپ کبھی خود بھی آ جایا کریں۔ ہمارے گھر آسیہ باجی کہہ رہی تھیں کہ شاید سجیلہ ملنا پسند نہیں کرتی۔''

''نہیں سعدیہ! ایسی تو کوئی بات نہیں بس ادھر قدم ہی نہیں اٹھتے۔''

''کیوں جنوں کا بسیرا ہے ہاں؟'' اچانک ہارون اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''شاید......! اس نے اپنا لہجہ تیکھا کر لیا۔''

''اور کیا حال ہیں؟ میرا مطلب ہے مزاج بخیر؟''

''الحمدللہ......!'' اس نے کتابیں واپس رکھتے ہوئے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''اگر آپ پڑھنا چاہیں لے لیں کوئی بات نہیں...... واقعی اچھا بلکہ لاجواب کہتا ہے۔'' شکریہ

''اتنی سی بات پر شکریہ...... ہم تو...... ارے بھئی سعدیہ چائے وائے لاؤ ناں...... یہ تو بڑے اہم مہمان ہیں۔''

''ہم تو ابھی ابھی اسکوائش پی کر بیٹھے ہیں۔ یہ گلاس گواہ ہیں۔'' شاید اس نے بھائی کے بننے پر مذاق کیا۔''

''اچھا میرے لیے کافی لاؤ...... کریم اچھی طرح پھینٹنا۔''

اسے جانے میں دیر نہ لگی کہ اس نے بہن کو ٹالا ہے۔

''آپ کو یہ شاعر کیوں پسند ہیں، یہ تو کسی بے وفا کا ستایا ہوا ہے۔ بڑے چوٹ کھائے اور احساسات کا مالک، آپ پر بھلا کیا اثر ہوتا ہوگا۔ شاعری کا، شاعری سے خط اُٹھانے کے لیے تو بڑا، رقیق، حساس اور گہرا دل چاہیے ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟''

''جی نہیں...... میرے متعلق آپ کے اندازے غلط ہیں۔''

''جی نہیں...... سو فیصد درست ہیں۔''

''دراصل میں مرد کو قابل اعتماد نہیں سمجھتی۔ لڑکیوں کی کمی تو نہیں ایک سے ناامید ہوکر دوسری جانب بڑھ جاتا ہے۔ کسی ایک کے لیے سچا ہو ہی نہیں سکتا...... یہ میری سوچ ہے آیا سمجھ میں...... ہارون صاحب! میں آپ سے صاف صاف کہہ رہی ہوں آج آئندہ میرے ساتھ اس قسم کی گفتگو سے پرہیز کیجیے گا۔ میں تنگ آگئی ہوں آپ کی ان سستی باتوں سے باتیں یقین کا معیار نہیں۔ اعتبار کی کسوٹی نہیں۔ میں آپ کی بڑی عزت کرتی ہوں پلیز......''

وہ پھٹ پڑی، ہاں نہیں تو آر یا پار، فیصلہ تو ہونا چاہیے'' وہ دم بخود رہ گیا۔

اسے اس طرح برستے دیکھ کر، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

''کاش بجیلہ! آپ کو احساس ہوتا کہ کس قدر غلط سوچ ہے، آپ کی میرے متعلق یہ بھی سن لیجیے عزت وقار عورت ہی کی میراث نہیں۔ اس خزانے پر مرد کا برابر کا حصہ ہوتا ہے۔ مرد کی بھی عزت نفس ہوتی ہے۔'' یہ کہ کر وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

''وہ خود جیسے لحد میں اتر گئی...... دل مرسا گیا۔''

جیسے وہ آج واقعی کھو گیا۔ اس کا پروانہ چاہت تھی تو دولت ہوتی ہے۔ دولت لٹ جائے تو صدمہ تو ہوتا ہے، اور وہ دامن جھاڑ کر چلی آئی۔

مگر چند گھنٹوں کی پشیمانی کے بعد دماغ میں وہی خناس بھر گیا۔ شاید وہ بن رہا ہو۔ دراصل اس کے گرد کئی مثالیں تھیں۔ جنھوں نے منہ کے بل گر کر چوٹ کھائی تھی۔ اور وہ اسی وجہ سے محتاط رہی آج تک، اور خود کو حق پر سمجھتی رہی اور پھر وہ ایک نہایت مشرقی لڑکی تھی۔ ہارون تھا کہ صرف ایک ہاں کی خاطر کتنی بار ذلیل ہوا تھا۔

''ہر جگہ تماشا بنا دیتا ہے مجھے، میں نے ٹھیک کہا ہے۔''

وہ خود کو تسلی دیتی ہوئی کام میں مصروف ہوگئی، مگر دل کی چبھن کسی طور پر کم نہ ہوئی کئی مرتبہ جی چاہا اس سوگوار کے دامن میں منہ چھپا کر ڈھیروں آنسو بہائے، معافی مانگ لے۔ ہائے حساس لوگ کتنے کم بخت ہوتے ہیں کسی کا دل دکھا کر کسی طور پر چین نہیں پاتے۔

☆☆☆

شام کو سعدیہ کتابیں اٹھائے چلی آئی۔

''ہارون بھائی کہنے لگے کہ تمہاری اپیا نے کہا تھا ان کتابوں کے لیے جاؤ دے آؤ آپ شاید بھول آئی تھیں۔'' اس نے سائیڈ ٹیبل پر کتابیں رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سب منیر نیازی کی ہیں۔'' وہ مزید بولی۔

ہارون نے کہا ان کتابوں کے لیے اس کی استقامت آج بھی وہی ہے گویا''

اس کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا۔

رات کو سونے سے پہلے وہ ساری کتابیں سامنے پھیلا کر بیٹھ گئی۔ ایک پتلی سی کتاب ''آغاز زمستان میں دوبارہ'' اٹھائی اور ورق گردانی کرنے لگی۔ اچانک ٹھٹھک گئی چند اشعار ٹک مار کیے ہوئے تھے وہ نظریں دوڑانے لگی۔

میں محبت اس سے کس طرح کروں
دل میں جو ہے کس طرح اس سے کہوں
میرے اس کے درمیان بیگانگی برسوں کی ہے
ایک بے مفہوم خاموشی برسوں کی ہے

وہ سوچتی رہ گئی۔ تمام کتابیں ایک طرف کر کے لیٹ گئی، پھر اس سے کچھ پڑھا نہ گیا۔ ٹیبل لیمپ بجھا کر اس نے بہت کچھ سوچا پاگلوں کی طرح سوچا۔

☆☆☆

وہ اپنی اس وضع پر ڈٹی رہی۔ نہ ٹوٹی نہ جھکی نہ مہربان ہوئی، یہاں تک کہ آسیہ باجی بھی پی کے دیس سدھار گئیں۔ گولڈن سینڈل، گولڈن نازک سا جڑاؤ سیٹ پہنے اپنے مخصوص انداز میں سینے پر دو چوٹیاں ڈالے وہ کسی کام سے برآمدے کی طرف نکل آئی تھی۔ اس نے تصور میں اپنی حقیقت میں پرائی بے مہر لڑکی کو دیکھا۔ ٹھٹھک کر دیکھا حسرت سے دیکھا اسی دم کہیں سے دوڑتا ہوا جگنو آ گیا تھا۔

ہارون اسے گود میں اٹھا کر بولا ''یار! تم پر یہ دو چوٹیاں کس قدر خوبصورت لگتی ہیں آج تو تم کسی ریاست کے شہزادے لگ رہے ہو واہ یار! واہ! رات جو دو گھنٹے کی نیند لے لیا کرتے تھے آج سے وہ بھی گئی'' اور اس روز سچ مچ وہ بڑی مشکل سے مسکراہٹ ضبط کر سکی تھی۔

آسیہ باجی کی شادی کے مہینے بھر بعد ہی سعدیہ ایک روز بولی ''ہارون بھائی سنگا پور جا رہے ہیں۔ انہیں وہاں نہایت معقول ملازمت مل گئی ہے۔'' پھر اس کی طرف

دیکھتے ہوئے بولی۔

''کاش! آپ انکار نہ کرتیں، ورنہ ہم سب کی یہی تمنا تھی کہ آپ ہماری بھابی بن جائیں خیر نصیب اپنا اپنا، اور اسے جیسے کرنٹ لگ گیا ''انکار......؟''

''کیسا انکار......؟''

وہ سن بیٹھی سوچتی رہ گئی۔ یہ سعدیہ کیا کہہ گئی ہے۔

اسی دن شام کو وہ ماموں کے ہاں جگنو کو نہلا کر کپڑے پہنا رہی تھی۔ بھابی یکدم بولیں۔

''سجو! ہر بات کی وجہ ہوتی ہے۔ یہ بلاوجہ انکار اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔ بھلا کیا برائی ہے ہارون میں......؟ بلکہ پورا گھر ہی ان کا اچھا ہے۔''

وہ ٹکر ٹکر بھابی کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

''سچی بات تو یہ ہے مجھے تمہارے فیصلے سے دکھ ہوا بہت زیادہ پھوپھی امی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں ہارون شروع سے ہی ناپسند ہے...... بلکہ پہلے تو تم ان کے ہاں جانا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ مگر سعدیہ زبردستی لے جاتی ہے۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ شادی کے معاملے میں لڑکیوں کی رائے کو مقدم رکھنا چاہیے تاکہ شادی کے بعد وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھا سکیں۔ مگر بی بی! جب اتنا اچھا شخص تمہیں پسند نہیں آیا جانے تمہارے خیالات کتنے اونچے ہوں گے کیسا شخص پسند کرو گی؟'' مگر بی بی ذرا اڑان نیچی ہی رکھو کہ جتنے اوپر سے گرو گی میرے منہ میں خاک اتنی زیادہ گہری چوٹ لگے گی۔''

بھابی اپنی ہی کہے جا رہی تھیں۔ دوپہر سعدیہ دھماکے کر گئی تھی۔ اب بھابی کان میں توپیں داغ رہی تھیں۔ اس کی کائنات لٹ رہی تھی۔ بلکہ لٹ گئی تھی۔ کتنے آرام سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا کسے کہتے ہیں۔ آج سمجھ میں آیا تھا۔ ان دنوں وہ رضیہ کی وجہ سے ویسے ہی آؤٹ رہتی تھی۔ اس پر امی کا بار بار کہنا آسیہ کتنا بلاتی ہے۔

چلی جایا کرو بچیوں کے پاس۔ تب ایک روز اس نے جھلا کر کہہ دیا تھا۔

''میرا دل نہیں چاہتا ان کے جانے کو، خاص طور پر ان کے بھائی ہارون تو زہر لگتے ہیں مجھے بس امی آپ مجھے وہاں جانے کو مت کہا کریں۔'' اس کے گمان میں بھی نہ تھا اس وقت کی کہی گئی ایک بے معنی سے بات مستقبل میں اتنی اہم صورت اختیار کر جائے گی۔ جب ہی تو امی نے بالا ہی بالا انکار کر دیا تھا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی ذرا ذرا سی بات اور پسند و ناپسند کو وہ بہت اہمیت دیتی تھیں۔

اپنا ہی بچھایا ہوا کانٹا تھا جو چبھا تھا۔ آگ اپنے ہاتھوں ہی لگائی تھی۔

اس رات آنسو رو کے وہ کس قدر بے کل پھری۔

تڑپتی رہی۔

ایک روز وہ چلا گیا، قریبی پڑوسی ہونے کے ناتے وہ ملنے آیا۔ مگر وہ سامنے نہ آئی سارا کشٹ ضائع ہو جانے کا خطرہ تھا، بہت سے لوگ ائیر پورٹ جا رہے تھے۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا، اس کی جھلک دکھائی دی کلیجے میں برچھی سی لگی۔ گہرے سوٹ میں ملبوس مضبوط سراپے نے سہارا نہ دیا۔ سہارے کی امید تو دی تھی۔ اس شخص نے اتنا ٹوٹ کر چاہا مجھے، آہ کتنا بکھر رہا ہوگا آج جی چاہتا ہے اسے روک لوں۔ اتنا روؤں کہ آنسوؤں کے سمندر میں ماضی سارا کا سارا بہہ جائے۔ مقدر لوگوں کو کھلونا بناتا ہے۔ اس نے مقدر کو کھلونا بنا دیا تھا۔

جانے کیا ہو گیا پھر آنکھوں سے آنسو بہنا ہی بند ہو گئے۔

بے حس سی ہو کر رہ گئی۔

اس کے جانے کے بعد اس نے ایم۔ ایس۔ سی میں ایڈمشن لے لیا۔ امی کو اس کی شادی کی پڑی تھی۔ انہوں نے اسے منع کیا مگر وہ اب بہت خود سری ہو گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد پہلی عید آئی تو عین عید کے روز اسے عید کارڈ موصول ہوا لفافے پر بڑے آرٹسٹک انداز میں ''جمیلہ عباس'' لکھا ہوا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ

کھولا دو سطریں انگریزی میں تحریر تھیں۔

نیچے ایک شعر درج تھا۔

آواز دے کر دیکھ لو شاید مل ہی جائے

ورنہ تمام عمر کا سفر رائیگاں تو ہے

وہ اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ سوجی آنکھیں چھپانے کے لیے اسے سر درد کا بہانہ کر کے بستر پر عید گزارنی پڑی بار بار تکیے کے نیچے سے کارڈ نکال کر پڑھا اور پڑھ پڑھ کر روئی، احساس زیاں وبال جان بن رہا تھا ''اے میرے حبیب جو مقدر محرم سا نہ ہوتا ہم یہ عید مل کر گزار رہے ہوتے اے خدا مجھے صبر کیونکر آئے گا؟ میں سکون کیوں کر پاؤں گی سکون سے نماز پڑھنے کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو ہتھیلی پر تم آ جاتے ہو، مجھ میں تھوڑی سی ہمت ہو تو تمہیں بلا بھیجوں مگر پھر وہی ان کی باتیں بس میرا علاج مرگ ہی ہے ہاں......شاید

☆☆☆

ادھر گھر والے سخت پریشان تھے۔ ایک سے ایک رشتہ آ رہا تھا۔ مگر اس کا جواب یہی، یہ بھی نہیں، وہ بھی نہیں، نہیں، نہیں، نہیں

تب ماں جھنجھلا گئیں۔ ''تم آخر چاہتی کیا ہو، تمہارے فائنل میں سال بھر تو رہ گیا ہے شادی میں سال تو لگ جائے گا۔ رشتہ طے ہو جائے اور بھی دوسرے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ بس اب ہمیں جو پسند آ جائے گا طے کر دیں گے۔ یہ بھی کوئی بات ہے، عمر گزر جائے تو رنڈوے دوہا جو ہی مقدر میں رہ جاتے ہیں۔

''امی! میں سرے سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔''

وہ بول اٹھی (اف کیسے حوصلے دے گیا تھا وہ شخص)

ماں ہکا بکا رہ کھڑی رہ گئیں۔

''کیا بک رہی ہو؟'' دماغ تو ٹھکانے ہے......؟''

''بس مجھے مرد کی حاکمیت پسند نہیں، مجھے نفرت ہے شادی سے۔''

''اے بادشاہ زادیاں، ولیوں کی بیٹیاں سب بیاہی گئیں۔ مرد کو تو خدا نے عورت کا ساتھی، اس کا محافظ بنایا ہے۔''

''اب تم...... زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں،...... ابھی تمہیں عقل نہیں ہم جو کریں گے تمہاری بہتری کے لیے کریں گے سمجھیں؟''

تب وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کا تڑپنا ماں سے نہ دیکھا گیا...... ایک دم نرم پڑ گئیں۔ انہوں نے ٹٹولتی نظروں سے بیٹی کو دیکھا پھر اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولیں'' اگر کوئی بات ہے تو ماں سے کہہ دو، ان کی آنکھوں میں اندیشے سرسرا رہے تھے۔ انہیں راضیہ یاد آ گئی۔

''کیا تم کہیں اور چاہتی ہو؟''

''ہاں......'' وہ دھک سے رہ گئی ''یہ بات ماں کے ذہن میں کیوں آئی......؟''

''نہیں امی...... میں کبھی بھی نہیں......''

''کبھی نہیں کا کوئی سوال نہیں...... اگر تم ابھی تیار نہیں تو دو سال بعد سہی چلو یہ رونا دھونا بند کرو......'' وہ باہر نکل گئیں۔

تب اس نے سوچا ہاں شاید وہ اس عرصے میں واپس آ جائے تڑپ کر، پھر جب لوگوں کی زبانی اسے معلوم ہوگا کہ وہ مسلسل شادی سے انکار کر رہی ہے۔ پھر شاید وہ آپ ہی آپ سمجھ جائے۔ مجھے بے رحم کہنے والا۔ کس قدر بے رحم سنگدل ہے کیسے جذبے جگا گیا۔ نہ مرتوں میں چھوڑ گیا نہ زندوں میں، اس کو تو احساس بھی نہیں ہوگا کہ وہ کس قدر تباہ کر گیا ہے۔ کسی کی ہنستی کھیلتی زندگی کو۔ مگر وہ تو ایک مرتبہ کے انکار سے حوصلہ ہار گیا ہے مگر نہیں وہ واقعی دکھی ہو گیا ہوگا کہ ہمارے گھر والوں نے نہیں بلکہ میں نے خود، اس کا دل چاہا آپ اپنا آپ پیٹ ڈالے۔ چیخیں مار مار کر روئے۔ کئی بار قلم اٹھا

کر تڑپ کر بیٹھی۔ چاہا صرف اتنا لکھ دے ''آ جاؤ''

اسی دم ذہن کے کسی کونے میں راضیہ سرسراتی استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ، سجو جان محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے...... اب معلوم ہوا......؟''

''نہیں...... نہیں...... میں محبت تو نہیں کرتی...... اس کی شدتیں دیکھ کر میرا دل...... میرا نرم دل مجھے ملامت کرتا رہتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کوئی اور بھی تو ہوگا جو اتنی استقامت سے میرے کٹھور پن کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔ واقعی میں اپنی نرم دلی سے مجبور ہوں مجھے محبت تو نہیں...... مجھے نزلہ...... زکام...... فلو...... ہو سکتا ہے۔ مگر محبت ناممکن...... قطعی نہیں...... میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے کہ میں نے ایک حساس شخص کا دل دکھایا ہے میں ہمیشہ خود احتسابی کے عمل میں مصروف رہی ہوں۔ میرا موجودہ طرز عمل انصاف پر مبنی ہے۔''

وہ محبت سے منکر لڑکی طفل تسلیوں میں خود کو بہلاتی رہی آنے والا نہ آیا۔

آسیہ سے چھوٹی نازیہ اسی کے کالج میں لیکچرار تھی۔ دونوں ساتھ جاتی تھیں آج کل میں نازیہ کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ صرف ہارون کے انتظار میں اس کی شادی اتنی لیٹ ہو گئی تھی...... مگر اب اس کا انتظار، تمام تھا۔

کالج جاتے ہوئے نادیہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بتایا۔

''ہارون بھائی کا رات فون آیا تھا۔ انہوں نے شادی کر لی ہے بہت وہ ہیں، ہم سب سے باتیں کرتے رہے وہ آسیہ باجی نے شادی کا ذکر چھیڑ دیا تو بولے میں نے کر لی ہے ایک ہم وطن لڑکی سے، بہت وہ ہیں، ہارون بھائی، لو بھلا ہمیں بتا دیتے ہم کتنی چاہ سے بیاہ کر لاتے، ہمیں کتنا ارمان تھا ان کی شادی کا۔''

نہ جانے نادیہ کیا کیا کہتی رہی۔ اس کی آنکھیں بے نور اور کان پٹ ہو رہے تھے بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئی۔

''ہم نے پوچھا کب آ رہے ہیں...... بولے کبھی بھی نہیں۔''

نادیہ نے ونڈ اسکرین پر نظریں گاڑ کر مزید اطلاع بہم پہنچائی۔

''ہونہہ......! آئے گا بھی کس منہ سے۔''

اسے گئے سات برس ہونے کو آئے تھے۔ اس کے ساتھ برس اس کے سات قرن خواہ مخواہ اپنا آپ ملیامیٹ کرتی رہی۔ یہ ہوتی ہے مرد کی محبت، یہ ہوتا ہے اس کا عشق۔'

اندیشے تو میرے مرد کے متعلق روز اول سے ٹھیک تھے حقیت سے فرار تو میں نے خود چاہا تھا۔

''ہرجائی ایکٹر کہیں کا، گھر آ کر وہ رات بھر کس قدر روئی تھی۔ بے حد و حساب اس کا شادی سے انکار جاری رہا گھر والوں نے سزا کے طور پر اس سے بات چیت تک بند کر دی۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا، برہمی کی ہر بوند گری اور پھسل گئی اور اب آسیہ نادیہ، سعدیہ مامون نازو، سرفراز سب شادی شدہ تھے اپنی اپنی دنیا میں گم، جگنو بیس برس کا خوبصورت جوان تھا، اس سے چھوٹی لبنیٰ اور عظمیٰ بھی جوانی کی جانب قدم بڑھا رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کا گداز ختم ہو چلا تھا۔ چہرہ وقت کی سرد مہری کا آئینہ بن گیا تھا۔''

سوچوں کا انداز بدل گیا تھا۔

چال میں بلا کا اعتماد آ گیا تھا۔

آخر کو وہ سرخرو تھی...... سترہ برس گزرنے پر بھی...... اس نے کوئی دعویٰ نہ کیا تھا...... مگر کیسی استقامت دکھائی اور جو جھولیاں بھر بھر جھوٹی محبتوں کے اعتراف کرتا تھا کیسا کر گیا تھا...... اپنے ہی بولوں کے آگے شرمندہ تھا...... ہار گیا تھا...... تھک گیا تھا...... ٹوٹ گیا تھا...... وہ اپنے تدریسی پیشے میں گم تھی...... یہ سوچ کر...... کبھی تو آؤ گے......

میں تو کچھ بھی بولوں گی...... مگر مجھے دیکھ کر خود اپنی نظروں میں اس قدر کرو گے کہ منہ چھپانے کو ٹھکانہ نہ مل سکے گا...... نہ ہی مرنے کو جگہ۔

میں نے اپنی عمر کا قیمتی حصہ گنوایا ہے۔

جیسے کندن کو کوئلوں کی دلالی میں دفن کیا ہو۔

ایک عورت جو اپنے شوہر کی محبتوں میں وقت گزارتی ہے۔ اس کی چاہتوں گرم جوشیوں سے آسودہ ہوتی ہے...... اپنے دکھ تکلیف بتاتی ہے...... وہ بھی بڑھاپے کو دہلیز پر کھڑا دیکھ کر کبھی کبھی افسردگی سے سوچتی ضرور ہے۔ کہ کبھی وہ کیا تھی اس وقت کے لطف کیا تھے اور ایک میں...... ازل سے آج تک تہی دامن......''

تنہائی کے بھڑکتے الاؤ میں جلی

کسی کے انتظار میں قطرہ قطرہ شمع کی طرح پگھلی۔

کیا میرے سینے میں جذبات نہ تھے......؟

تم نے مجھے برباد کیا ہے...... مجھے پامال کیا ہے۔

مجھے ضائع کیا ہے...... مجھے قتل کیا ہے۔

تم نے مجھے کیوں احساس دلایا کہ تمہاری شدتیں حقیقی ہیں، جب کہ ایسا نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے...... میری غلطی...... میری خطا سہی کہ میں اپنے منہ سے کچھ کیوں نہ پھوٹی...... مگر اے محبتوں کے پیامبر...... اے شدتوں کے دعویدار...... سچے لوگ تو پرامید ہوتے ہیں۔ ایک بار تو آ کر جھانک لیتے...... مگر تم سچے کب تھے؟ اگر تم غصہ کی اداکاری نہ کرتے تو بجیلہ تم پر کیوں اپنا آپ مٹاتی۔''

کس قدر وقت گزر گیا تھا۔ اس نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کو دیکھا برش مارنے سے چیخ گیا تھا...... اس نے پشیمان سی نظریں آئینے پر دوڑائیں...... جیسے عموماً لوگ غصے کا بھوت اترنے پر پشیمان ہوتے ہیں...... پھر کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں گھس گئی...... شاور کے نیچے بھیگتے ہوئے اس نے سوچا...... ''اے پائے کے اداکار اب مجھ سے اداکاری نہ کرنا میں دیکھوں گی بیوی کے ساتھ کیسے ہو، پھر میں تمہاری ڈپلومیسی کو

واقعی سراہوں گی۔ دوعورتوں کو اپنی محبتوں کا یقین دلانے والے ایکٹر...... آج تم اپنی زندگی کا شاہکار ڈرامہ کھیلنا فراز بھی مامون وغیرہ کے ساتھ ائیر پورٹ گیا ہوا تھا وہ باتھ روم سے باہر آئی تو برابر والے گھر کے باہر شور ہو رہا تھا اچھا خاصا...... خوشیوں سے بھرپور قہقہوں کا شور گویا وہ آ گیا تھا...... اس کے پراعتماد قدم کانپ گئے۔

وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی...... سب لوگ شاید اندر جا چکے تھے۔

''مم...... میں...... نہیں جاؤں گی...... میں کیوں جاؤں کیا رشتہ داری ہے؟ اب تو یہیں رہے گا...... کبھی بھی مل لیں گے۔ ملتے رہیں گے...... آخر سترہ برس بھی تو گزارے ہیں، سترہ برس کم نہیں ہوتے۔ لمحہ تو وہی صدیوں پر بھاری گزرتا ہے جو ملن کی تڑپ میں گزرتا ہے...... نایاب...... نارسا...... لمحہ......!''

☆☆☆

اسے آئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ نادیہ نے تو شادی کے بعد ہی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اب تو وہ تنہا ہی تھی۔ دو دن سے کالج بھی نہیں گئی تھی۔

رات کے نو بج رہے تھے جب فراز کی دلہن ہما نے کمرے میں قدم رکھا۔

''ہارون بھائی آئے ہیں آپ کو یاد کر رہے ہیں۔''

''وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی، اپنی خوداعتمادی کھو بیٹھی۔''

''فراز نہیں ہے؟''

''وہ وہیں ہیں...... ہارون بھائی تو کافی دیر سے آئے ہوئے ہیں امی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔'' (امی آنکھ کے آپریشن سے فارغ ہو کر آج ہی گھر آئی تھیں)

''اچھا تم چلو میں آ رہی ہوں۔''

''وہ میز پر سے سنہری فریم کی عینک اٹھا کر لگاتی ہوئی بولی اور شانوں پر دوپٹہ برابر کرتی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔''

ڈارک براؤن تھری پیس سوٹ میچنگ ٹائی مع دکتی ٹائی پن، چم چم کرتے جوتے کنپٹیوں پر بسیرا کیے ہوئے سفید بال جمیلہ نے دروازے پر اس کا جائزہ لے لیا خاموشی سے اندر کی گرتی پڑتی جمیلہ کو سہارا دیئے وہ اندر چلی آئی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے مخصوص دھیمی آواز میں مہمان کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام......'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''تشریف رکھیے۔'' اس نے پروقار انداز میں ہارون کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

''چند بے ثبات لمحے خاموش گزر گئے۔''

''کیا حال ہے آپ کا...... کیا کر رہی ہیں؟''

''حال تو پرامن ہے، مقامی کالج میں کیمسٹری پڑھاتی ہوں۔'' وہ خوش حلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''اور آپ......؟'' وہ آپ اپنی بیگم بچوں کو نہیں لائے؟''

''اپیا...... ہارون بھائی نے شادی نہیں کی انہوں نے شادی سے بچنے کے لیے تو یہ جھوٹ بولا تھا ائیر پورٹ پر سب نے سب سے پہلے یہی سوال کیا تھا......'' فراز ہنسا تو اس ہنسی میں ہارون کی مسکراہٹ بھی شامل ہو گئی۔

''شادی نہیں کی...... وہ...... گم صم سی رہ گئی۔''

''ہارون بھائی...... جو اپیا ہیں ناں یہ بھی آپ کی طرح تجرد کی زندگی گزار رہی ہیں اب چونکنے کی باری ہارون کی تھی۔''

وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی تھی۔

''اچھا، آپ بتائیں آپ نے جھوٹ کیوں بولا تھا کیوں بولا تھا؟'' فراز نے سوال کیا۔

گھر سے ہر ہفتے کوئی تصویر پہنچ جاتی تھی۔ امی کی ایک رٹ تھی کہ لڑکی پسند کرو لو بس یہ سلسلہ روکنے کے لیے جھوٹ بولنا پڑا۔

’’آپ نے یہ سلسلہ روکا کیوں؟‘‘ فراز نے خوش دلی سے استفسار کیا۔

’’اس لیے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔‘‘

’’وہ آخر کیوں......؟‘‘

’’ہارون کی نظر اس کی سمت اٹھی...... ماضی کی دلفریب عمارت کا کھنڈر ابھی غیر واضح نہ ہوا تھا۔‘‘

’’چھوڑو یار...... ان باتوں کو...... اپنی سناؤ کیسی گزر رہی ہے...... انہوں نے بات کا رخ موڑ دیا...... اور اس نے رکا ہوا سانس خارج کر دیا۔‘‘

’’بالکل خوش و خرم...... خدا کا شکر ہے۔‘‘ فراز نے اظہار تشکر کیا۔

’’میں ابھی آئی چائے کے لیے کہہ آؤں‘‘

’’اپیا! آپ بیٹھیں میں ہما سے کہہ دیتا ہوں۔‘‘ وہ احتراماً بولا۔

’’آپ فراز کی دلہن سے ملے؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘

’’پسند آئیں۔‘‘

’’بہت۔‘‘

’’چند نوحہ کناں لمحے اور سرکے۔‘‘

’’بجیلہ! آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟‘‘

’’ایسے ہی۔‘‘

’’ایسے ہی تو کوئی جواز نہیں...... مگر میں ایک نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ آپ کو دراصل مردوں سے الرجی ہے۔‘‘

’’ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... اچھا یہ بتایئے آپ نے کیوں نہیں کی؟‘‘

لمحوں کی خاموشی...... صحرا کے سناٹوں پر بھاری ایک نہایت شکست خوردہ آواز ابھری۔

’’بجیلہ...... عباس...... میں نہیں جانتا کہ ہماری عمریں پرانی باتوں کو دہرانے کی اجازت دیتی ہیں یا نہیں اب تو وقت نے بھی مجھے معتبر کر دیا ہے...... آج آپ نے ہمیشہ سے زیادہ مجھے دکھ دیا ہے۔ میں اس وقت صرف آپ کی خاطر یہاں حاضر ہوا تھا مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے شادی نہیں کی...... مجھے تھوڑی خوش فہمی ہوئی مگر آپ کا موجودہ رویہ...... ہمیشہ کی طرح تکلیف دہ ہے۔ آپ کی سنگدلی آج بھی عروج پر ہے۔‘‘

آج انداز میں شوخی لہجے میں کھنک نہیں تھی مگر باتیں وہی تھیں ایسا لگا کہ وہ کہیں بھی نہیں گیا تھا۔ وہ اس کی باتیں اور اسے نظر انداز کرتے ماموں کے گھر گھس گئی تھی جب واپس ہوئی تو وہ وہیں کھڑا تھا۔ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ۔

’’آپ نے کیوں عمر ضائع کی......؟‘‘ اتنی دیر میں وہ اپنی ناتواں انا کو سہارا دے کر کھڑا کر چکی تھی۔ پھر ایک پتھریلی سی بات کہہ دی۔ جو سیدھی اس محروم شخص کے کلیجے میں لگی۔

’’جو لمحہ...... کسی یاد میں گزر جائے ضائع نہیں ہوتا......‘‘ وہ تو اس کے سامنے ہمیشہ سے کھلی کتاب رہا تھا۔ آج بھی اس کے صفحے جلی حروف سے معمور تھے۔ وہ تو ہمیشہ سے اس کے سامنے کھلا ہوا تھا جب ہی دل کی باتیں بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔

’’عمر تو آپ نے ضائع کی ہے...... بجیلہ عباس...... بے سبب بلاوجہ۔‘‘

’’عمر تو میں نے بھی...... دراصل مجھے احساس نہیں کہ میں نے عمر ضائع کی ہے۔‘‘

میں ایسی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ میں بہت خوش ہوں۔‘‘ پھر جھوٹ سفید جھوٹ...... اس کا من دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

’’یہ بڑی تاثر کن و ناقابل یقین بات ہے کہ بلاوجہ...... بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے...... ویسے......‘‘

’’معاف کیجیے کون تھا وہ خوش نصیب؟ جس کی وجہ سے میری ذات آپ کی

نگاہ میں بے وقعت رہی۔ اور جس نے آپ کو اتنی جراتوں سے نوازا۔"

"کیسی چوٹ......؟ کیسا تاکا ہوا نشانہ......شک کی گالی یہ رسوائی بھی میرے مقدر میں باقی رہ گئی تھی...... یہ وہ مقام ہوتا ہے جب مرد اپنی تمام خوبیوں سمیت برا لگتا ہے......شک کی گالی دیتے ہوئے۔"

"میرے مہربان...... وہ خوش نصیب میرا مقدر ہے، میری مغرور انا ہے۔ جس نے پہلے تمہیں دھتکار دیا تھا اور دوبارہ جھکنے کا ظرف اس کے پاس نہیں تھا۔ میرے خوش نصیب مقدر کی وجہ سے ہی میں تہی دست ہوں کہ قسمت سے میری بہن نے روایتوں وقدروں کا ایک مدفن بنایا تھا۔ جب تم نے مجھے بلایا اس وقت اس مدفن کی مٹی گیلی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ گزرگاہ یہی ہے کہیں اس مدفن پر میرے قدموں کے گہرے نشان نہ بن جائیں۔"

میری زندگی میری روح...... واپس لو اپنی یہ گالی...... میں تو آج بھی بڑی معزز ہوں...... یہ تم نے کیا کہہ دیا جیسے بھرے بازار میں آنچل کھینچ لیا ہو۔

تم اب بھی نہیں سمجھے......تم کبھی بھی نہیں سمجھے......تم آج بھی نہیں سمجھے...... دراصل" وہ کھنکار کر بولی۔

"میرا دل بہت کمزور رہا ہے بچپن سے ڈاکٹروں کے مطابق میں ازدواجی ذمہ داریاں اٹھانے کی اہل نہیں۔"

"دل کی بیماری کے تو سینکڑوں علاج ہیں ویسے کبھی اس قسم کا تذکرہ نہیں ہوا" وہ حیران سے تھے۔

"اپنی اولاد کے عیب تو سب چھپاتے ہیں، خاص طور پر بیٹیوں کے۔"

"خیر علاج تو اب بھی ہوسکتا ہے اب آپ لاپرواہی نہ کریں۔" (اگر آج تم میرے ہمراہ ہوتیں تو؟)

"ہاں ہارون اب جبکہ اس وقت بھی میں تمہارے سامنے بڑے عزت دار

ناک والی بنی بیٹھی ہوں...... اور اب کچھ فائدہ بھی نہیں کچھ کہنے کا...... سو خموشی بہتر ہے...... یہ جھوٹ......من گھڑت بیماریاں بہتر ہیں۔ اگر تم سترہ برسوں میں ایک مرتبہ بھی آواز دے لیتے تو ہم یہاں نہ ہوتے جاؤ...... ہارون میرا کشٹ ضائع نہ کرو...... اب چادر کو داغ نہ لگاؤ...... یہ ہونٹ جو سرگوشیوں کے عادی بھی نہیں انہیں کیسے بگل بنا دوں...... کچھ تو میرے پاس رہے......سکھ کی دولت نہ سہی...... وقار کی دولت ہی سہی......انا کی کمزور لاٹھی ہی سہی۔"

جاؤ ہارون......اپنی دنیا میں گم ہو جاؤ......نامرادی کا احساس کہیں میرا دشمن نہ بن جائے......کل کی پایاب چیزیں آج بالکل نایاب ہیں۔

ایک جی دار مرد جو دیر سے پردے کے پیچھے کھڑا تھا بہن کے المیے پر کڑھ کر رہ گیا تھا۔ جو ایک مرد نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ دوسرا مرد سمجھ گیا تھا۔

☆☆☆

دامن دل کو بچائیں

اس وقت میں پوسٹ مین تھا جب میں نے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا تھا۔

میری یادداشت میں آج بھی وہ سیاہ گیٹ محفوظ ہے جس کے سامنے جب میں اپنی سائیکل روک کی گھنٹی بجاتا تو وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ اور اس کی جلد بازی کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ بعض اوقات وہ دوپٹے کی جگہ کوئی تولیہ یا غلاف وغیرہ قسم کی کوئی چیز شانے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ ایک مخصوص ایروگرام جو دوسری ڈاک کے علاوہ ہوتا تھا۔ شاید کسی یورپی ملک کا ہوتا تھا۔ نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔ بہر حال کبھی یہ ایروگرام رجسٹر ہوتا تھا۔ کبھی عام ڈاک سے۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح دوڑ کر آتی اس نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا تھا...... ایروگرام اور دوسری ڈاک لے کر وہ ایروگرام کو بے صبری سے چیرتی پھاڑتی واپس ہو جاتی۔ وہ اس قدر دل کش و سادہ تھی کہ میں، جس کا واسطہ تقریباً ہر روز ڈاک کی منتظر حسینہ سے پڑ جاتا۔ اسے دیکھتا رہ جاتا۔ دیکھنے کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ خود اس پری پیکر کی اداؤں پر منحصر تھا۔ اگر وہ ایروگرام لے کر بالکل ہی بے خبر ہو جاتی تو میں پوری آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہوا سائیکل آگے بڑھا دیتا تھا۔ اور اگر کبھی وہ حاضر دماغی

سے ڈاک وصول کرتی تو چور نگاہوں سے تکنے ہی پر اکتفا کرلیا کرتے تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا پروقار مغرور سا انداز و بے نیازی جو کسی کمتر کے لیے کسی برتر کا عطیہ ہوتی ہے اور اس کے عالی شان گھر کی امارت مجھے دوبارہ اپنے جامے میں ڈال دیتی تھی۔

کبھی اس سیاہ گیٹ والے گھر کی ڈاک نہ ہوتی تھی تب میں شرارت سے رک کر گھنٹی بجا دیا کرتا تھا۔ اور اسے دوڑتا دیکھ کر بظاہر بے نیاز بنا سائیکل چلاتا گزر جاتا۔

اور پھر وہ لڑکی مجھے اچھی طرح زبانی یاد ہو گئی۔ میں نے اپنی اس ملازمت کے دوران بڑے بڑے ڈاک کے منتظر بے صبرے دیکھتے تھے۔ مگر وہ ایک ہی یکتا دلا ثانی نکلی۔

ایک روز وہ کالج یونیفارم میں ملبوس کتابیں اٹھائے شاید کالج سے واپس آ رہی تھی میں اس کے گھر سے کافی دور ایک گھر کے سامنے کھڑا پارسل کے سلسلے میں دستخط لے رہا تھا کہ وہ چلی آئی۔

(میں اس کی کھنک دار آواز کو کیسے بھلا دوں)

''سنو پوسٹ مین، حماد منزل کی ڈاک ہے؟''۔

گویا اس بے صبری کے لیے پانچ منٹ بھی زیادہ تھے۔ وہ یہیں سے ڈاک لے جانا چاہتی تھی۔ مگر افسوس! اس روز حماد کی ڈاک نہ تھی۔ ایک تو وہ لڑکی اس قدر لا پرواہ اور پر اعتماد تھی کہ اسے اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی اس کی حرکتوں سے خط اٹھا رہا ہے یا مسکرایا ہے۔

''نہیں'' میں نے افسوس سے سر ہلا دیا۔

اپنی مترنم آواز سے وہ بہت زیادہ مہذب و پڑھی لکھی لگتی تھی۔ خاص طور پر اس کا ''سنو پوسٹ مین'' کہنا مغرورانہ انداز کے باوجود بہت پیارا اور منفرد لگتا ہے۔

اور پھر میری ڈیوٹی دوسرے ایریا میں لگ گئی۔ میری جگہ اس ایریا کے لیے دوسرا پوسٹ مین آ گیا مگر مجھے وہ اپنے نام کے ساتھ یاد رہی، جانے کیوں۔ حالانکہ اس

کی بے تابی، بے صبری اور انتظار نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ایروگرام اسی کے نام پر ہوتا تھا۔ باقی ڈاک زیادہ تر حماد احمد بیرسٹر کے نام ہوتی تھی۔ ایروگرام پر اس کا نام بڑے خوبصورت انداز میں لکھا ہوتا لکھنے والے یا والی کی انگریزی کی لکھائی حد درجہ خوب صورت تھی۔ اس پروگرام کی وصولی رسید پر اس کے ہی دستخط ہوتے تھے۔ بہر حال وہ کافی عرصہ یاد رہی اپنی ''سنو پوسٹ مین'' کی بازگشت کے ہمراہ۔

پوسٹ آفس کی ملازمت سے گزارہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہو رہا تھا۔ تب اپنے ایک جگری یار کے کہنے پر ڈرائیونگ سیکھ لی اور لائسنس ملتے ہی باقاعدہ ڈرائیونگ شروع کر دی۔ پہلے پہل تو پرائیوٹ بس سروے سے ملازمت شروع کی ''کنٹریک کیریز'' میری بس کی پیشانی پر سجا ہوتا اور میں ایک مقامی کالج کے ماتھے پر میرا مطلب ہے گیٹ پر۔

ایک روز بس کے مالک کو کالج کی پرنسپل نے بلا بھیجا۔ معلوم ہوا کہ سائنس گروپ کی طالبات کے لیے کوئی پوائنٹ نہیں۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر کے لیے بھی پوائنٹ ہونا چاہیے کہ بعض مخصوص علاقوں کی طالبات کو شام ہو جانے کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے۔ بعض اوقات امتحانات کے نزدیک دنوں میں طالبات کافی دیر تک پریکٹیکل کرتی ہیں۔

قصہ مختصر! میری ڈیوٹی ساڑھے تین بجے والی پوائنٹ پر لگا دی گئی۔ میں یہ سن کر سخت بور ہوا تھا۔ دوپہر کو ہم سارے پوائنٹس کے ڈرائیور گپ شپ لگا کر وقت پس کر لیتے تھے ایک تو لڑکیاں ایک ساتھ بھی تو اکٹھی باہر نہیں آتی تھیں۔ چہلیں کرتی۔ آرام سے چلتی کوٹ چادریں اتارتی۔ پہنتی باہر آتیں کہ اتنی دیر میں آدمی ایک نیند لے لے۔

میں ڈیوٹی کے پہلے روز تین بج کر بیس منٹ پر ہی کالج پہنچ گیا۔ کافی دیر سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر چند طالبات کو گیٹ کی سمت دیکھا۔ بس کو دیکھ کر ان میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ تھوڑا سا شور ہوا۔ شاید یہ ان کے لیے خلاف توقع بات تھی۔

آنے والی لڑکیاں خالی بس دیکھ کر کھڑکیوں کے ساتھ والی سیٹوں کی طرف دوڑیں کچھ وفاداروں نے اپنے برابر کی سیٹوں پر کتابیں رکھ کر ریزرو کیں اور لگیں پٹر پٹر باتیں کرنے۔ پوسٹ مین ہوئے، ڈرائیور ہوئے۔ ان کے سامنے کوئی راز داری نہیں برتی جاتی۔ انہیں مشینی آدمی سمجھ کر لوگ اپنی باتیں کیے جاتی ہیں۔ جیسے سامنے بیٹھا ہوا شخص آنکھ کان سے پٹ ہو اور یہ خاص طور پر کالج اسکول کی لڑکیاں تو ایک دوسری کے عشق میں بری طرح کھو جاتی ہیں۔ ذرا دیر جو زبان کو بریک لگا لیں۔ اپنے اسٹاپ پر اترتے اترتے خدا حافظ کہتے کہتے بھی جانے کتنے قصے کوتاہ کر کے سنا جاتی ہیں۔ واقعی انسان کا ہر نیا اٹھتا قدم ایک نئے تجربے کا نیا زینہ ہوتا ہے۔

بس کافی بھر چکی تھی۔ میں نے کالج پر نگاہ ڈالی۔ تب میں بری طرح چونک اٹھا۔ ایک ساتھی لڑکی کو کتابیں تھما کر وہ اپنا ہیٹی کوٹ اتار رہی تھی۔ ساتھ ہی اڑتے دوپٹے سے ''پردہ داری'' بھی کر رہی تھی۔ ایک تو دوپٹہ سنبھالتی عورتیں مجھے ہمیشہ پردہ داری کم اور پردہ کشائی زیادہ کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ بہر حال اس کے دوپٹے سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔ وہ بس میں چڑھی سیٹ دیکھنے کے دوران اس کی نظر مجھ پر بھی پڑی۔ مگر وہاں کوئی شناسائی کی لہر نہ تھی اس کا کھویا کھویا انداز جھکی جھکی آنکھیں دیکھ کر مجھے اس ان دیکھے شخص سے حسد محسوس ہوا جس نے اس کو ان حالت کو پہنچا دیا تھا۔ بس اپنے ہی قابل رکھ کر چھوڑا تھا سسرے نے...... کہ ادھر ادھر دیکھتی ہی نہیں۔ میں نے جھلا کر سگریٹ کا ٹوٹا باہر پھینک کر بس چلا دی۔

اس روز وہ ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے میرے بائیں ہاتھ پر اپنی اکلوتی ساتھی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بعد میں دو اور لڑکیاں بھی ان کے برابر میں بیٹھ گئی تھیں۔ بس کافی خالی تھی کافی دیر انتظار کرنا تھا۔ مجھے ایک دم شرارت سوجھی۔ پرائیوٹ بس تھی ڈیک وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ کم آباد علاقوں سے جب گزرتا تو کیسٹ لگا لیا کرتا تھا جب سے سختی شروع ہوئی تھی۔ کیسٹیں وغیرہ کم ہی بج رہی تھیں۔ میں نے اس کی ایک نگاہ کی

خاطر شرارت کر ڈالی۔

اے نرگس مستانہ بس اتنی شکایت ہے
سمجھا ہمیں بیگانہ بس اتنی شکایت ہے

تب اچانک شور پر کتر کتر کرتی زبانوں پر بریک لگ گئے۔ نظریں میری طرف اٹھیں ان میں وہ نظریں بھی شامل تھیں جن کی پردہ کشائی کی چاہ تھی۔ رفیع کی شرارت بھری آواز اور میری مسکراتی نظریں جو ہر لحظہ اسی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اسے بوکھلانے کے لیے کافی تھیں۔

ہر راہ پہ کترائے ہر موڑ پہ گھبرائے
منہ پھیر لیا تم نے ہم جب بھی نظر آئے
ہم کو نہیں پہچانا بس اتنی شکایت ہے

تب اس کی غیر ارادی اور الجھی ہوئی نظریں دوبارہ اٹھیں۔ یہاں وہی مستقل مزاجی بھی تھی۔ یعنی میں برابر اچٹتی نظر اس پر ڈال رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ بنتی ہے۔ وہ ورنہ نہ وہ مجھے پہچانتی ہے۔ تب حسن میری اس گستاخی پر برہم ہو گیا تھا۔ یقیناً اس نے اور دیگر طالبات نے مجھے بازاری قسم کا عاشق مزاج نوجوان سمجھا۔ اس جرائت میں میری ازلی خود اعتمادی بھی برابر کی مجرم تھی۔ مجھے اپنی اٹھان وصورت کے متعلق کافی خوش فہمی تھی۔ ویسے درحقیقت میں اپنے بشرے سے معقول آدمی ہی نظر آتا تھا۔ سرخ وسفید رنگت پر گھنی مونچھیں جنہیں میں تقریباً روز سنوارتا تھا۔ اس وقت بھی اپنے کسرتی بدن پر سیاہ کرتا شلوار سجائے کہنیوں تک آستین چڑھائے محنتی ومضبوط بازو اسٹیئرنگ پر جمائے حسینوں کے جھرمٹ میں بڑی بہادری سے بیٹھا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خود پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد مجھے خوش فہمی حقیقت سے قریب لگی۔

غربت وحالات نے آج مجھے یہاں پہنچا دیا تھا شاید میں اپنے سنجیدہ وحساس ذہن کے ساتھ یہاں نہ ہوتا کسی تعلیمی ادارے کا سنجیدہ محنتی طالب علم ہوتا۔ قدرت نے

مجھے باپ کے مرنے کے بعد ہی گھر کا مقتدر اعلیٰ بنا دیا تھا۔ میری سوچیں بھٹک گئیں۔ میں نے اپنی موجودہ حیثیت کو یاد کر کے ایک آہ سرد کھینچی اور کچھ دیر پہلے کی باتیں بھلا کر ونڈ اسکرین پر نظریں جما دیں۔

اس روز وہ بس میں چڑھی تو بس کافی بھر چکی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے پھنس کر کھڑی ہو گئی تب میں نے اس کے جرنلز...... اور فائل کی سمت ہاتھ بڑھا کر کہا ''لائیے میں انہیں ادھر رکھ دیتا ہوں''۔

لیکن اس کے ساتھ مجھے دوسری کھڑی ہوئی لڑکیوں کی کتابیں بھی لینا پڑیں۔ ورنہ یہ انفرادیت شاید اسے مہنگی پڑتی۔ دراصل میرا انداز بھی تو اس سے اپنائیت کا جان پہچان والوں کا ہو جاتا تھا۔ فائل پر چٹ چپکی ہوئی تھی جس پر اس کا نام اور کلاس کا نام لکھا تھا وہی نام جو ایروگرام پر ہوتا تھا۔

اور پھر میں نے آئینے میں ایک اچٹتی نظر ڈالی تھی جس میں اس کے سرخ سرخ رُخساروں والا چہرہ بہت بے نیاز و سادہ تھا۔ میں نے بس چلا دی تھی اس اس کی قربت مجھے پاگل کئے دے رہی تھی۔ کتنا فاصلہ تھا ہم دونوں میں، ایک ڈرائیونگ سیٹ کی پشت نا۔

دو مرتبہ لڑکیوں نے کسی چوک پر واویلا مچا دیا تھا ایک موڑ پر زبردست جھٹکے سے وہ آگے جھک آئی۔ (اور بھی جھکی ہوں گی مگر مجھے تو اس کا دھیان تھا) اس کا دایاں ہاتھ دھپ سے میرے کندھے پر پڑا۔ ساتھ ہی اس نے جھلا کر کہا تھا۔

''کیا مصیبت ہے''

میں نے آئینے میں دیکھا۔ وہ دوپٹہ کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ چہرہ غصے سے تپ گیا تھا۔ پیچھے سے لڑکیاں چیخی تھیں۔

''اے بھائی'' اے بھیا ڈرائیور کم از کم ایک ڈگری کا گنہگار تو ہونے دو۔ تاکہ جانے والا منہ ہو جائے اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ سکیں کچھ تو کر آئے''۔

ساری لڑکیاں اس شوخ جملے پر جو نہ جانے کس طرف سے آیا تھا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں مگر اس کے تیور سیدھے نہ ہوئے تھے۔ بلا شبہ وہ کھردری اور مغرور لڑکی تھی۔ یا شاید اسے یہ احساس ہو گا کہ میں اسے آئینے میں دیکھ رہا ہوں گا۔

ایک روز شاید کوئی تقریب تھی۔ کالج میں لڑکیوں نے کہہ دیا تھا کہ کل پانچ بجے بس لے آنا۔ یہ پوائنٹ ہی دراصل اس گروپ کے لئے مخصوص تھا۔ مگر دوسری جماعتوں کی لڑکیاں بھی پوائنٹ مس ہونے کی وجہ سے اس میں بیٹھ جاتی تھیں۔ اس دن بس کا بہت برا حال ہوتا تھا۔ تب میں نے کہا تھا کہ یہ تو مالک پر منحصر ہے اگر اس نے ٹائم تبدیل کرنے کی اجازت دے دی تو لے آؤں گا۔ اور یہ اتفاق تھا کہ بس کہیں بک نہیں تھی۔ میں بس لے کر پونے پانچ بجے کالج پہنچ گیا تھا۔ پورے کالج میں رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ کالج بھی سجا ہوا تھا خدا معلوم کیا ہنگامہ تھا۔

پانچ کے ساڑھے پانچ پھر پونے چھ وہ گئے، مگر اب میں انتظار کرتے ہوئے گھبراتا نہ تھا تب میں نے دیکھا وہ کلیجی سے رنگ کے شلوار قمیض میں چھوٹا سا پرس سینے سے لگائے لڑکیوں سے باتیں کرتی باہر آ رہی تھی۔ شہزادیوں کی آن بان ہے۔

مرعوب ہو کر میں نے دونوں بازو اسٹیئرنگ پر جما کر سر جھکا دیا۔

کافی دیر گزر گئی۔ آج کالج کے باہر موٹر کاروں کا بھی ایک طویل سلسلہ تھا بہت ساری لڑکیاں اور ان کی استانیاں اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ رہی تھیں۔ ان میں ایک نیلی موٹر کار میں وہ بھی بیٹھ چکی تھی۔ اس نے بھی شاید آج گھر سے گاڑی منگوائی تھی۔ اور مجھے اس کے سوا کچھ یاد نہیں کہ میں نے ایک شدید جھٹکے سے بس اسٹارٹ کی تھی۔ گاڑی کا گیئر بدل کر گاڑی کو پانی کی روانی سے سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔

اور پھر مجھ پر قیامتیں گزر گئیں۔ بس کا ایک شدید حادثہ تھا۔ میں ایک صنعتی علاقے میں دوا ساز کمپنی کے ملازمین میں پہنچا کر بس واپس لا رہا تھا۔ کہ بھوسے سے بھرے ہوئے ایک ٹرک سے ایک موڑ پر میری بس ٹکرا گئی تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ مجھے

ایسا محسوس ہوا تھا کہ ٹرک میرے سینے پر چڑھ دوڑا ہے اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد میں ہوش میں آیا تھا میرا پورا بدن پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہزار شکر کہ میرے تمام اعضا سلامت تھے۔ مگر دائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ ہڈی جڑ جائے گی۔ میں نے اپنے ربّ کا شکر ادا کیا مجھے اپنے زندہ بچ جانے پر حیرانی تھی۔

مہینوں بعد جسم پٹیوں سے آزاد ہوا۔ مگر دایاں ہاتھ پہلے کی طرح طاقت ور نہ تھا کافی محنت لیتا تھا کام میں۔ میں ڈرائیونگ نہ کر سکتا تھا بس کی نوکری بھی ختم ہو گئی۔ گھر میں فاقے ہونے لگے تب میں بھیک کے سوا ہر کام کرنے پر تیار ہو گیا۔

آخر کار دنوں کی مار ماری کے بعد پھر قدرت نے رزق کا اہتمام کر دیا۔ میں ایک ہاسپٹل میں وارڈ بوائے کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ تنخواہ اچھی نہ سہی غنیمت تھی دو بھائیوں اور ماں کے ساتھ گزارہ ہو رہا تھا۔ بھائی پڑھ رہے تھے۔ ناکاموں کو کامیابی کے لفظ سے عشق ہوتا ہے مجھے بھی تھا اور ہے اور میرے بھائی میرے وجود کا حصہ ہیں۔ ان کی خواہشات کی تکمیل کوئی احسان نہیں تھا۔

بڑے ڈاکٹر صاحب نے کافی دیر ہوئی بلایا تھا وہ بھی معمولی کی چہل قدم کے بعد اپنے روم میں جا چکی تھی۔ اسے ہاسپٹل میں پانچواں دن تھا۔ چار روز قبل میں اسپتال کے اسی طویل برآمدے سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے اسٹریچر آتے دیکھ کر ایک طرف کو ہو گیا معلوم ہوا کہ مریض نہیں مریضہ ہے اور ابارشن کا سانحہ ہے۔ روز ہی ایسے معمولات ہوتے تھے۔ یہاں تو میں تو عادی ہو چکا تھا۔ لاپروائی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر کل جب اسے ٹہلتے دیکھا تھا تو بری طرح چانک گیا تھا۔ چاند گہنا گیا تھا وہ بالکل وہی تھی میں اسے ہزاروں میں آسانی سے پہنچان سکتا تھا۔

ابھی زندگی میں حادثات کی آمد و رفت تھی۔ یہ تھمتے تو شاید سہرا بھی سج جاتا۔ تنہائیوں میں کبھی کوئی دھیان میں پڑتا تھا تو مگر یہ وہ تو ہرگز نہ تھی۔ حسین، بے نیاز،

مغرور، روکھی، آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتی نحیف ونزار کمزوری اور زردسی۔

تب میں ضبط نہ کرسکا تھا۔ تیز تیز چلتا ہوا اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے ایک لحہ کو سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور پھر ٹہلنے لگی تھی۔ جب میں رک کر مسلسل اسے دیکھتا رہا۔ تب وہ میری اس ناگوار حرکت پر رک کر سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی تھی۔ وہی پر اعتماد، مغرور نگاہیں جو امیروں کا خاصہ ہوتی ہیں۔

''آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟'' اس نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں بوکھلا گیا تھا۔ اب تو کچھ پھوٹنا ہی تھا۔

''وہ......وہ جی آپ مس فوزیہ حماد ہیں جی۔ وہ دراصل'' تب اس نے چونک کر میرے سراپے کا جائزہ لیا۔

''مس نہیں ہوں شادی شدہ ہوں۔ مسز فوزیہ شہرنواز۔ یہ نام جو تم ابھی لے رہے تھے یہ شادی سے پہلے میرا نام تھا اب نہیں تم مجھے کس طرح جانتے ہو۔ میں تمہیں نہیں جانتی تھی۔''

اس نے دھیمے دھیمے لہجے میں بولنے کے دوران واکنگ جاری رکھی۔ وہی مغرور اور کھردرا سا لہجہ گویا بل ابھی باقی تھے۔ نہ جانے کیوں میں اس قدر دکھی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتی۔ پورے چھ ماہ اس کے خط پہنچائے تھے۔ پورے دس ماہ بس چلائی تھی گو کہ ان باتوں کو تین سال بیت چکے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ میں یہ سن کر کیوں دکھی ہوا کہ وہ مجھے نہیں پہچانتی کہ ہمیں وہی یاد رہتے ہیں جنہیں ہم یاد رکھنا چاہیں یا چاہتے ہیں ورنہ ہم ملتے کس کس سے نہیں۔

اور جو نام اس نے اپنے نام کے ساتھ لگایا یعنی شہرنواز یہ اسی ایروگرام کے ''سینڈر اڈریس'' کے نیچے لکھا ہوتا تھا جس کا انتظار یہ سنگ دل جادوگرنی دیوانوں کی طرح کرتی تھی یہ نام آج بھی میرے حافظے میں موجود تھا۔ اس نام کے علاوہ میں نے آج تک کسی سے حسد نہیں کیا تھا۔ مگر میں درست ہی سمجھا تھا۔

''بھئی تم نے جواب نہیں دیا کہ آخر تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کوئی شناسائی کی لہر کوئی پہچان کی کرن کچھ بھی تو نہ تھا۔ میں کیا بولتا وہ اب بھی بڑی تھی۔ اونچی تھی، برتر تھی ایک امیرزادی تھی۔ اور میں......ایک حقیر سا وارڈ بوائے۔

''وہ جی پہلے میں پوسٹ مین تھا تو آپ کے گھر خط پہنچاتا تھا۔ میرا مطلب ہے آپ کے ایریئے میں تو جی آپ کے نام سے خط ہوتے تھے۔ اور آپ ہی خط لے کر جاتی تھیں۔''

مجھے کچھ تو بولنا ہی تھا سو اتنا کہہ دیا۔ جس پر اس نے سر ہلا کر بے نیازی سے کہا تھا۔

''اوہ! اچھا اچھا، بھئی بڑا تیز حافظہ ہے۔''

ڈرائیونگ والا دور بتانے سے میں نے خود گریز کیا کہ ''پوسٹ مین'' کا ماضی ''ڈرائیور'' کے ماضی سے زیادہ شریف تھا۔

لگتا ہے کوئی کام وام نہیں ہے تمہارے پاس بڑی غیر اہم باتیں یاد رکھتے ہو'' وہ مغرورانہ لہجے میں جھاڑ کر دوبارہ ٹہلنے لگی تھی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید وہ مجھ سے پوچھے گی کہ وہ نوکری کیوں چھوڑی؟ اسپتال میں کیسے آئے؟ مگر اس نے تو اپنی عادت کے عین مطابق، مجھے نظرانداز کر دیا تھا میں کھسیا کر سر کھجاتا ہوا واپس ہولیا تھا۔

آج شام میں اس کے روم کے سامنے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اس کے ساتھ اس کی آواز آئی۔

''شہری! شہری! پلیز میری بات تو سنیں۔''

''سناؤ......''

''ناراض ہو کر جا رہے ہو؟''

''بہت خوش کرنے والی باتیں کرتی ہو۔ آج فرصت ملی تو آ گیا۔ اب میں تمہارا ملازم تو نہیں ہوں کہ ہمہ وقت جی حضوری میں لگا رہوں پیٹ پالنا ہے تمہارے والد صاحب تو دے نہیں دنے گے مجھے بیٹھے بٹھائے تنخواہ۔''

میں یہ کب کہہ رہی ہوں۔ آخر میں آپ کی بیوی ہوں۔ اتنے بڑے دکھ سے گزر رہی ہوں مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ آپ کی ذات کی۔ آواز پر آنسو غالب آ گئے تھے۔

''ان آفتوں میں تم جان بوجھ کر پھنسی ہو۔ اب بھگتو مجھے کچھ وقت کیتھی اور بچوں کو بھی دینا پڑتا ہے۔ آخر وہ میرے بچوں کی ماں ہے'' آواز رک گئی چند لمحوں بعد پھر سنائی دی۔

''تم نے مجھے کیا دیا ہے؟ ذہنی کوفت اور تین سال میں دوا بارشن۔''

''شہری! آپ پر پہلے میرا حق ہے آپ میرا نام ساتھ لے کر امریکہ گئے تھے''

ہچکیاں اور سسکیاں۔

''میں کسی جائیداد یا زمین نہیں جس پر حق جتایا جائے میری ذات پر میرا حق ہے۔ صرف اور اتنا حق بھی تمہیں اس وقت حاصل ہے جب تک میں یہ حق تمہیں دے دوں۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ دار تم خود ہو۔ ٹھیک ہے کہ میں نے کیتھی سے اپنی شادی بزرگوں سے چھپائی مگر تم پر تو یہ سب ظاہر کر دیا تھا اور کہا تھا کہ تم خود انکار کر دو جس پر تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں ہر حال میں قبول ہوں۔ اب مجھ میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں۔''

بے وفائی اور ڈھٹائی کا عجیب نمونہ تھا۔

''شہری! میرے حال پر رحم کرو مجھے تمہاری محبت چاہیے۔ طعنے نہیں دیکھو کیا حال ہو گیا ہے میرا۔''

سسکیاں گھٹنے لگیں۔

''پوچھنے تو میں تمہارا حال ہی آتا ہوں مگر تم اس قدر شور مچانے لگتی ہو کہ میں ذہنی کوفت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ اچھی طرح فرونٹنگ کرو۔ ڈاکٹر بتا رہے تھے کہ دو تین دن لگیں گے۔ ڈسچارج ہونے میں۔''

بولنے والے کا لہجہ یکلخت نرم پڑ گیا۔ چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا بولنے والا باہر آ گیا۔ میں بوکھلا کر سگریٹ سلگانے کے بہانے ہاتھوں کی اوک پر جھک گیا۔

اب اس شک کے بوٹوں کی آواز ہلکی ہو رہی ہے۔ وہ کافی دور بڑھ گیا ہے۔

میں سر اٹھا کر اس شاندار اور خوبصورت آدمی کو دیکھ رہا ہوں۔ جو شاندار سی موٹر میں بیٹھ رہا ہے اپنی ذات کے بٹوارے کے باوجود اس کا اطمینان قابل رشک ہے۔ میرے کانوں میں ایک آواز تھی۔ گھنٹیاں بجا رہی ہے۔

''سنو پوسٹ مین، حماد منزل کی ڈاک ہے آج؟''

☆☆☆

کستوری

نام اس کا کستوری بے سبب نہیں پڑا تھا، اس عرفیت کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اسے غیر معمولی طور پر خوشبوؤں میں گھرے رہنے کا جنون تھا پانچ کے سن تک ہنس کر ڈالی گئی مگر جنون سوا تر ہوتا گیا پھولوں کا استعمال، دیسی عطروں کا استعمال ٹالکم پاؤڈر، یعنی ہر وہ خوشبو جو دسترس میں آسانی سے ہوتی۔

انہیں حرکتوں کی وجہ سے ماں نے اور دادی نے کستوری کا خطاب دیا تھا ایسا طنزیہ خطاب جو مائیں بیٹیوں کو جل کر دے دیا کرتی ہوں۔ جیسے بیگم صاحبہ مہارانی وغیرہ انہوں نے تو خیر ایک دو بار ہی کہا ہوگا، جل کر دوسروں کو ایسا پسند آیا کہ عرفیت ہی بنا چھوڑا۔

جب اسے ''خطاباً'' کہا وہ بہت چھوٹی تھی ہوش سنبھالنے پر بھی اس نے کبھی عجیب وغریب نام کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ''ببن'' اور ''چھکن'' نے کبھی اپنے ماں باپوں سے نہیں پوچھی ہوگی کہ انہیں ببن اور چھکن کیوں کہا جاتا ہے؟''

ایک دن دادی ہی نے بڑے موڈ میں آ کر اسے بتایا تھا کہ کستوری ایک ایسی خوشبو ہوتی ہے جو سونے سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ یہ کستوری ہرن سے حاصل کی جاتی ہے۔

جمال اور جوبن آئینے کی گواہی پر کیا کم اتراتا تھا۔ یہ جان کر تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے کہ نام بھی ایسا قیمتی۔

روایتوں وقدروں کے چیتھڑوں کو پیوند کی طرح زندگی سے چپکائے رہنے والا یہ گھرانہ اس ملک کے 60 ساٹھ خاص گھرانوں میں سے ایک تھا...... لڑکیاں برقعوں کے غلافوں میں لپٹی جاتی تھیں نوعمری کے جذبات وہ خود غلافتی تھیں چوتھا نمبر تھا کستوری کا بہنوں میں سترہ اٹھارہ کے سنوں میں سب اپنے حقیقی انجاموں کو پہنچ گئیں۔ کستوری سدا کی سرکشیدہ سہی تھی تو روایتی حیا دار لڑکی، اسے خوشبوئیں پسند تھیں وہ ہر طرف مرخوشبوئیں بکھیر رکھتی تھی۔ اسے گیت پسند تھے۔ سارا دن دھیمے سروں میں ریڈیو بجایا کرتی۔

وہی جذبوں میں گھر کر کبھی گنگناتی تو ماں یا دادی کی ہنکار سنائی دیتی وہ آواز روک لیتی۔ اس دم اسے احساس ہوتا کہ اس کے قدرتی جذبوں کا گلا گھونٹا جا رہا ہے وہ کستوری تھی اس کے خواب بھی خوشبو کی طرح آزاد تھے۔

اس کی سہیلی و پڑوسن بلو کی بارات آنے میں آدھا گھنٹہ تھا وہ سردیوں کی دھوپ میں بال سکھانے چھت پر آئی تھی...... بال سکھانے آئی تھی سامنے برابر والے گھر کی چھت کے اس پار کھڑا مالی اس کے جذبوں کی آبیاری کو کھڑا تھا وہ بال سکھا رہی تھی انگلیوں سے سلجھا رہی تھی۔ ساری خدائی سے بے نیاز...... وہ مہ کامل تھی اس کے وجود کا ہر حصہ مہ پارہ...... وہ ششدر کھڑا رہ گیا وہ کیسی بے خبر تھی وہ تو توجہ چاہتا تھا اس نے پیتل کا گلدان زمین پر گرا دیا۔ ٹن ٹن...... ٹن...... پختہ فرش پر گرتے ہی گلدان نے جبرو زیادتی کی دہائی دی کستوری چونک پڑی اس نے ادھر ادھر دیکھا...... سامنے منڈیر سے

نیچے جھانکتے نوجوان کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی کہ دن میں ستر بار اس کی چھت یاترا ہوتی تھی پہلے کبھی نہیں دکھائی دیا...... یہ نوجوان...... اس کے ہونٹ نیم وا تھے اور آنکھیں پوری کھلی ہوئیں نوجوان ایک دم پلٹ پڑا اور کستوری پر ایک بھرپور نظر ڈال کر اندر چلا گیا وہ نگاہ وہ تھی کہ جو غالب کی محبوبہ کا تیر نیم کش کہلائی تھی۔ کستوری کا دل دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ وہ خود کو سنبھالتی نیچے چلی آئی تھی۔ اماں نے ہزار دفعہ کی دہرائی بات ایک مرتبہ مزید دہرائی......

نامراد چھت پر بال کھول کر نہ پھرا کر کنواری لڑکیوں کو آسیب چمٹ جاتے ہیں اماں سامنے بلو کے کرائے دار تو چھت پر رہتے ہیں۔ سات بیٹیاں ہیں ان کی...... کھلی چھت پر سوتے ہیں سب ان کی بیٹیوں کو تو کسی آسیب نے نہیں سونگھا آج تک...... حالانکہ تین چار کو لے جائیں تو اچھا ہی ہو، کم از کم ان کی اماں آپ کے پاس سات جوان بیٹیوں کا رونا تو نہیں روئیں گی۔

اسے اماں کی نصیحت پر تاؤ آ گیا تھا۔

ارے دیکھو زبان کیا ہے ڈنڈا ہے ہاتھ بھر؟......

روتی ہے وہ اولاد جو بڑوں کا کہا نہیں مانتی۔

اماں کو گویا پھر چابی مل گئی وہ عاجز آ کر دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

فیروزی لپکے سے سجا کرتا پائجامہ اور خوبصورت دوپٹہ پہنے وہ شامیاں سے باہر کھڑی تھی ابھی ابھی دلہن کی رخصتی عمل میں آئی تھی۔ عزیز سہیلی کی رخصتی پر رو رو کر اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ ابھی تک سوں سوں کر رہی تھی۔

سامنے والے گھر کا گیٹ کھلا اور شام والا نوجوان موٹر سائیکل سمیت باہر آیا کستوری پر نگاہ پڑتے ہی چونک پڑا پھر بڑی شائستگی سے مسکرایا کستوری کو یوں محسوس ہوا گویا چکی کے دو پاٹوں کے بیچ اس کی جان رکھ دی گئی ہو۔ وہ لپ جھپک اندر بھاگ گئی غریب لڑکی کا رومانس آنکھ مچولی سے شروع ہوتا ہے۔ آنکھ مچولی شروع ہو گئی تھی۔

بیٹیوں کے ہونے کا کوئی دُکھ نہیں۔ نصیب اچھا ہو اور نیک ہوں تین بیٹیاں بیاہی ہیں میں نے بیٹیوں سے بڑھ کر سر اونچے رکھے میری بچیوں نے میری بچیاں تو جانیں ہی نہیں زمانے کی ہوا کس طرح کی ہے۔ اماں خلاف معمولی آج بیٹیوں کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ اپنی دیورانی کے سامنے۔

مگر کستوری کو ان قصیدوں سے رمق برابر خوشی محسوس نہ ہوئی۔

ہونہہ...... ساری عمر بس دوسروں کی فکریں کرتے کرتے تباہ کر دو، اگر اپنے جذبات اپنی عمر برباد کر بھی دی تو کون سا ایمپائر اسٹیٹ پر جھنڈا گزرے گا۔

ماں نصیب کبھی کبھی بلاتا ہے بلائے تو چلے جانا چاہیے ورنہ وہ روٹھ جاتا ہے پھر ساری زندگی پچھتاتے گزرتی ہے اس کی سوچ اس عمر کے عین مطابق تھی جذباتی اور سطحی آنگن میں بہت جگہ تھی مگر وہ کپڑے سکھانے چھت پر گئی تھی ایک ایک کپڑے جھٹک جھٹک کر الگنی پر ڈالتی اتنے زور سے جھٹکتی ساری چوڑیاں قہقہے لگانے لگتیں......

اس نے اپنے جذبات اور بلاوے کے انداز چوڑیوں پرو دیئے تھے...... وہ کتاب ہاتھ میں تھامے تھامے منڈیر تک چلا آیا...... وہ انجان بن گئی...... مگر اب لہرا لہرا کر کپڑے ڈالنے لگی تھی ایک مرتبہ بھی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھا تھا اور بالٹی اٹھا کر ٹھک ٹھک کرتی نیچے آ گئی۔

اس کا ذہن چھت کی طرف ہی متوجہ رہنے لگا تھا شام کو ابا کو چائے بنا کر دی اور اماں سے کہ وہ کپڑے اتارنے اوپر جا رہی ہے۔ وہ اوپر پہنچی تو برابر والی چھت پر بچے بسنت منا رہے تھے۔ اس کا دل بجھ سا گیا وہ بے دلی سے کپڑے کھینچ کھینچ کر اتارنے لگی۔ اسی دم اسے ایک بچے کی آواز آئی...... آپا...... آپ کے روشن دان سے پتنگ اٹک گئی ہے ذرا نکال دیں۔

وہ کپڑے ٹوٹے پھوٹے تخت پر رکھ کر روشن دان کی سمت آئی اور پتنگ آزاد کر کے اُونچائی سے چھوڑنے لگی۔

ایک دم اس کے کانوں کی لوئیں سلگنے لگیں۔ پتنگ اس کے ہاتھ میں تھی اور ڈور اسی نوجوان کے ہاتھ میں...... عجیب خوشگوار سے احساسات کے درمیان اس نے پتنگ چھوڑ دی۔ اٹھارہ زینے طے کرنے کے جتن رائیگاں نہیں گئے تھے۔ وہ شاد شاد سی نیچے چلی آئی، اماں نے اسے صبح بتایا تھا برابر میں جو نئے ''آنز'' آئے ہیں ان کے ہاں میلاد ہے شام کو بلاوا دے گئیں تھے خاتون خانہ، میں نے تو آج صبیحہ کے ہاں جانا ہے اس کی بچی دو دن سے اسپتال میں ہے تم ہو آنا۔

اور یوں وہ ہلکے گلابی سوٹ میں ملبوس سیاہ چادر ماتھے تک ٹکا کر جب وہاں پہنچی تو وہ غالباً کہیں جانے کے ارادے سے موٹر سائیکل پر بیٹھا تھا کستوری کو دیکھ کر چابی گھمانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اسے بڑے مہذب انداز میں اندر جانے کو کہا۔ اس کے سراپے کی طرح اس کی آواز بھی بہت جادو اثر تھی۔ وہ پلکیں جھکائے اندر چلی آئی۔

دو تین لڑکیوں نے بڑے اخلاق سے اس کا استقبال کیا اسے بٹھایا۔

محفل میلاد بڑے باوقار انداز میں اختتام پذیر ہوئی، ہلکا پھلکا ریفریشمنٹ تھا وہ چائے کی پیالی کے ہلکے ہلکے سپ لے رہی تھی۔

اور وہ اس کے سامنے سے کئی بار گزرا وہ جان کر بھی انجان بنی رہی۔ وہ خود پسند لڑکی نہیں تھی بلکہ چاہے جانے کی خواہش رکھنے والی ایک باحیا اور بزدل لڑکی تھی ہزار چاہنے پر بھی اس کی سمت نہ دیکھ سکی کہ کہیں وہ ادھر ہی نہ دیکھ رہا ہو۔

جب وہ آتے وقت گیٹ پار کر رہی تھی تو وہ آہستگی سے گویا ہوا تھا۔ آتی رہا کریں۔

اور کستوری کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلک پڑیں۔

یہ پہلی براہ راست ملاقات تھی۔

ایک چنگاری سلگی تھی۔ ایک رات بھڑک کر شعلہ بن گئی۔

اس نے منڈیر پر بازو جما کر اسے اپنانے کی آرزو بیان کی تھی۔ کستوری کی

بھی یہی آرزو تھی وہ آنکھ مچولی سے بعد خود کو دلہن بنا دیکھنا چاہتی تھی۔ نہ کہ لمبے لمبے رومانس کے چکروں میں الجھانا چاہتی تھی...... اور اس روز خود اس کی آرزو سوہنی کا کچا گھڑا بن گئی جس کے سہارے اس نے سماج کے دریا کو عبور کرنے کا پختہ عزم کر لیا کہ ''تو نہیں تو اور کوئی بھی نہیں۔''

وہ ایسے ہی چلی آئی تھی گھر والوں سے ملنے کہ ''اس سے منسوب پیارے اسے بھی پیارے تھے۔

مگر گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا گھر میں صرف وہ ہی تھا طارق نے اسے دیکھا اور اسے بیٹھنے کو کہا مگر وہ گھبرا گئی تھی، تب اس نے لوہے کی کرسی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا......

کستوری! بیٹھو ناں...... تھوڑی دیر ہی سہی......

مجھ سے کیا ڈرنا......؟

مگر وہ بیٹھی نہیں......

گھر میں کوئی نہیں ہے میں چلتی ہوں...... وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

طارق نے مخصوص مہک کے مرغولے میں مقید سہمی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

اچھا تو پھر جاؤ...... میں تمہیں قسمیں دے کر بھی بٹھا سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا کستوری مجھے تمہاری محبت کے علاوہ تمہارا اعتماد بھی چاہیے۔

وہ واپس اندر چلا گیا۔

وہ محبوب تھا اب دیوتا ہو گیا تھا۔ کستوری کے جذبوں میں شدت آ گئی تھی۔

اسے ناز تھا کہ اسے ایک ''انسان'' نے چاہا ہے اب تو اسے راتوں کو نیند بھی نہیں آتی تھی۔ جی چاہتا تھا بس جلدی سے وہ اس کی ہو جائے۔

جب بھی طارق کی ماں ان کے گھر آئی اس کا دل دھڑک جاتا کہ شاید آج وہ

اسے مانگنے آئی ہیں مگر کوئی بات نہ ہوتی وہ بجھ سی جاتی۔ طارق سے وہ اتنی کھلی نہ تھی کہ جا کر اس سے پوچھتی تم لوگ مجھے مانگتے کیوں نہیں کیا رکاوٹ ہے کیا مجبوری؟ مگر وہ سوچ کر ہی رہ جاتی۔

ایک روز معلوم ہوا کہ طارق اپنی ماں کے ہمراہ اپنی بیمار پھوپھی کی عیادت کو لاہور گیا ہے کستوری کے دن بوجھل ہو گئے۔ عشق میں تو دید ہی عید ہوتی ہے اس کی ایک جھلک اس کا منوں بوجھ دل سے سرکا دیتی تھی۔

ہر گاڑی کے ہارن پر وہ کھڑکی سے جھانکتی کہ شاید آ گیا ہو مگر ہر مرتبہ مایوس ہوتی۔

آج جب وہ حضرت نوح کے زمانے کے کھڑ کھڑ پنکھے کے نیچے سو رہی تھی اسے گلی میں ٹیکسی رکنے کی آواز آئی۔ اس نے ایک بار اٹھ کر باہر جھانکا ٹیکسی سے طارق اُترا تھا پھر اس کی ماں، پھر اس کے بعد پھول دار چادر میں لپٹی ایک نازک سی لڑکی۔

طارق نے جب تک کرایہ ادا کیا اس وقت تک طارق کی ناں اس لڑکی کو لے کر اندر جا چکی تھی۔ طارق نے پرس پیٹ کی پچھلی پاکٹ میں ٹھونسا اور آہستہ روی سے اندر کی طرف مڑ گیا۔

کستوری کے جی کو قرار آ گیا تھا وہ شام تک پیٹ بھر کر سوئی شام کو اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر چائے پی...... اسی دم اسے اماں کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تھا...... دادی تو پچھلے ماہ سے چھوٹے چچا کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ وہ باورچی خانے سے باہر آئی احساس ہوا بیرونی دروازہ باہر سے بند ہے ابھی وہ الجھ ہی رہی تھی کہ اماں آ گئیں۔

سر سے چادر اتار کر رکھ کر بولیں...... ''لو بھلا اکلوتا لڑکا تھا ان کا کیا کیا ارمان نہیں ہوں گے۔ مگر قسمت کے آگے کس کی چلی ہے بھاوج ہو تو طارق کی ماں جیسی۔

میاں کو مرے تیسرا برس ہے مگر سسرال والوں سے اسی طرح محبت ہے جیسے اس کی زندگی میں ہو گی۔ نند کی بیٹی بیاہ لائی، لڑکی بھی بری نہیں ہے......

کستوری کے پاؤں تلے زمین کا یعنی......

کون اماں!...... اس کی آواز میں لرزش تھی۔

ارے وہ طارق کی پھوپھی بیمار تھی ناں اس کی ایک بیٹی تھی۔ طارق کی ماں سے منت کی کہ وہ اسے اپنی بہو بنا لے ورنہ لڑکی کا کیا بنے گا۔ طارق کی ماں بھی فرشتہ ہی ہے نند کے سامنے ہی بیٹے کا نکاح کر دیا...... طارق کی دلہن دیکھنے گئی تھی۔ اچھی ہے لڑکی خدا نصیب اچھا کرے۔ اماں باورچی خانے میں جاتے جاتے دعائیہ انداز میں بولیں۔

اور کستوری...... پتھر سی ہو کر رہ گئی...... خواب بھڑ بھڑ جلے اور سارا وجود دہک اٹھا۔

وہ چھت پر مغرب کی نماز پڑھ کر آئی تو جسم بری طرح تپ رہا تھا رو رو کر آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔

مقدر نے زندگی کے سنگ میل کو ایک ٹھوکر سے لڑھکا دیا تھا وہ زندگی راستہ بھول گئی۔

دوائیوں سے اور مناسب دیکھ بھال سے بخار تو اتر گیا تھا مگر اسے چپ لگ گئی تھی۔ رات کو اتنا روتی تھی کہ صبح پپوٹے سوج چکے ہوتے...... دادی بھی آ گئی تھیں۔

بلو کی اماں جان نے اس کی اماں کو یقین دلایا کہ یہ ساری علامتیں ''سائے'' کی ہیں اس پر اثر ہو گیا ہے۔

اماں کو جھٹ یقین اس لیے آ گیا کہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ہر وقت خوشبوؤں میں بسی رہتی تھی۔

''پھر شام کے وقت ننگے سر چھت پر جایا کرتی تھی......؟''

آمنے سامنے دونوں گلیوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ کستوری پر اثر ہو گیا ہے۔

کستوری کے چندر ماہ مکھڑے کے سب دیوانے تھے اس کی پر اخلاق مسکراہٹ پر سب نثار تھے۔ وہ محلے کی ہر دل عزیز لڑکی تھی، سب اپنے اپنے ٹوٹم...... منتر آزمانے لگے۔ گلے میں بازوؤں میں، پلنگ کی پٹیوں میں...... غرض کہ تعویذ ہی اوڑھنا بچھونا بنا دیئے گئے وہ اسی طرح گم صم تھی۔ رات کو اماں کمرے میں دھونی دیتیں کمرہ ایک مزار کا منظر پیش کرنے لگتا۔

''اے ہے...... ایسی نیک پردہ پوش لڑکی جس پر نہ کوئی میلی نگاہ پڑی ہوگی نہ سایہ...... خوشبوؤں کی دیوانی کو یہ خوشبوئیں ہی لے ڈوبیں...... اسی لیے تو کہتی ہیں ان لڑکیوں کو...... مگر آج کل یہ لڑکیاں گردانتی کہاں ہیں ان باتوں کو......''

صبح شام محلے کی خواتین کے اجلاس ہوتے تھے۔ جو بھانت بھانت کی بولیاں بولتیں کوئی تعویذ لاتیں کوئی پڑھا ہوا پانی...... کوئی اپنے پیرو مرشد۔

رو رو کر کستوری کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔ ایک روز بیزار ہو کر وہ الٹ کر پڑی اماں کیا تماشہ بنا رکھا ہے، پھر پھوٹ پھوٹ رو دی۔ سب عورتوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا دیکھی...... آواز بھی بدلی ہوئی ہے۔ یہ تو کھلی نشانی ہے آواز بھاری ہو جاتی ہے، میری اماں کی پھوپھی ساس کی دیورانی پر بھی اسی طرح کا......

ہونہہ...... تمہاری پھوپھی، ساس کی دیورانی ہوگی پھوپھی ساس کے دیور کے ہوتے ہوئے بھی اس کے طور یہ تھے...... چھی......

کستوری روٹ بدل کر سوچتی۔

روز ہی کوئی نہ کوئی عیادت کو آ جاتا تھا...... کستوری نے خود کو بہت سنبھالا تھا مگر رات کاٹے نہیں کٹتی تھی۔

اس کے پختہ خواب تھے...... جن سے وہ سر پھوڑتی تھی...... اتنے پختہ خواب...... کہ طارق دولہا بن کر بار ہا اس کے آنگن اترا تھا...... دروازے پر ساتوں پہر شہنائیاں بجتی تھیں وہ سہاگن پہلے بیراگن بنی تھی اس شیشہ لڑکی کے دکھ اتنے بڑے تھے

کہ تصور میں نہیں سما سکتے تھے۔

طارق کی بیوی طارق کی بہنیں کئی بار اس کی عیادت کو آئیں تھیں۔ موت کا جلاپا کیا ہوتا ہے اس نے کنوار پن میں محسوس کیا تھا جب تخت سے تختہ ہوتا ہے تو ایک بادشاہ کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس ڈربہ نما گھر کی اس نیم خواندہ لڑکی جو امپریل و سوشل ازم و نیشنل ازم کی اصطلاحوں سے ناواقف تھی خوب سمجھتی تھی۔ بعض دکھ پڑھ کر محسوس نہیں ہوتے...... دُنیا اس کا دُکھ بتا رہی تھی۔ اس پر سایہ بتا رہی تھی ہمدردی کر رہی تھی۔

اگر یہی عورتیں اسے مسمریزم کر کے ہپناٹائز ڈ کر کے اس کی ذہنی پرت پرت پڑھ لیتیں تو ماتھا پیٹ کر اپنے اپنے گھروں کو سدھارتیں...... جس طرح اولاد صرف اس کی ہوتی ہے جس کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح دکھ بھی صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس کے قلب سے جاری ہوتا ہے یا پھر وہ جو اسی طرح کا دکھ اٹھا چکا ہو......

اب عورتوں کو کون سمجھائے...... کہ جب وہ اس قاتل عمر میں ہوں گی تو ان کے گھر میں زینے نہیں ہوں گے اگر زینے ہوں گے تو پڑوس میں کوئی طارق نہیں ہوگا......

اگر طارق بھی ہوگا تو تمہارا قلب ''جاری'' نہیں ہوا ہوگا، اس نے خود کو بہت حد تک سنبھال لیا تھا...... اور جھلا کر بولی! اماں یہ کیا تماشہ! صبح و شام ہوتا رہتا ہے کوئی نہیں ہے مجھ پر سایہ وایہ!...... کیا کسی کی طبیعت خراب نہیں ہوتی......؟

اماں اور دادی نے اسی وقت سجدہ شکر ادا کیا۔ اماں اور دادی سمیت بے زبان سیدھے سادھے ابا بھی شیخ امام ضامن کے پیرو مرشد کے قائل ہو گئے، جن کی جھاڑ پھونک سے اس قدر ''افاقہ'' ہوا تھا۔

☆☆☆

طارق کی امی کے ماموں لکھنؤ ہندوستان سے پاکستان ''وزٹ'' پر آئے تھے۔ حکمت کے آبائی پیشے سے منسلک تھے۔ پاکستان میں مقیم اپنے رشتے داروں کے

لیے ہدیئے وتحائف لائے تھے لیکن سب سے بیش قیمت تحفہ انہوں نے اپنی سگی بھانجی یعنی طارق کی امی کو مرحمت فرمایا تھا...... انہوں نے شیشے کی چھوٹی سی ڈبیہ طارق کی امی کو پیش کی، جب انہوں نے کھولا تو سارا کمرہ مہک اٹھا...... چھوٹی سی مشک نافہ کی ڈلی تھی انہوں نے تھوڑی سی توڑ کر ایک ڈبیہ میں رکھ کر اپنی بہو کو بھی دی...... ساتھ ہی بتایا کہ اسے کستوری بھی کہتے ہیں...... سونے سے زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔ پھر پلٹ کر اپنے ماموں کا شکریہ ادا کیا، انہوں نے بہت خوب صورت اور قیمتی تحفہ دیا ہے اور بہو کو تلقین کی کہ اسے حفاظت سے رکھے۔

☆☆☆

وہ خود بھی بہت مضطرب تھا...... سب کچھ اس کے ساتھ اچانک ہوا تھا...... وہ لاابالی اور ہرجائی نوجوان نہیں تھا خواب اس کے بھی پختہ تھے۔ کستوری کی علامت کا سن کر بار بار دکھ و ندامت محسوس کی تھی۔ اب بھی اس کا جی چاہتا تھا وہ اسے دیکھے۔ وہ چھت پر آئے چوڑیوں کے ساز بجائے ایسی الوہی موسیقی سنے، جسے نصیب ور سنتے ہیں اور اس پر سلگتی نظر ڈالے کہ وہ بھڑ بھڑ جلتی سارے زینے دو تین جستوں میں پار کر جائے۔

رات بہت بیت گئی تھی۔ اس نے منڈیر پر سفید آنچل لہراتا دیکھا یقیناً وہ کستوری تھی وہ آگے بڑھ آیا۔

پہلی مرتبہ اس نے اسے منڈیر سے پکارا......

''کستوری......!''

''وہ اسی طرح کھڑی رہی......''

''کستوری......''

''ادھر آؤ ورنہ میں ادھر آ جاؤں گا۔''

کستوری نے جھکا سر اٹھایا اور جیسے خواب میں چلتی ہوئی منڈیر کے نزدیک

آ گئی، سفید کپڑوں میں وہ مردوں کی طرح ٹھنڈک دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی بے آباد اور بے آواز تھی کہ ایک لمحے تو طارق کو بھی خوف سے جھرجھری آ گئی......

کستوری......! انسان تو بے وقوف ہے اپنے فیصلے خود کرنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ فیصلے تو ہو چکے ہیں...... تم خود کو سنبھالو...... کستوری...... ہمارے ہاں یا تو حکومت کی چلتی ہے یا جاں بلب لوگوں کی یا مرحومین کی...... میں زندہ تھا اس لیے میں کچھ نہیں کر سکا اگر پھوپھی سے پہلے میں لب گور ہوتا تو شاید تمہیں پالیتا۔

اس کا سر سچ آدمی کی طرح جھک گیا اس کی آواز شریف آدمی کی طرح دھیمی ہوگئی۔

عجب سفر تھا اس محبت کا...... درمیان میں نہ اقرار محبت نہ اعتراف محبت، احساس محبت کی کڑی سے احساس ندامت و اعتراف جرم کی کڑی مل گئی تھی......

طارق نے دیکھا کستوری کی پتھر آنکھوں سے جھرنے پھوٹنے لگے ہیں......

اس سے پہلے کہ جھرنوں سے آواز پیدا ہوتی وہ پلٹ گیا اور تیزی سے زینے طے کر گیا۔

اپنے کمرے میں آیا تو مرحومہ پھوپھی کی التجا غالباً پیٹھ موڑے سو رہی تھی...... وہ خاموشی سے لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کی بیوی الماری کے پاس کھڑی تھی۔

''سنئے...... آپ نے کبھی کستوری کی خوشبو سونگھی ہے؟'' طارق نے چونک کر زیب النساء کی شکل دیکھی وہ مسکرا رہی تھی طارق کو مسکراہٹ زہر آلود محسوس ہوئی۔

اس کی شریانوں میں جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ وہ اس کے نزدیک آ کر تپ کر گویا ہوا۔ زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو جو کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو...... کس کس سے کہو گی......؟ نباہ! تم نے میرے ساتھ کرنا ہے اس لیے کہ زبردست میرے سر منڈھ دی گئی ہو...... ورنہ...... آج تمہاری جگہ کستوری ہی ہوتی...... وہ جتنی حسین ہے اتنی ہی نیک ہے، خبردار! جو تم نے اس کے بارے میں کبھی الٹی سیدھی بات منہ سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس کا مطلب ہے میں جہاں جہاں جاتا ہوں اس گھر میں تم میرا پیچھا کرتی ہو......

شرم نہیں آتی تمہیں؟''

وہ بری طرح بھڑک اٹھا تھا۔

زیب النساء ہکا بکا منہ کھولے ایک ٹک طارق کی صورت دیکھ رہی تھی۔ مشک نافہ کی ڈبیہ اس کی مٹھی میں بند تھی۔ وہ تو فرط شوق سے خاوند کو یہ قیمتی خوشبو سنگھانے آئی تھی۔ کتنی دیر سے لیٹی وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

''...... وہ...... ماموں عنایت اللہ یہ...... یہ......'' اس نے مٹھی کھول کر ڈبیہ آگے کر کے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ہر چند کہ ذہن اب اس کا کھولنے لگا تھا۔ مگر طارق تو دل ہی دل میں اسے مکار جاسوسہ کا خطاب دے کر تکیہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

زیب النساء کستوری کی ڈبیہ ہاتھ میں تھامے گم صم کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے کستوری کا ''جن'' نظر آ گیا تھا ایسے ایسے ٹوٹم...... منتر اس پر منکشف ہوئے تھے کہ اس کا جی چاہا بھی جا کر کستوری کی جھاڑ پھونک کر آئے...... مگر تھوڑی دیر کی گہری سوچ کے بعد اس نے کستوری کی ڈبیہ کپڑوں کی تہہ کے نیچے دفن کر دی اور خاموشی سے پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

آدم کی بیٹی

بلوچ ثقافت کا مظہر ایک وسیع و عریض ریسٹورنٹ تھا۔ مدہم روشنیوں سے آراستہ خواب ناک سا ماحول گراؤنڈ فلور اور فرسٹ فلور پر یہاں سے وہاں تک بچھے تخت جن پر سرخ اور زرد رنگوں کے پھولوں سے سجے قالین اور ہم آہنگ رنگوں کے بڑے بڑے گاؤ تکیے۔ تقریباً رات گیارہ بجے کا عمل تھا اور تمام تخت بھر چکے تھے۔ اس ریسٹورنٹ کا گراؤنڈ فلور صرف مرد حضرات کے لئے اور فرسٹ فلور فیملی کے لئے مخصوص تھا۔ اس نے اپنے نئے شادی شدہ دوست کو یہاں ڈنر کے لئے انوائٹ کیا تھا۔ وہ اپنی کار میں آیا تھا جبکہ اس کے دوست نے بائیک پر اپنی نو بیاہتا بیوی کے ساتھ آنا تھا۔ اس نے دوست کو کار میں پک کرنے کی آفر کی تھی جس پر دوست نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

یہ بائیک جو کبھی کبھی لگژری کاروں کے اژدھام میں پھنس کر اسے اچھا خاصا احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی تھی آج کل بڑی رومینٹک سواری لگنے لگی ہے۔ جب اس کی بیوی اس کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر کے اس کے ساتھ بیٹھتی ہے تو اسے یوں لگتا ہے

جیسے وہ چاندی کے پروں والے براق پر محوِ سفر ہے۔

بائیک کی شان میں اتنے حسین الفاظ سن کر وہ درحقیقت لاجواب ہو گیا تھا

اب اسے یہاں بیٹھ کر دونوں نئے گرفتار پرندوں کا انتظار کرنا بہت زیادہ اذیت ناک لگ رہا تھا۔ گاہے گاہے نظر دوڑا کر اپنی ریسٹ واچ دیکھنے لگتا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے انہیں فون کیا تھا تو جواب ملا تھا کہ تم پہنچو ہم بس نکلنے ہی والے ہیں۔ اسے انتظار کرتے ہوئے لگ بھگ آدھا گھنٹہ ہو رہا تھا۔ ویٹر کئی مرتبہ چکر لگا چکا تھا مگر وہ کیسے آرڈر کرتا جن کے اعزاز میں یہ ڈنر تھا۔ آج کا Menu تو اُن کی پسند کے مطابق ہی ہونا چاہئے تھا۔

بہت سے لوگ چھوٹے بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے جنہوں نے فلور پر عجیب سی دھما چوکڑی مچائی ہوئی تھی۔ بچوں کی وجہ سے ماحول کی رونق بڑھ رہی تھی۔ جبکہ بچوں کے گارڈین گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے آرڈر کی تکمیل کے منتظر تھے۔ اسے بیٹھے بیٹھے زور کی جماہی آئی۔ اس نے دل کھول کر جماہی لینے کا ارادہ کیا۔ مگر ایک دم احساس ہوا کہ وہ تنہائی میں نہیں لوگوں کے ہجوم میں ہے۔ اس نے دل کڑا کر کے جماہی کو کنٹرول کیا۔

''لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ عورتیں تیاری میں بہت وقت لگاتی ہیں۔ اگر کسی تقریب میں خواتین کو مدعو کرنا ہو تو انہیں تقریب سے چھ گھنٹے پہلے کا ٹائم بتانا چاہئے۔''
اس نے کوفت بھرے انداز میں سر کھجایا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید اس مرتبہ آتے ہوئے دکھائی دیں۔

معاً اسے اپنے بالکل ساتھ والے تخت پر کچھ عجیب سی غیر معمولی سچویشن کا ادراک ہوا۔ اس نے محتاط انداز میں برابر بیٹھے ہوئے بندوں پر نظر ڈالی اور ایک دم چونک سا گیا۔ تخت پر دو مرد اور ایک انتہائی خوبصورت اور کم عمر لڑکی بیٹھی تھی۔ دونوں مردوں کے پاؤں تو تخت پر تھے جبکہ لڑکی تخت کے کنارے پر ٹکی پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

لڑکی کی عمر بمشکل اٹھارہ، اُنیس سال ہوگی جبکہ ایک مرد دُبلا پتلا پینتیس یا چالیس سال کا دکھائی دیا تھا اور دوسرا جو بڑے نوابوں والے اسٹائل میں نیم دراز تھا اور بڑے اسٹائل سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ وہ بھاری جثے کا حامل تھا، چہرہ بھی بھاری اور گوشت سے پُر تھا، جلد کی رنگت میں سرخی تھی۔

سعدی نے محسوس کیا کہ اس قوی الجثہ مرد کی جلد میں ڈھیلا پن تھا جو اس کی ڈھلتی عمر کی پول کھول رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس کے بال بالکل گھرے سیاہ تھے اور بہت گھنے تھے۔ بالوں کی سیاہی بھی عمر چھپانے میں ناکام تھی اور بتا رہی تھی کہ بالوں کو نیا نیا رنگا گیا ہے۔

سعدی نے یہ سب کچھ چند لمحوں میں دیکھ لیا تھا اب اندر ایک کھوج سی بیدار ہوئی۔ وہ لڑکی کی طرف باقاعدہ متوجہ ہو کر دیکھنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی جیبوں میں کچھ ڈھونڈنے کی اداکاری کرتے ہوئے گاہے گاہے اُڑتی پڑتی نگاہ لڑکی پر ڈالی۔ لڑکی سادہ سے لان کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس تھی۔ آستینیں انتہائی چھوٹی تھیں۔ اس وجہ سے چم چم کرتے دُودھیا بازو بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کے بالوں میں سنہرا پن نمایاں تھا۔ وہ بھی شاید کسی پارلر کا مرہونِ منت تھا۔ البتہ حیرت انگیز طور پر اس کا چہرہ میک اَپ سے بالکل عاری تھا۔ چھوٹی بچیوں کی طرح اس نے بالوں کو اُونچا اُٹھا کر پونی بنائی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اور بھی کم عمر لگ رہی تھی۔

سعدی کو وہ تینوں کچھ غیر معمولی محسوس ہو رہے تھے۔ لڑکی کی ادائیں کمرشل تھیں جس کی وجہ سے وہ سمجھ تو بہت کچھ گیا مگر جیسے یقین کرتے ہوئے اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ تاسف سا تھا کہ اتنی کچی کونپل، رات کے اس پہر دو درندوں کے شکنجے میں، ابھی اس نے دُبلے پتلے مرد کو توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ ان تینوں کو توجہ سے ایک ساتھ دیکھنا تو یوں بھی ممکن نہیں تھا ایک ویسے ہی فیملی ہال میں اتنی دیر سے تنہا بیٹھنے پر عجیب سی شرمندگی ہو رہی تھی کہ زینے کے آخری اسٹیپ پر پاؤں رکھتے ہی سامنے چمکتے بورڈ پر نگاہ

پڑتی تھی جس پر لکھا ہوا تھا کہ صرف فیملی کے لئے۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی منیجر کو بتا دیا تھا کہ اس کے ساتھ اس کے بھائی بھابی ہیں جو بس پہنچنے ہی والے ہیں۔

نظر اور ذہن کو مصروفیت تو مل گئی تھی مگر انتظار کی کیفیت اپنی جگہ تھی۔ اس نے اب دُبلے پتلے مرد کو ناقدانہ جانچنا چاہا کہ تجسس کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تخت سے اُتر کر کھڑا ہو گیا اور فرش پر یوں نظریں دوڑانے لگا جیسے اس کی جیب سے کچھ گر پڑا ہو۔

''اتنی باریک مخلوق تو نہیں ہیں یار......! فرش پر ڈھونڈ رہے ہو ہمیں؟'' اسے عمران کی آواز بالکل قریب سے سنائی دی۔ وہ چونک کر سیدھا ہو گیا اور خفیف انداز میں مسکرا کر عمران کی دُلہن کو آداب بجالانے لگا۔

''حد ہو گئی......! اتنا لیٹ......؟ کیا مڈغاسکر کے کسی غار سے نکل رہے تھے؟''

''تم چلو......! بس ہم نکل رہے ہیں۔'' سعدی نے عمران کی نقل اُتار کر اپنی بچی کھچی خفت بھی مٹائی۔

''یار......! وہ بلوچ کالونی کے پل کے قریب اچانک ٹریفک جام ہو گیا۔ بہت برے پھنس گئے تھے۔ وہاں سے نکل آئے ہیں مگر یقین نہیں آ رہا۔ بیچاری نو بہار کا تو سارا میک اَپ ہی بہہ گیا۔ کھڑی گاڑیوں کی تھوڑی گرمی ہوتی ہے۔'' عمران نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔ اس نے بڑی دلبرانہ انداز میں خفگی سے عمران کی طرف دیکھا۔ اس طرح کے تمام پوز ہنی مون البم کے لئے ہی مخصوص ہیں۔ ہنی مون پیریڈ کے بعد بیگم کی خفگیاں۔ الامان الحفیظ۔

سعدی نے اس خوبصورت منظر کو خوب انجوائے کیا پھر بڑے مؤدبانہ انداز میں نو بہار کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ اتنا حاضر دماغ تو تھا کہ اس میل ملاقات کے شور شرابے میں اس دُبلے پتلے مرد کا بھی جائزہ لے لیا جس کے نین نقش بہت متوازن تھے مگر چہرے پر ذرا کشش نہیں تھی۔ عجیب سی کرختگی اور مکاری کا تاثر بہت

واضح تھا۔

''یار......! اب تم بیٹھنے کا کتنا لو گے......؟'' سعدی کو کھڑا پا کر عمران نے جملہ کسا۔

عمران اور نو بہار آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ وہ عمران کے برابر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ویٹر بڑی تیزی سے اس کے قریب آیا تھا اور Menu کارڈ تینوں کے سامنے رکھ دیئے تھے۔

''بھابی......! آپ آرڈر کریں آج آپ جو کھلائیں گی ہم وہ کھائیں گے۔ آفٹر آل چیف گیسٹ تو آپ ہیں۔''

''تھینک سعدی بھائی......! میں تو صرف مٹن وائٹ کڑھائی کا آرڈر کروں گی۔ اس کے علاوہ مزید کچھ نہیں لوں گی۔ باقی آپ دونوں اپنی پسند سے منگوا لیں۔'' نو بہار نے مینو کارڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے قدرے عروسانہ ادا سے شرماتے ہوئے کہا۔

ان دونوں سے بات چیت کے دوران اسے برابر والے تخت پر بیٹھے ہوئے دونوں مردوں اور لڑکی کا مشاہدہ کرنے کا خوب خوب موقع مل رہا تھا۔

معاً اسے قوی الجثہ مرد کی حرکات وسکنات نے چونکا سا دیا۔ وہ ہوش میں نہیں تھا اور اسی باعث محتاط نہیں تھا غالباً اپنے ٹھکانے سے پی پلا کر اب چرغے کڑھائیاں کھانے نکلا تھا۔ اس نے بہت دُکھ سے انار کی اس منہ بند کلی کی طرف دیکھا۔ مگر اس انداز سے جیسے مینو کی طرف متوجہ ہو۔ لڑکی کی ادائیں بے خوف بے حجاب اور قطعی کمرشل تھیں۔ دُبلا پتلا مرد بڑے لاتعلق انداز میں بیٹھا اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے ویٹر نے نمودار ہونا تھا۔ غالباً ان کا آرڈر ہو چکا تھا۔

سعدی کو یقین سا ہوا کہ یقیناً یہ ''ایجنٹ'' ہے کیونکہ پکی عمر کا مرد اپنی ہر ہر ادا سے پرلے درجہ کا عیاش محسوس ہو رہا تھا اور لڑکی کو اتنی بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا گویا

ضبط محال ہو۔

ویٹر اپنی نوٹ بک اُٹھائے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

’’یار عمران......! آرڈر کر دو......کوئی تکلف ہے۔‘‘ وہ عمران سے مخاطب تھا مگر چند جھلکیاں اس حسین دوشیزہ کی مزید اپنے حافظے میں محفوظ کر چکا تھا۔ وہ اب دوپٹے کا کونہ دانتوں میں دبائے بڑے شرمائے شرمائے سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اسی دوران ایک ویٹر آ کر ان کے تخت پر پلاٹ کا دسترخوان بچھا رہا تھا جس پر ریسٹورنٹ کا نام پرنٹ تھا۔

’’سوری یار......! آج تو تمہیں ہماری وجہ سے بہت بھوک برداشت کرنا پڑی۔ مگر یار......! ہم نے بھی دوپہر گیارہ بجے کا ناشتہ کیا ہوا ہے۔ اس بلوچ کی کڑھائی نے تو سارے شہر میں دھوم مچا دی ہے پتہ نہیں کہاں کہاں سے لوگ آتے ہیں۔ باہر گاڑیوں کا رش دیکھا۔ ہم نے تو اس لئے اپنے پیٹ کو بالکل خالی رکھا کہ آج ڈٹ کر کڑھائی اور آئس کریم کھائیں گے۔‘‘ عمران سعدی کی ذہنی کیفیت سے بے خبر اپنی دُھن میں کہے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی نو بیاہتا بیوی سے بھی تائید چاہ رہا تھا جو صرف مسکرانے پر اکتفا کر رہی تھی۔

ویٹر آرڈر لے کر جا چکا تھا۔ اب ایک نئے انتظار سے گزرنا تھا۔ کم از کم چالیس منٹ تو انتظار کرنا ہی ہوتا تھا۔

’’بالکل بالکل......! آئے کس لئے ہیں۔ ڈٹ کر کڑھائی کھانے کے لئے۔‘‘ اب سعدی نے خود کو سنبھال کر ساری توجہ اپنے مہمانوں پر مبذول کر دی اور بڑی گرم جوشی سے عمران کو جواب دیا کہ کسی طرح اسے سعدی کی غائب دماغی محسوس نہ ہو۔

’’آپ اِدھر اکیلے ہوتے ہیں سعدی بھائی......! عمران بتا رہے تھے آپ کی فیملی تو چکلالہ میں ہوتی ہیں۔‘‘

’’نوکری تو نوکری ہوتی ہے بھابی......! ویسے یہ میری پہلی پوسٹنگ ہے...... چار سال میں۔‘‘ سعدی نے اب کامل توجہ کے ساتھ جواب دیا۔

’’آپ یہاں بالکل اکیلے ہیں۔ سب کام خود کرنا پڑتے ہوں گے۔ کیسے مینج (Manage) کرتے ہیں سب......؟‘‘ نو بہار کو جیسے اس پر ترس آ رہا تھا۔

’’بائی لک...... Paying guest ہوں۔‘‘ سعدی نے بے فکر انداز میں جواب دیا۔

’’شادی کیوں نہیں کر لیتے آپ......؟‘‘ نو بہار نے ذرا جھجکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

’’میں صبح کو ناشتہ نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ رات کو دیر تک جاگتا ہوں۔ میں نے سنا ہے شادی کے بعد ناشتہ باقاعدگی سے بنانا پڑتا ہے ورنہ بیگم ناراض ہو کر میکے چلی جاتی ہے۔‘‘ سعدی نے سنجیدہ سوال مذاق میں اُڑا دیا۔ مگر ایک دم سنجیدہ بلکہ فکر مند سا ہو کر برابر والے تخت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لڑکی دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ قوی الجثہ مرد اٹینشن ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ دُبلا پتلا مرد دبی زبان میں لڑکی سے کچھ کہہ رہا تھا مگر لڑکی کے چہرے پر ضدی پن کا تاثر تھا۔ اس نے جیسے بل کھایا اور باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئی۔

دُبلا پتلا مرد گھبرا کر پاؤں نیچے کر کے اپنی پشاوری چپل پہننے لگا۔ اس مرتبہ عمران اس کی بے توجہی اور لڑکی پر جمی نظریں محسوس کر چکا تھا۔ شرارت سے کھنکارا۔

’’واقعی خوبصورت ہے۔‘‘ اس نے سعدی کے پہلو میں کہنی مار کر شریر لہجے میں کہا۔

’’کاغذ کا پھول ہے مگر......‘‘ سعدی نے عذر لنگ ڈھونڈنے کے بجائے سنجیدگی سے مگر دبی زبان میں جواب دیا۔

"جان پہچان ہے......؟" عمران قدرے حیران ہوا۔

"لاحول ولا قوۃ......! میں نے کاغذ کا پھول کہا ہے۔ بھابی کے سامنے فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا رائے قائم کریں گی وہ میرے بارے میں۔" اس نے بظاہر مسکرا کر کہا مگر اندر ہی اندر باہر تاریکی میں جاتی نازک سی تنہا لڑکی اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ کم عمری، حسن اور باہر دُور تک پھیلی تاریک سیاہ رات۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔

"ایک منٹ......! میں ذرا واش روم تک جا رہا ہوں۔" ایک بے کلی تھی کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا نہ رہ سکا۔

نوبہار اپنی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ عمران اطراف میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ سعدی نے اس قوی الجثہ آدمی کی بھی بے چینی نوٹ کی جیسے شکار ہاتھ سے نکل جانے پر وہ ہاتھ مل رہا ہو اور مارے ٹینشن کے نشے کا زور ٹوٹ رہا ہو۔

"وہ آگے بڑھا۔ زینے کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر عمران اور نوبہار کی طرف دیکھا دونوں اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ شاید تنہائی پاتے ہی عمران کو چھیڑ چھاڑ سوجھی تھی۔ نوبہار کے ہونٹوں پر بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی، سر جھکا ہوا تھا۔ عمران اس کا کولیگ تھا ان کی دوستی کو صرف چار ماہ کا عرصہ گزرا تھا۔ وہ پیدائشی طور پر کراچی کا باشندہ تھا اور اس کی بیوی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا جو اس کی فرسٹ کزن بھی تھی۔

سعدی نے چور نظروں سے پھر ان کی طرف دیکھا اور جیسے دبے پاؤں زینہ طے کرنے لگا۔ نیچے آتے ہی وہ مزید ہجوم میں گھر گیا۔ آتے جاتے لوگ، باربی کیو کا اُٹھتا دُھواں، پراٹھوں کی خوشبو گوشت کٹنے کی ٹھک ٹھک، برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ، وسیع رقبے پر بچھے تخت اور تخت پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے گروپ ساتھ ہی دوطرفہ مین روڈ چل رہا تھا۔ روڈ پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ روڈ سے پرے اُونچی اُونچی عمارتیں اور ان اُونچی عمارتوں کے عقب میں ریل کی پٹڑی۔

اس ریسٹورنٹ کی جگمگاتی روشنیوں کے بعد آس پاس کی تمام روشنیاں، دیے کی ٹمٹماتی لو محسوس ہو رہی تھیں۔ دائیں بائیں بڑھتے راستے تاریک محسوس ہو رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کیکر، نیم، پیپل کے گھنے درخت بھی تاریکی پھیلانے میں حصہ لے رہے تھے۔

اس نے بڑی بے قراری سے اس لڑکی کو نظروں ہی نظروں میں تلاش کیا تھا۔

اس کا خیال تھا اس کے زینہ اُترنے تک وہ زیادہ آگے تک نہیں گئی ہوگی۔ ہر طرف صرف مرد ہی مرد نظر آ رہے تھے۔ کسی کسی کار سے البتہ فیملی اُترتی دکھائی دی تو عورت بھی دکھائی دی۔ وہ متلاشی نظریں اِدھر اُدھر دوڑا رہا تھا۔

اچانک اسے وہ دُبلے پتلے مرد کے ساتھ نیم کے درخت تلے کھڑی نظر آ گئی۔ وہ اتنا آگے بڑھا کہ اس سے مزید قریب ہو سکے۔ پارکنگ ایریا سے وہ خاصے فاصلے پر تھی۔ وہ کاروں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک لینڈ کروزر کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا جو نسبتاً تاریکی میں تھی اور بلیک کلر ہونے کی وجہ سے تاریکی میں اضافہ کر رہی تھی۔

وہ کیا باتیں کر رہے تھے اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک تو فاصلہ بھی تھا دوسرے وہ لوگ جان بوجھ کر آہستہ آواز میں بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی روڈ کے متوازی چل پڑی پھر چند قدم چلنے کے بعد اس نے پلٹ کر اس دُبلے پتلے کرخت چہرے والے مرد کو کچھ کہا جو بڑی بے بسی سے کھڑا اپنا سر کھجا رہا تھا۔

لڑکی پھر سیدھی سیدھی چل پڑی۔ وہ کسی کنوینس کے چکر میں نہیں تھی یوں لگتا تھا کہ اسے بس اسی طرح چلتے ہوئے راستہ طے کرنا ہے۔

پھر اس نے دیکھا۔ وہ دُبلا پتلا بانس کی طرح لمبا مرد واپس ریسٹورنٹ کی طرف جا رہا تھا۔ لڑکی قدم بہ قدم ریسٹورنٹ سے دُور ہوتی جا رہی تھی اور آگے پھیلی

تاریکی میں گم ہو جانے کے قریب تھی۔ وہ نوجوان مرد بچہ تھا۔ مختلف وقتوں میں فائیو اسٹار ہوٹلوں، پٹرول پمپ اور مختلف پبلک اسپاٹ پر اس نے کمرشل عورتیں/ لڑکیاں دیکھی تھیں جو بہترین لباس پہنے ہوتے تھیں اور خوشبوؤں میں مہک رہی ہوتی تھیں۔ ان کا بے جھجک، بے باک انداز انہیں دوسری خواتین میں امتیاز دے رہا ہوتا تھا مگر اتنی سادہ، حسین، بے حد کم عمر، عام سے مگر اچھی تراش خراش کے کپڑے اور میک اَپ کے بغیر کوئی کمرشل لڑکی پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ بولڈ تو بہر حال وہ تھی اگر بولڈ نہ ہوتی تو رات کے ساڑھے گیارہ پونے بارہ کے قریب اندھیرے راستے پر اتنے اعتماد سے کیسے چل پڑتی۔ وہ تو کسی لٹے ہوئے گھر کے مکین کی طرح تھی جو گھر میں صفایا ہونے کے بعد آئندہ کچھ چوری ہو جانے کے خوف سے ہی آزاد ہو گیا ہو اور غالب کی طرح راہزن کو دُعا دے رہا ہو جس نے تمام فکروں سے ہی نجات دلا دی۔ ورنہ حسن و جوانی رات کی تاریکی میں اتنا بے خوف نہیں ہو سکتے۔ وہ بھی اتنی کم عمری میں۔

سعدی نے بنا کچھ سوچے سمجھے جیب سے کار کی چابی نکالی۔ ایک نظر میں اپنی کار تلاش کی، دوسری نظر ریسٹورنٹ پر ڈالی اور عجلت بھرے انداز میں کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ خیال یہی تھا کہ دس منٹ کے اندر اندر واپس آ چکا ہوگا۔ ابھی تو کھانا بھی نہیں لگا تھا اس کے حساب سے کھانے میں ابھی مزید پندرہ منٹ اور لگنا تھے۔

اس نے گاڑی نکالنے کے لئے آگے پیچھے کا جائزہ لیا۔ ریسٹورنٹ کے پارکنگ ایریا کا گارڈ اس کی مدد کے لئے آ گیا اور کار باہر نکالنے کے لئے ہاتھوں سے اشارے کرنے لگا۔ اس کی مدد کی وجہ سے کاروں کے رش سے اپنی کار باہر لانے میں وقت بہت کم خرچ ہوا۔

کار کھلے راستے پر لاتے ہی اس نے جیسے ریس دی تھی۔ یہ بات خود اس کی اپنی سمجھ سے بالاتر تھی کہ اسے یہ کیسی کھوج لاحق ہو گئی ہے۔ اس کا انٹرسٹ کیوں

Develope ہو رہا ہے۔ وہ کوئی اغواء شدہ مظلوم لڑکی تو نہیں تھی اس کی Boldness تو بہت سے بھید آشکار کرنے کے لئے کافی تھی۔

لڑکی پیدل تھی۔ پانچ منٹ میں کتنی دُور جا سکتی تھی۔ 60 کی اسپیڈ سے کار دوڑائی اور لمحوں میں اسے جا لیا۔

کار کی ہیڈ لائٹس کی وجہ سے وہ از خود محتاط ہو کر روڈ سے مزید دُور ہٹ گئی تھی۔ سعدی نے بیک مرر میں پیچھے کی صورتِ حال اور دائیں بائیں کا جائزہ لیا، آگے تو دیکھ ہی رہا تھا۔

پھر اس نے بڑے محتاط انداز میں کار اس طرح سے آڑی ترچھی کر کے روکی کہ لڑکی اپنی رو میں سیدھی نہیں چل سکتی تھی۔ اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر بڑی ادا سے کار کی طرف دیکھا۔ سعدی نے ہارن دیا جیسے اسے متوجہ کر رہا ہو۔ لڑکی نے ذرا جھک کر کار کے اندر جھانکا اور پھر بڑی ادا سے آنچل اپنی اُنگلی پر لپیٹنے لگی۔ جیسے منتظر ہو کہ سعدی کوئی بات کرے۔

سعدی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر کار سے باہر آیا مگر باہر آ کر بھی وہیں کھڑا رہا اور لڑکی کی طرف بہت توجہ سے دیکھا جو اس کی چھوٹی بہن وینا کی عمر سے بھی کم ہی دکھائی دے رہی تھی جس نے اس سال میٹرک کا ایگزام دیا تھا۔

''میں دس ہزار والی نہیں ہوں۔ میرے ریٹ ڈبل ہیں۔ فضول بات مت کرنا۔ صرف کام کی بات۔'' لڑکی یوں گویا ہوئی جیسے ٹیپ ریکارڈر کا Play پریس کر دیا ہو اس نے۔

پہلی مرتبہ دو بدو اتنی بے باک زبان۔ شریف نوجوان ہونے کے ناطے پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔

''میں...... میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں بلکہ میں تو......'' سعدی نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی۔

''Go Away...... مفت خورے ہو......؟ ...... Beoff ...... بلڈی ......
(Bloody)۔''لڑکی غرا کر جیسے چڑھ دوڑی اور مارچ پاسٹ کے انداز میں آگے چل
پڑی جیسے ایک اور ناکامی نے اس کے خون میں بارود بھر دیا ہو اور وہ تیز رفتاری سے اس
پر قابو پا رہی ہو۔

''کہاں جا رہی ہو......؟ اتنی تاریکی میں تمہیں ڈر نہیں لگتا......؟ ہرگز رنے
والا میری طرح کا نہیں ہوگا۔ تمہارے کسٹوڈین کون ہیں......؟ اس وقت تو تم خود مفت کا
مال بن رہی ہو۔ اگر تمہیں قریب ہی جانا ہے تو میں تمہیں پیدل ہی تمہارے ٹھکانے تک
چھوڑ دیتا ہوں۔ میں تو وہاں ریسٹورنٹ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ تمہیں بہلا پھسلا کر
کہیں سے لائے ہیں۔ بس مجھے یونہی ہمدردی سی فیل ہوئی تو میں......''

''جاؤ جا کر کھانا کھاؤ...... ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تم جیسے شریف لڑکوں سے مجھے
کوئی دِلچسپی نہیں ہے۔ مجھے چھ دن کے اندر وَن لیک (ایک لاکھ) جمع کرنا ہے۔ دو لاکھ
جمع کر چکی ہوں۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے میرا۔ Be off from here۔'' لڑکی
اتنی کم عمر تھی کہ ابھی دُنیا سے کچھ نہیں سیکھا تھا سوائے ضروریات پورا کرنے کے علاوہ اس
کی کوئی سوچ نہیں تھی۔ ناتجربہ کاری، اچھی کمپنی (صحبت) کی قلت اس کے اندازِ بیان
سے آشکار تھی۔

''صرف تین لاکھ کی خاطر خود کو بے قیمت کر رہی ہو......؟ بہت چھوٹی ہو ابھی
تم۔'' سعدی نے بڑے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''صرف تین لاکھ......؟ تین لاکھ 'صرف' ہوتے ہیں تو تم دے دو...... یہیں
کھڑے کھڑے۔'' لڑکی نے بات کے اختتام پر بھرپور استہزائیہ قہقہہ لگایا۔ سعدی تو
جیسے لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔

''مجھے اپنی ماں کا بائی پاس کرانا ہے۔ مجھے اپنی ماں زندہ چاہیئے۔'' لڑکی کے
انداز میں قطعیت تھی۔ اس نے اتنا کہا اور قدم بڑھا دیئے۔

''جس لڑکی کو ماں سے اتنی محبت ہو وہ بے ضمیر کیسے ہو سکتی ہے......؟ کیا یہ وہ
ماں ہے جو تمہاری جیسی کئی لڑکیوں کو گھیر کر نوٹ چھاپتی ہے......؟''
سعدی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بڑے شکستہ سے انداز میں کہا تھا۔ لڑکی
کے بڑھتے قدم رُک گئے۔ اسنے خونخوار نظروں سے سعدی کی طرف دیکھا۔

''جی تو چاہ رہا ہے دوں ایک جما کر۔'' اس نے ہاتھ اُٹھا کر تھپڑ رسید کرنے کا
منظر تخلیق کیا۔

''یہ وہ ماں ہے جو مردوں کی اَنا کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ مردوں کے ناجائز
اختیارات کے استعمال سے روز مرتی ہے۔ ذرا سی نافرمانی ہوئی تین طلاقیں...... ناشتہ
وقت پر نہیں بنا تین طلاقیں...... اَنا پرست بے ضمیر ماں نے بھڑکا دیا تین طلاقیں...... بیٹا
پیدا نہیں ہوا تین طلاقیں...... میکے میں دو دن زیادہ کیوں رُکیں تین طلاقیں...... فون پر
چپکے چپکے کسی سے باتیں کر رہی تھیں تین طلاقیں...... بچہ نہیں ہو رہا تین طلاقیں......
میری بہن کو گالی کیوں دی تین طلاقیں۔

تین طلاقیں دیتے ہوئے اسے طلاق یافتہ عورت کی گود میں سوئی ہوئی دُودھ
پیتی بیٹی نظر نہیں آتی...... یہ نہیں سوچتا کہ یہ بچی ساری زندگی ماں کی گود میں نظر نہیں آئے
گی...... کل کو اس کو بھی تین طلاقیں بولنے والے کے سامنے کھڑا ہونا ہے...... عورت کو کم
عقل کہتے ہیں تو پھر اسے کم عقلی کا مارجن کیوں نہیں دیتے......؟ ایک مرد غصے کی آگ
میں کتنی زندگیوں کو بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

سائنس دان غور کریں...... دانشور غور کریں...... انجینئر غور کریں......
U.N.O غور کریں...... شوہر اور باپ غور وفکر کیوں نہیں کرتے......؟

عورت کو حوا کی بیٹی کہتے ہیں...... کیا وہ صرف حوا کی بیٹی ہوتی ہے۔ حوا بیٹی
درخت سے توڑتی ہے......؟ ساری دُنیا اولادِ آدم ہے تو ہر بیٹی بھی آدم کی بیٹی ہے۔
اُس اُلو کے پٹھے کو بتا دیا تھا کہ پچاس فیصد ایڈوانس لیتی ہوں۔ ہوٹل پہنچتے

ہی بیان بدل دیا کہ فل پے منٹ صبح کو ملے گی۔ بے غیرت...... کمینہ...... پہلے اُس نے ٹائم برباد کیا اب یہ مفت خورا پیچھے لگ گیا۔"

لڑکی بڑبڑاتے ہوئے قدم بڑھا رہی تھی۔

سعدی برف کا بُت بنا کھڑا تھا۔

اس کی ٹی شرٹ کی جیب میں موبائل وائبریٹ (Vibrate) ہو رہا تھا۔ یقیناً عمران پریشان ہو کر اسے کال کر رہا تھا۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ اس لڑکی پر اتنا تو واضح کر دیتا کہ وہ تو اس کی کم عمری کی وجہ سے فکر مند ہو کر اس کے پیچھے چلا آیا تھا کہ شاید اسے اس تاریکی میں کسی اخلاقی مدد کی ضرورت ہو۔ اس کے ذہن میں پھیلے اندھیروں کے بیچ ایک ننھا منا سا دیا تو جلا دیتا کہ آدم کے سارے بیٹے قابیل نہیں ہوتے۔

☆☆☆